بھارت کے فرعون
کمانڈو اٹیک
اے حمید
50

سکھ فوجی کی رائفل کا رخ میری طرف تھا۔

میں فوجی کیمپ کی خاردار باڑھ کے آگے زمین پر پیٹ کے بل لیٹا تھا اور میں نے ہاتھ کھڑے کر دیئے تھے۔ جس پلاس سے میں خاردار باڑھ کے تار کاٹ رہا تھا وہ پلاس میرے پاس ہی زمین پر پڑا تھا۔ میری پتلون کی جیب میں چھ انتہائی طاقتور دھماکہ خیز گرنیڈ تھے۔ باڑھ کے دو تار میں کاٹ چکا تھا۔ میرے پاس کوئی عذر بہانہ نہیں تھا۔ میں رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا۔ یہ سب کچھ اس قدر اچانک ہو گیا تھا کہ مجھے زمین سے اٹھنے کی بھی مہلت نہیں ملی تھی۔ یہ سکھ فوجی خدا جانے کہاں سے اچانک میرے سر پر آن موجود ہوا تھا۔ اس نے ایک اور ٹھڈا میری پسلیوں میں مارا اور پنجابی میں گالی دے کر کہا۔

"کھڑا ہو جا"

میں رائفل کے سیفٹی کیچ آگے کرنے کی آواز سن چکا تھا۔ اب صرف ٹریگر پر انگلی کے ہلکے سے دباؤ کی ضرورت تھی کہ رائفل میں سے گولی نے فائر ہو کر میرے سر کے پرخچے اڑا دینے تھے۔ میرے پاس اپنے بچاؤ کے لئے صرف ایک ہی ہتھیار تھا اور وہ زہریلی سوئی والی بال پوائنٹ پنسل تھی۔ لیکن یہ ہتھیار میرے ہاتھ میں نہیں تھا۔ میری پتلون کی دائیں طرف والی جیب میں تھا۔ سکھ فوجی کے حکم پر میں اٹھنے لگا تو منہ کے بل لیٹے ہوئے اٹھتے وقت لامحالہ مجھے اپنے ہاتھ زمین پر لگانے تھے۔

مجھے جو کمانڈو ایکشن کرنا تھا وہ میں نے سوچ لیا تھا۔ یہ ایکشن میری زندگی کا آخری ایکشن بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ کسی بھی ملک کے تربیت یافتہ فوجی کو ایسی حالت میں زیر کرنا

که اس کے ہاتھ میں رائفل بھی ہو اتنا آسان کام نہیں ہوتا۔ لیکن مجھے یہ کام ہر حالت میں کرنا تھا اور اپنی جان کی بازی لگا کر کرنا تھا۔ میرے سامنے دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس سکھ فوجی پر مجھے ایک بات کی برتری ضرور حاصل تھی کہ وہ اگر ٹرینڈ فوجی تھا تو میں ایک تربیت یافتہ کمانڈو تھا اور مجھے میرے انسٹرکٹر نے ہوشنگ آباد کے جنگلوں میں کمانڈو ٹریننگ کے دوران ایسے ایسے گر سکھائے تھے کہ اگر ان میں سے کوئی ایک گر پوری مہارت اور ٹھیک وقت پر میں استعمال کرتا تو سکھ فوجی بچ نہیں سکتا تھا۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ میں جیب میں ہاتھ ڈال کر زہریلی سوئی والا بال پوائنٹ نکال کر اس پر فائر کر سکتا۔ لہٰذا مجھے ایک دوسرا گر استعمال کرنا تھا۔ اس کا موقع مجھے زمین پر ہاتھ رکھ کر اٹھنے سے مل سکتا تھا۔ شرط صرف اتنی تھی کہ اس ایکشن کے دوران ایک سیکنڈ کا ہزارواں حصہ بھی ضائع نہ ہو۔

میں نے ایک سیکنڈ کا ہزارواں حصہ بھی ضائع نہ کیا۔ زمین پر ہتھیلیاں ٹکا کر میں نے گھٹنے ٹیکے۔ دونوں ہاتھ دوبارہ کھڑے کر لئے اور جیسے ہی اٹھا اس کے ساتھ ہی سیدھی ٹانگ کا ٹھڈا پوری قوت کے ساتھ سکھ فوجی کی ٹانگوں کے درمیان اس کے جسم کے نازک حصے پر مارا۔ یہ ضرب ایک کمانڈو کی ضرب تھی۔ سب سے پہلے تو فوجی کے ہاتھ سے رائفل نیچے گر پڑی اور پھر وہ دہرا ہو گیا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ میں اسے اوپر اٹھنے کا موقع دیتا۔ میں نے بجلی کی تیزی کے ساتھ اس کی گردن پر بھرپور طاقت سے بازو کی ضرب لگائی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس سکھ فوجی کے حلق سے کوئی آواز نکلے۔ ایک آواز اس کے حلق سے ضرور نکلی مگر یہ خرخراہٹ کی آواز تھی وہ زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ میں نے اس کی گردن اپنے بازو کے شکنجے میں لے کر ایک اور جھٹکا دیا۔ مگر وہ میری پہلی ضرب ہی سے مر چکا تھا۔ میں نے اسے وہیں زمین پر ڈال دیا اور خود اوندھا لیٹ کر دائیں بائیں خاردار تاروں کے گچھوں کی طرف دیکھا۔ مجھے وہاں کوئی دوسرا فوجی نظر نہ آیا۔ وہاں زیادہ اندھیرا بھی نہیں تھا۔ امرتسر کے نواح میں پڑی انڈین انفنٹری ڈویژن کی اس ٹینک رجمنٹ کے سارے کیمپ کے گرد خاردار تار کے گچھے پھیلائے ہوئے تھے۔ مجھے ان کو کاٹ کر ان

ٹینکوں کے قریب جانا تھا جو ستمبر کی جنگ میں پاکستان پر حملہ کرنے کے لئے وہاں کیموفلاج کر کے رکھے گئے تھے۔ میں جلدی جلدی پلاس کی مدد سے تار کاٹنے لگا۔ میں نے باڑھ میں اتنا راستہ بنا لیا کہ جہاں سے میں رینگ کر کیمپ کے اندر جا سکتا تھا۔ میں نے پلاس وہیں چھوڑا اور تاروں کے درمیان جو راستہ بن چکا تھا اس میں سے رینگتا ہوا گزر گیا۔ اب میں فوجی کیمپ کے احاطے میں داخل ہو گیا تھا۔ میں پیٹ کے بل آہستہ آہستہ رینگ کر ٹینکوں کی طرف چلا۔ جب میرا اور ٹینکوں کا فاصلہ بیس قدم رہ گیا تو میں نے پتلون کی جیب سے خود بنائے ہوئے چھ طاقتور گرنیڈ نکال لئے۔ مجھے ٹینکوں کے پیچھے دوسری طرف سے کسی فوجی کی آواز سنائی دی وہ پنجابی میں کسی دوسرے فوجی کو آواز دے رہا تھا۔

میں نے پہلے گرنیڈ کا کیل نکالا اور اسے ٹینکوں کے اوپر اچھال دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے دوسرے پھر تیسرے اور پھر چوتھے گرنیڈ کے کیل نکال کر انہیں ٹینکوں پر پھینک دیا۔ پہلے گرنیڈ کا زوردار دھماکہ ہوا۔ پھر دوسرا گرنیڈ پھٹا۔ پھر تیسرا پھٹا۔ وہاں چاروں طرف آگ کے شعلے بلند ہونے لگے۔ لوہے کے ٹکڑے میرے دائیں بائیں آ کر گرے۔ میں نے دوسرے دو گرنیڈ بھی پھٹتے ہوئے ٹینکوں پر اچھال دیئے۔ اس کے ساتھ ہی لیٹے لیٹے پیچھے کو مڑا اور تیزی سے خاردار باڑھ کے سوراخ کی طرف رینگنے لگا۔ وہاں دھماکے ہو رہے تھے۔ ٹینک پھٹ رہے تھے اور ان کے پٹرول کی ٹینکیاں بھی پھٹ رہی تھیں۔ کیمپ میں ایک شور مچ گیا تھا۔ بلند ہوتے شعلوں نے سارا احاطہ روشن کر دیا تھا۔ میں اٹھ کر دوڑتے ہوئے دیکھا جا سکتا تھا اور پیچھے سے مجھ پر فائر آ سکتا تھا۔ میں جتنی تیز رینگ سکتا تھا رینگ کر خاردار تاروں کے پاس پہنچا اور سوراخ میں سے دوسری طرف آتے ہی کھیتوں میں گھس گیا اور جالندھر ریلوے لائن کی طرف دوڑنے لگا۔ کیمپ کی طرف مشین گن کی فائرنگ شروع ہو گئی تھی۔ دو تین برسٹ میرے سر کے اوپر سے بھی گزرے۔ معلوم ہوتا تھا کیمپ کے چاروں طرف اندھادھند برسٹ مارے جا رہے ہیں۔

میں اب اندھیرے میں تھا اور جتنی تیز دوڑ سکتا تھا دوڑ رہا تھا۔ کیمپ میں روشنی کا گولا فائر ہوا اور دوسرے لمحے سارا علاقہ دن کی طرح روشن ہو گیا۔ میں فصل کے اندر

چھپ کر بیٹھ گیا۔ یہ پیرا شوٹ والا وری لائیٹ گولا تھا جو روشن ہو کر آہستہ آہستہ نیچے آرہا تھا۔ جب وہ نیچے آکر بجھ گیا تو میں اٹھ کر پھر دوڑنے لگا۔ دوڑتے دوڑتے جب میں کافی آگے نکل گیا تو دو کھیتوں کے درمیان بنی ہوئی مینڈھ پر بیٹھ گیا۔ ذرا سانس درست ہوا تو میں اٹھ کر تیز تیز ریلوے لائن کی طرف چلتا گیا۔ ریلوے لائن پار کر کے میں دوسری طرف والے کھیتوں میں گھس گیا۔ میں نے پیچھے دیکھا۔ کیمپ میں ابھی تک تھوڑے تھوڑے شعلے اٹھ رہے تھے۔ دھماکے نہیں ہو رہے تھے۔ کم از کم میں نے دشمن کے چھ سات ٹینک ضرور تباہ کر دیئے تھے۔ جس سمت میں جا رہا تھا اس کے بارے میں مجھے بچپن ہی سے معلوم تھا کہ ادھر گورداسپور اور بٹالے کا علاقہ ہے۔ اسکول کے زمانے میں ہم ان میدانوں میں آکر دوڑیں لگایا کرتے تھے اور گڈیاں پتنگیں اڑایا کرتے تھے۔ اب میں یہ چاہتا تھا کہ جنوب مشرق کی جانب جتنی دور جا سکتا ہوں چلا جاؤں۔ پھر بٹالہ گورداسپور کی ریلوے لائن عبور کر کے مجیٹھہ قصبے کے اوپر سے ہوتا ہوا امرتسر کے کمپنی باغ کے شمال میں نکل آؤں۔ وہاں سے میں اپنے مجاہد ساتھی جہانگیر کے گھر پہنچ سکتا تھا۔ یہ سارا فاصلہ مجھے دن کی روشنی نکلنے سے پہلے پہلے طے کرنا تھا۔ صبح ہونے کے بعد میرے پکڑے جانے کا اندیشہ تھا۔ بھارت کی پوری ریزرو انفنٹری ڈویژن اپنی ایک ٹینک رجمنٹ کے ساتھ امرتسر کے نواح میں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھی۔ اور کمانڈو اتنی زبردست سیکورٹی کے باوجود کیمپ میں گھس کر ٹینکوں کو ہٹ کر گئے تھے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ شہر میں پولیس اور سی آئی ڈی چاروں طرف گشت کر رہی ہوگی۔ میں شہر میں اجنبی تھا۔ وہاں میرا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ پولیس مجھے شبہ میں پکڑ سکتی تھی۔ اس لئے ضروری تھا کہ سورج نکلنے سے پہلے پہلے میں اپنی منزل پر پہنچ جاؤں۔

میں کھیتوں کھیت چلتا گیا۔ اندازے سے اپنا رخ قصبہ مجیٹھہ کی طرف کر لیا تھا۔ رات کا اندھیرا مجھے چھپائے ہوئے تھا۔ آخر مجھے امرتسر سے گورداسپور جانے والی ریلوے لائن کا سگنل دکھائی دیا۔ میں ریلوے لائن پار کر کے ایک میدان میں داخل ہو گیا۔ یہاں ایک گاؤں کے قریب سے گزرا جہاں مکانوں پر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ کوئی کتا دور سے بھونکا اور

پھر چپ ہو گیا۔ جس وقت میں اپنے کشمیری مجاہد جہانگیر کے مکان پر پہنچا تو پو پھٹ چکی تھی اور بڑی سڑک پر گرمیوں کی رات کو لاری اڈے کے باہر سوئے ہوئے اٹھ رہے تھے۔ ایک بوڑھا سکھ گورو نانک جی کی بانی پڑھتا گردوارے کو جا رہا تھا۔ شہر کے مندروں سے پوجا پاٹھ کی گردواروں سے شبد کیرتن کی آوازیں آرہی تھیں۔ صبح کی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ جہانگیر کے مکان کا دروازہ بند تھا مگر وہ میرے انتظار میں جاگ رہا تھا۔ اس نے دروازے کو اندر سے چٹخنی نہیں لگائی ہوئی تھی۔ میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

وہ چارپائی پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"خدا کا شکر ہے تم آگئے۔ میں نے دھماکوں کی آوازیں سنی تھیں۔"

میں چارپائی پر بیٹھ گیا اور اسے ساری روداد سنائی۔ وہ کہنے لگا۔

"ابھی تمہیں یہاں سے باہر نہیں نکلنا ہوگا"

ہم باتیں کرنے لگے۔ تھوڑی دیر میں صبح ہو گئی۔ میں مکان کے صحن کے غسل خانے میں نلکے کے نیچے بیٹھ کر نہایا۔ کپڑے بدلے۔ کھیتوں میں رات کے وقت رینگنے سے قمیض پر گیلی مٹی کے داغ پڑ گئے تھے۔ جہانگیر ناشتے کے لئے ہوٹل سے چائے وغیرہ لے آیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ سری نگر کمانڈو شیروان کے ساتھ ٹرانسمیٹر پر کس جگہ سے بات کرتا ہے۔

میں اس سے بات کر کے معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آزاد کشمیر کی سرحد پر بھارتی فوج کی پوزیشن کیا ہے

"ٹرانسمیٹر یہاں سے دور ایک خفیہ جگہ پر ہے۔ اس وقت تمہارا وہاں جانا مناسب نہیں۔ آزاد کشمیر کی سرحد پر بھارت نے اپنی فوج بڑی تعداد میں جمع کر رکھی ہے۔ اس سے زیادہ ابھی کسی کو کچھ معلوم نہیں ہے۔"

میں سارا دن جہانگیر کے مکان میں چھپا رہا۔ اس کا مکان واہگہ اٹاری بارڈر کو جانے والی بڑی سڑک سے تھوڑا ہٹ کر تھا۔ جہانگیر مکان کو باہر سے تالا لگا کر دکان پر چلا گیا تھا۔ سڑک پر سے بھاری ٹرکوں کے گزرنے کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔ یہ آوازیں دوپہر

تک مسلسل آتی رہیں۔ جہانگیر اپنے اور میرے لئے کچھ کھانے کو لے کر آیا تو اس نے بتایا کہ جی ٹی روڈ پر واہگہ کی طرف ملٹری کے کانوائے جا رہے ہیں۔

"ان میں انفنٹری کے ٹرک بھی ہیں اور فوجی سامان سے لدے ہوئے ٹرک بھی ہیں۔ لگتا ہے آج رات کچھ ہونے والا ہے۔"

وہ 25 اگست 1965ء کی رات تھی۔

اس رات بھارتی توپ خانے نے آزاد کشمیر کے علاقے درہ حاجی پیر پر شدید گولہ باری شروع کر دی۔ 26 اگست کو انڈین آرمی کے پورے بریگیڈ نے آزاد کشمیر کی چوکیوں پر حملہ کر دیا۔ بھارت نے بے پناہ فوجی طاقت کے ساتھ ان چوکیوں پر حملہ کیا تھا۔ ان چوکیوں پر آزاد کشمیر کی صرف ایک ایک کمپنی مورچہ بند تھی۔ مجاہدوں نے آخری گولی تک دشمن کا مقابلہ کیا۔ معرکہ خوں ریز تھا۔ درہ حاجی پیر اور بیڈوری کی چوکیوں پر انڈین آرمی نے پورے بریگیڈ اور ڈویژن کے توپخانے کی آٹھ دنوں کی گولہ باری کے بعد قبضہ کر لیا۔

اس دوران میں امرتسر سے نکل کر سری نگر پہنچ گیا تھا اور کمانڈو شیروان کے ساتھ مل کر آزاد کشمیر پر حملہ آور فوج کی سپلائی لائن کو پہاڑیوں اور گھاٹیوں میں شب خون مار کر جتنا نقصان پہنچا سکتا تھا پہنچا رہا تھا۔ مگر بھارت نے بے پناہ فوجی نفری اور سازو سامان کے ساتھ حملے کا آغاز کیا تھا۔ ہماری اطلاعات بالکل درست نکلیں۔ بھارت نے پاکستان پر جارحانہ حملے کا آغاز آزاد کشمیر سے کیا تھا۔ حریت پرست کشمیری مجاہدین نے مقبوضہ کشمیر کو انڈین آرمی کے لئے جہنم بنا دیا تھا۔ میں بھی حریت پرست مجاہدوں سے مل گیا تھا۔ ہم انڈین آرمی کے گولہ بارود اور پٹرول کے ذخیرے دن دہاڑے اڑانے لگے۔ ہم انڈین آرمی کے فوجی کانواؤں پر حملے کرتے۔ پلوں کو بارود لگا کر اڑا دیتے۔ اب ہم چھپ کر کمانڈو ایکشن نہیں کرتے تھے۔ بھارت نے آزاد کشمیر پر کھلا حملہ کر دیا تھا اور وہ پاکستان پر بھی حملہ کرنے والا تھا۔ کشمیری مجاہد بھی میدان جنگ میں کھل کر سامنے آ گئے تھے۔ انڈین آرمی کے دستوں سے ہماری کئی کھلی جھڑپیں ہوئیں۔ ہم سٹین گنیں ہر وقت اپنے

ساتھ رکھتے تھے۔ 29 اگست 1965ء کو جب بھارتی فوج راولا کوٹ کی طرف بڑھی تو اس وقت پاک فوج میدان میں آ گئی تھی۔ کیونکہ بھارتی توپ خانے کے گولے سیدھے پاکستان کی سرحد کے اندر آ رہے تھے۔

30 اگست کو بھارتی توپ خانے نے پونچھ کی پہاڑیوں پر گولہ باری کی۔ جس کے جواب میں آزاد کشمیر کے بریگیڈ کے توپ خانے نے جوابی گولہ باری کر کے چھمب کے لوہے اور سیمنٹ کے بنکروں کو بنیادوں تک سے ہلا ڈالا۔ پاک فوج بریگیڈ برق رفتاری سے پیش قدمی کر گئے۔ یکم ستمبر کو دن کے دس بجے تک انڈین آرمی کی چک پنڈت' مناور' جھنڈا' ملکوئیاں' پھورا اور برسالا چوکیاں پاک فوج کے غازیوں کے پاؤں تلے روندی جا چکی تھیں۔ بھارت فرانس سے خریدے ہوئے اسلحے اور ٹینکوں سے ہمارے دستوں کو روکنے کی سرتوڑ کوشش کرتا رہا مگر شام تک پاک فوج نے دیوا پر بھی قبضہ کر لیا۔ آسمان پر بھارت کے چار لڑاکا طیارے نمودار ہوئے۔ وہ ایڈوانس کرتے پاکستانی دستوں پر آگ برسانے لگے۔ عین اس وقت پاک فضائیہ کے دو شہباز پاکستان کی تاریخ کا پہلا فضائی معرکہ لڑنے کے لئے چھمب کے آسمان پر پہنچ گئے۔ پاکستان کے دو طیارے تھے جن کا مقابلہ دشمن کے چار ویمپائروں اور دو کینبرا طیاروں سے تھا جو برتر طیارے تھے۔ مگر پاکستان کے شاہباز قہر بن کر دشمن کے طیاروں پر ٹوٹ پڑے اور دیکھتے دیکھتے چاروں ویمپائروں کے فضا میں پرخچے اڑ گئے۔ کینبرا طیارے بھاگ گئے۔

2 ستمبر کو پاک فوج کے دستے دریائے توی پر پہنچ چکے تھے۔ شام تک دریائے توی پار کر لیا گیا۔ 5 ستمبر کو پاک فوج نے فائر بندی لائن سے اٹھارہ میل اندر بھارت کے اہم جنگی مقام جوڑیاں پر بھی قبضہ کر لیا۔ اب پاک فوج کے توپ خانے کے گولے اکھنور میں گر رہے تھے۔ بھارتی ہائی کمانڈ میں واویلا مچ گیا۔ آزاد کشمیر کے محاذ پر بھارتیوں کو شکست فاش کا سامنا ہی نہ کرنا پڑا تھا بلکہ ان کے ہاتھ سے مقبوضہ کشمیر نکلا جا رہا تھا۔ چنانچہ 6 ستمبر کی صبح ابھی نہیں ہوئی تھی کہ بھارت نے اعلان جنگ کئے بغیر پاکستان پر حملہ کر دیا' رقبے کے اعتبار سے بھارت کے مقابلے میں تین گنا چھوٹے ملک پاکستان پر یہ بہت بڑا حملہ تھا یہ

حملہ تین طرف سے تین ڈویژنوں سے کیا گیا۔ ان تین ڈویژنوں کی مدد کے لئے بھارت کا نمبر 23 ماؤنٹین ڈویژن ساتھ تھا اور ایک انفنٹری ڈویژن پوری ٹینک رجمنٹ کے ساتھ امرتسر کے قریب پا برکاب موجود تھا۔ یہ وہی ڈویژن تھا جس کے ٹینکوں کو میں نے کمانڈو اٹیک سے اڑایا تھا۔

پاکستانی فوج کے شیر دل جوان غافل نہیں بیٹھے تھے۔ اگرچہ ان کی نفری تین کے مقابلے میں ایک کی تھی اور بھارت کے مقابلے میں فوجی سازو سامان بھی بہت ہی کم تھا لیکن پاک فوج کے جوانوں کے سینوں میں ایمان کی حرارت بجلی کی کڑک بن کر دشمن پر ٹوٹ پڑی اور پہلی ہی جھڑپ میں میدان بھارتی فوجیوں کی لاشوں سے پٹ گیا۔ بھارتی افسروں اور سپاہیوں کی لاشیں ایک دوسرے کے اوپر پڑی تھیں۔ دشمن کے ٹینک جل رہے تھے۔ پاکستان کے توپ خانے نے واہگہ سے اٹاری اور امرتسر تک قیامت برپا کر دی تھی۔ اور بھارتی ہائی کمانڈ کے لاہور پر دن کے نو بجے تک قبضہ کرنے کے ناپاک عزائم خاک میں مل چکے تھے۔ لاہور جنگی ترانوں سے گونج رہا تھا۔

ساری دنیا کے جنگی وقائع نگار چشم حیرت سے دیکھ رہے تھے کہ پاکستان کی چھوٹی سی فوج نے بھارت کی اتنی بڑی فوج کو کس طرح شکست فاش دی ہے کہ پہلے روز انڈین آرمی نے جہاں حملہ کیا تھا جنگ کے آخری روز وہ اس سے بھی پیچھے بھاگ چکے تھے اور پاک فوج نے دشمن کے اہم ترین قصبے کھیم کرن پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ ہمیں مقبوضہ کشمیر میں جنگ کی ایک ایک رپورٹ پہنچ رہی تھی۔ پوری وادی کشمیر پاکستان زندہ باد کے نعروں سے گونج رہی تھی۔ بھارت کے سرحدی شہروں سے ہندو سکھ مکان خالی کر کے دلی اور بمبئی کی طرف بھاگنے لگے تھے۔ بھارتی وزیر اعظم لال بہادر شاستری نے اقوام متحدہ کو ہاتھ جوڑ کر کہا کہ کسی طرح جنگ بندی کرائی جائے۔ چنانچہ ۲۳ ستمبر کی صبح تین بجے فائر بندی ہو گئی۔

بھارتی ہائی کمانڈ نے پاکستان سے اپنی شکست کا بدلہ لینے کے واسطے کھسیانی بلی کھمبا نوچے پر عمل کرتے ہوئے کشمیری مسلمانوں پر اپنے وحشیانہ مظالم تیز تر کر دیئے۔ کشمیری

مسلمانوں کے گاؤں کے گاؤں جلا ڈالے۔ نہتے دیہاتیوں کو بے دریغ شہید کرنا شروع کر دیا۔ حریت پسند مجاہدوں نے بھی بھارتی فوجیوں پر دلیرانہ حملے شروع کر دیئے اور اگر ایک کشمیری مسلمان شہید کیا جاتا تو اس کے مقابلے میں ہم کم از کم چھ بھارتی فوجی ہلاک کر ڈالتے تھے۔ ہم گھات لگا کر بھی انڈین آرمی کے دستوں اور کانواؤں پر حملے کرتے اور اگر کوئی ایسا موقع آجاتا تو سامنے آکر بھی مقابلہ کرتے اور مورچے سنبھال کر اندھا دھند فائرنگ کرتے۔ ان معرکوں میں میرے ساتھ کمانڈو شیروان اور کمانڈو اورنگ زیب بھی شریک ہوتے تھے۔ ہم درختوں یا ٹیلوں کے پیچھے سے فائرنگ کرتے نکلتے اور ڈوگرہ، سکھ یا گورکھا فوجی دستوں پر سٹین گنوں کے برسٹ فائر کرتے۔ انہیں موت کی نیند سلا دیتے۔ یا زخمی کر کے روپوش ہو جاتے۔

بقول محترم عنایت اللہ بھارت نے پاکستان پر اکیس ڈویژنوں سے حملہ کیا تھا۔ پاکستان کے پاس پانچ ڈویژن بھی پورے نہیں تھے۔ دشمن کے تقریباً پانچ سو جدید لڑاکا بمبار طیاروں کے مقابلے میں پاکستان کے پاس صرف 133 طیارے تھے۔ پاک بحریہ کے جنگی جہازوں کی تعداد بھی بھارت کی نیوی کے مقابلے میں بہت کم تھی۔ انڈین نیوی کے پاس طیارہ بردار بحری جہاز بھی تھا۔ لیکن اس کے باوجود بھارت کو عبرت ناک شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اور تین دنوں میں پورے پاکستان پر قبضہ کرنے کا خواب دیکھنے والے بھارت کے وزیر اعظم لال بہادر شاستری نے تیسرے ہی دن اپنی فوجوں پر پاکستان کی فوج کا قہر برستا دیکھا تو بلبلا اٹھا اور اس کی دہائی اقوام متحدہ میں پہنچی کہ ہم اس وقت فائر بندی کے لئے تیار ہیں۔ یہ معجزہ ملت پاکستان کے جذبے کا تھا۔ یہ مومنین کے ایمان کا کرشمہ تھا۔ یہ فوج اور قوم کے اتحاد اور یگانگت کا ثمر تھا۔

جموں کشمیر کے کونے کونے میں پاکستان کی فتح اور بھارت کی عبرت ناک شکست پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ حریت پرستوں کی تحریک آزادی میں ایک نیا جوش ایک نیا ولولہ بیدار ہو گیا۔ لیکن بھارت نے اپنی شکست کا بدلہ لینے کے لئے وادی کشمیر میں نئی فوج جھونک دی اور کشمیریوں پر ظلم و ستم کی کارروائیوں میں اضافہ کر دیا۔ کشمیری نہتے تھے۔ ان کے

پاس کچھ نہیں تھا۔ بھارتی فوج جدید اسلحہ اور فوجی ٹریننگ کے ساتھ کشمیریوں پر ظلم وستم توڑ رہی تھی لیکن حریت پرست کشمیریوں کا جذبہ ایمانی چٹان سے بھی زیادہ مضبوط تھا۔ وہ ہر محاذ پر، ہر گلی، ہر گھاٹی، ہر وادی اور ہر گلی کوچے میں بھارتی غاصب فوجیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کر رہے تھے۔ اپنی زندگیوں کے نذرانے بھی دے رہے تھے اور دشمن کے بھی پرخچے اڑا رہے تھے۔ میں کمانڈو اورنگ زیب اور کمانڈو شیروان بھارتی فوجیوں کے کانواؤں پر گھات لگا کر حملے کرنے، ان کے مورچوں اور چوکیوں پر شب خون مارنے، ان کے گولہ بارود اور پیٹرول کے ذخیرے اڑانے میں مصروف تھے۔ ہمارے ساتھ ہمارے حریت پسند کشمیری مجاہد اور دوسرے کمانڈوز بھی تھے۔ دوسری طرف وادی کے علاقے میں بھارتی فوجی نہتے کشمیریوں کے گھروں کو آگ لگا رہے تھے۔ عورتوں کی بے حرمتی کر رہے تھے اور بچوں بوڑھوں کو بے دریغ قتل کر رہے تھے۔ ہمیں خبر ملتی کہ فوجی کسی گاؤں کو نذر آتش کرر رہے ہیں تو ہم کسی نہ کسی طرح وہاں پہنچ کر ان پر فائرنگ کھول دیتے اور جتنے بھارتی فوجی مار سکتے تھے مار ڈالتے۔ مگر ہم ہر گاؤں میں نہیں پہنچ سکتے تھے۔ دوسرے گاؤں میں کشمیری حریت پرست ضرور مقابلہ کرتے لیکن بھارتی طیارے آکر ان پر بم باری شروع کر دیتے۔

وادی میں سکھ رجمنٹ کے ساتھ ایک رجمنٹ ڈوگروں کی بھی تھی۔ ہم ان کے رجمنٹل ہیڈ کوارٹر میں کمانڈو آپریشن کر کے انہیں کافی نقصان پہنچا آتے تھے۔ لیکن ہماری کوئی باقاعدہ تربیت یافتہ جدید اسلحہ سے لیس فوج نہیں تھی۔ ہم بھارتیوں کے چھینے ہوئے اسلحہ سے لڑ رہے تھے۔ ہمارا انحصار زیادہ تر گوریلا اور کمانڈو ایکشن پر تھا۔ جب کہ انڈین آرمی کے پاس بکتر بند گاڑیوں، بمبار طیاروں کے علاوہ ٹینک بھی تھے۔ انڈین آرمی کے رجمنٹل ہیڈ کوارٹر کا ایک کمپنی کمانڈر صوبیدار درگا داس تمام مسلمانوں اور خاص طور پر کشمیری مسلمانوں کا جانی دشمن تھا۔ وہ اپنی رجمنٹ میں مسلمانوں کا قصائی مشہور تھا۔ وہ فوج سے ریٹائر ہو چکا تھا مگر اس کی اسلام دشمنی اور کشمیری مسلمانوں سے نفرت کے باعث اسے فوج میں دوبارہ بھرتی کر کے کشمیر کے محاذ پر صرف اس لئے بھیج دیا گیا تھا کہ وہ جی بھر

کر کشمیری مسلمانوں کا قتل عام کرے۔ اس کے بارے میں یہ بھی مشہور تھا کہ وہ جب تک دن میں دس بارہ مسلمان کشمیریوں کے خون سے اپنے ہاتھ نہ رنگ لے وہ چوکی پر بیٹھ کر کھانا نہیں کھاتا تھا۔ وہ کٹڑ اور انتہائی متعصب ہندو تھا۔ بارہ مولا اور وادی کے دوسرے دیہات کو اسی بے رحم متعصب ہندو صوبیدار درگا داس کی قیادت میں اس کی کمپنی کشمیریوں کا قتل عام کر کے ان کے گھروں کو آگ لگا رہی تھی۔

حریت پرستوں اور ہمارے کمانڈوز نے اس مسلم کش قصائی کو ہلاک کرنے کی کئی بار کوشش کی تھی مگر وہ ہر بار بچ نکلتا تھا۔ دوسرے اس کے گرد سیکورٹی بے حد سخت ہوتی تھی۔ جنگ ستمبر کی شکست کے بعد صوبیدار درگا داس کے ظلم وستم میں اضافہ ہو گیا تھا۔ ایک روز ہماری خفیہ میٹنگ ہوئی جس میں فیصلہ کیا گیا کہ اس مسلم کش کافر کو جہنم واصل کیا جائے۔ ابھی ہم پلان تیار کر رہے تھے کہ ہمیں اطلاع ملی کہ صوبیدار درگاداس نے اپنی ڈوگرہ کمپنی کے ساتھ سری نگر سے پندرہ میل دور کشمیریوں کے ایک گاؤں پر حملہ کر کے گاؤں کو نذر آتش کر دیا ہے اور ایک مسجد کو بھی آگ لگا دی ہے۔ ہم وہاں پہنچے تو گاؤں کے سارے مکان جل کر راکھ ہو چکے تھے۔ جگہ جگہ مسلمان کشمیریوں کی لاشیں پڑی تھیں جن میں بچے عورتیں اور بوڑھے کشمیریوں کی لاشیں بھی تھیں۔ مسجد آدھی سے زیادہ جل کر شہید ہو چکی تھی۔ ہماری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ میں نے کمانڈو شیروان سے کہا۔

”سر! میں اس شہید مسجد کی حرمت کی قسم کھاتا ہوں کہ جب تک صوبیدار درگاداس کو ہلاک نہیں کر لوں گا۔ چین سے نہیں بیٹھوں گا۔“

کمانڈو شیروان نے مجھے اپنے ساتھ چلے آنے کا اشارہ کیا۔ کمانڈو اورنگ زیب بھی ہمارے ساتھ تھا۔ ہم اپنی خفیہ کمیں گاہ میں آگئے۔ ہم نے اسی وقت اپنے ایک خاص آدمی کو رجمنٹل ہیڈ کوارٹر یہ پتہ کرنے کے لئے بھیجا کہ وہ یہ معلوم کرے کہ صوبیدار درگاداس رات کو جس بارک میں سوتا ہے اس کا محل وقوع کیا ہے۔ ہمارا آدمی اسی وقت روانہ ہو گیا۔ اس نے دو گھنٹے بعد آکر ہمیں اطلاع دی کہ صوبیدار درگاداس حریت

پرست مجاہدوں سے ایک جھڑپ میں زخمی ہو گیا ہے۔ اس کے شانے میں گولی لگی ہے اور اسے اس کی خواہش کے مطابق اس کے شہر امرتسر بھیج دیا گیا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اسے صبح صبح انڈین میڈیکل کور کا ایک ہیلی کاپٹر امرتسر لے گیا۔

کمانڈو شیروان نے میری طرف دیکھا اور کہا۔

"اب تمہارا کیا فیصلہ ہے؟"

میں نے کہا۔

"کمانڈر! میں نے اللہ کے گھر کے سامنے کھڑے ہو کر قسم کھائی ہے کہ جب تک اس درندہ صفت متعصب صوبیدار درگا داس سے سینکڑوں بے گناہ مسلمانوں کے خون کا بدلہ نہیں لے لوں گا چین سے نہیں بیٹھوں گا۔ اس لئے مجھے اجازت دی جائے کہ میں امرتسر جا کر مسلمانوں کے اس ازلی دشمن سے اپنے مسلمان بھائیوں کے خون کا بدلہ چکا دوں"

کمانڈو شیروان نے کمانڈو اورنگ زیب کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔

"میں چاہتا ہوں تم بھی اس کے ساتھ جاؤ"

میں نے فوراً کہا۔

"کمانڈو شیروان! میں اس مہم پر اکیلا ہی جانا پسند کروں گا۔ اور پھر کمانڈو اورنگ زیب کی یہاں بھی ضرورت ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ یہ کشمیر کا محاذ چھوڑ کر میرے ساتھ امرتسر جائے۔ درگاداس کے لئے میں اکیلا ہی کافی ہوں۔ صرف مجھے اس کی تصویر اگر کہیں سے مل جائے تو دکھا دی جائے۔"

جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں کشمیر میں ہمارے آدمی جگہ جگہ آزادی کشمیر کے کاز کے لئے کام کر رہے تھے۔ حریت پرست اور کشمیری کمانڈو اگر انڈین آرمی کی توپوں اور بمبار طیاروں کے خلاف برسرپیکار تھے تو ہمارے جاسوس دشمن کے پیٹ میں گھس کر اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر ہمیں ان کی پل پل کی خبریں لا کر دے رہے تھے۔ کمانڈو شیروان نے ایک آدمی کی ڈیوٹی لگا دی کہ وہ جیسے بھی ممکن ہو صوبیدار درگا داس کی ایک تصویر مہیا کر کے دے۔ اس آدمی نے دو دن لگا دیئے۔ تیسرے دن شام کو وہ صوبیدار درگا داس کی

پاسپورٹ سائز کی ایک تصویر لے آیا۔ یہ بلیک اینڈ وائیٹ تصویر تھی اور کسی فوجی محکمے کے رجسٹر یا فائیل سے پھاڑ کر اتاری گئی تھی۔ میں نے تصویر کو غور سے دیکھا۔ یہ صوبیدار کی وردی والے پختہ عمر کے آدمی کی تصویر تھی جس کی راجپوتوں ایسی بڑی بڑی مونچھیں تھیں۔ ڈاڑھی صفاچٹ تھی۔ چہرہ بھرا بھرا تھا۔ آنکھوں سے سنگدلی اور بے رحمی ٹپک رہی تھی۔ میں نے تصویر اپنے پاس رکھ لی اور کمانڈو شیروان سے کہا۔

"میں آج رات کو ہی امرتسر روانہ ہو جانا چاہتا ہوں۔ مسلمانوں کا یہ جلاد اور سینکڑوں بے گناہ کشمیری مسلمان بچوں بوڑھوں اور عورتوں کا قاتل امرتسر میں جہاں کہیں بھی ہو گا میں اپنے ہاتھ سے اس کو ذبح کروں گا اور واپس آجاؤں گا۔"

ڈوگرہ رجمنٹل ہیڈ کوارٹر سے صوبیدار درگا داس کے گھر کا صرف اتنا ہی ایڈریس مل سکا تھا کہ امرتسر کے بازار مائی سیواں کی ایک گلی میں اس کا آبائی مکان ہے۔

کمانڈو اورنگ زیب نے کہا۔

"صوبیدار درگاداس زخمی ہے۔ اور ابھی تک وہ فوجی سروس میں ہی ہے۔ امرتسر میں وہ ضرور فوجی یا سول ہسپتال میں ہو گا۔"

میں نے کہا۔

"یہ اور بھی اچھی بات ہے۔ اسے تلاش کرنے میں مجھے آسانی ہو گی۔ امرتسر میرے لئے کوئی نیا شہر نہیں ہے۔ میں اس شہر کی ایک ایک گلی سے واقف ہوں"

اسلام کے اس ازلی دشمن اور کشمیری مسلمانوں کے قاتل نمبر ایک کو ہلاک کرنے اور اس سے بے گناہ کشمیری مسلمانوں کے خون کا بدلہ لینے کا میرا عزم دیکھ کر کمانڈو شیروان نے مجھے اس آپریشن پر جانے کی اجازت دے دی لیکن ساتھ ہی کہا۔

"تم ہمارے بڑے قیمتی کمانڈو ہو۔ تم صرف ایک آدمی کو ہلاک کرنے کا مشن لے کر جا رہے ہو جو تمہارے ایسے تجربہ کار اور بے مثال کمانڈو کے لئے ایک معمولی مشن ہے۔ لیکن اس میں تمہاری جان کا بھی خطرہ ہے۔ اس لئے تمہاری فکر رہے گی۔ اپنا مشن مکمل کرنے کے بعد جتنی جلدی واپس آسکو واپس ہمارے پاس پہنچ جانا۔ یہاں ہمیں تمہاری

زیادہ ضرورت ہے۔"

میں نے کہا۔

"ایسا ہی ہو گا کمانڈر"

اس نے کہا۔

"امرتسر میں جاتے ہی تم اپنے مجاہد جہانگیر سے رابطہ قائم کرنا اور اگر کوئی مسئلہ درپیش ہو تو مجھے وائرلیس پر خبر کر دینا۔"

ستمبر کا مہینہ گزر چکا تھا۔ اکتوبر کے مہینے کا خوشگوار موسم شروع ہو گیا تھا۔ دھوپ میں وہ تیزی باقی نہیں رہی تھی اور راتوں کو خنکی ہونے لگی تھی۔ میں نے اورنگ زیب کی ایک بھورے رنگ کی پرانی جیکٹ پہن لی تھی۔ پتلون میں نے اپنی پرانی ہی پہنی ہوئی تھی۔ ہم نیا لباس کبھی کبھار ہی پہنتے تھے۔ اکثر پرانی جیکٹیں اور پتلونیں پہنتے تھے تاکہ خواہ مخواہ کسی کی ہم پر نظر نہ پڑے۔ میں نے زہریلی سوئیوں والا بال پوائنٹ پستول اور کچھ انڈین کرنسی اپنے پاس رکھی لی تھی۔ زہریلی بال پوائنٹ میں نے جیکٹ کی اندرونی جیب میں رکھی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ مجھے رات کے وقت کس طرف سے نکلنا ہے اور کس جگہ بڑی سڑک پر پہنچ کر جموں جانے والی بس پکڑنی ہے۔ شروع رات میں میں کمانڈو شیروان اور کمانڈو اورنگ زیب سے رخصت ہو کر خفیہ کیمپ گاہ سے نکل گیا۔ رات کے اندھیرے میں گھاٹیوں اور کھڈوں میں سے گزرتا بڑی سڑک پر پہنچا۔ وہاں سے لاری پکڑی اور جموں کی طرف روانہ ہو گیا۔

جموں سے ریل گاڑی میں سفر کرنے کی بجائے لاری میں سوار ہو کر جالندھر آیا۔ جالندھر سے ٹرین پکڑی اور امرتسر پہنچ گیا۔ میری ڈاڑھی اور مونچھیں کافی بڑی ہوئی تھیں۔ مونچھیں میں نے ہونٹوں کے اوپر سے ترشوالی تھیں۔ ڈاڑھی اور سر کے بالوں کو میں نے گردن پر کھلا چھوڑ دیا تھا تاکہ اگر کسی وقت ضرورت پڑے تو فوراً سکھ بن سکوں۔ میں اس حلیے میں بھی نوجوان لگتا تھا۔ میں امرتسر دن ڈھل رہا تھا جب پہنچا۔ اپنے آدمی جہانگیر کی دکان پر جانے کے لئے مجھے شام کا اندھیرا پھیل جانے کا انتظار کرنا تھا۔ چنانچہ میں

امرتسر کے سیڑھیوں والے ریلوے پل کے قریب ایک ہندو کی چائے کی دکان میں چائے منگوا کر بیٹھ گیا۔ دکان میں کچھ ہندو اور دو تین سکھ بھی بیٹھے تھے۔ وہ جنگ ستمبر کی باتیں کر رہے تھے۔ ان کی باتوں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ انہیں اس بات کا شدید احساس ہے کہ اس جنگ میں پاکستان نے بھارت کو شکست دی ہے اور بھارتی حکومت نے اپنے عوام سے اصل حقائق چھپائے ہیں۔ ایک سکھ کہنے لگا۔

"مہاراج! اگر لاہور کی اومنی بس ہمارے فوجی امرتسر لے آئے تھے تو لاہور پر قبضہ کیوں نہیں کیا؟"

دوسرا سکھ بولا۔

"ہماری فوج بزدل نکلی ہے۔ ورنہ پاکستان کبھی کھیم کرن پر قبضہ نہیں کر سکتا تھا۔ میری چاچی چاچا کھیم کرن سے بھاگ کر امرتسر آگئے تھے۔ انہوں نے خود پاکستانی فوج کو کھیم کرن میں داخل ہوتے دیکھا تھا"

ایک ہندو بولا۔

"مہاراج! ہم اس وقت اسی دکان پر تھے جب ہمارے فوجیوں کی لاشوں سے بھرے ہوئے ٹرک ادھر سے گزرے تھے۔"

دوسرا ہندو کہنے لگا۔

"مہاراج اتنی زیادہ فوج کے ساتھ بھی ہم لاہور کے ایک محلے پر قبضہ نہیں کر سکے یہ تو بڑی حیران کر دینے والی بات ہے۔ ہم تو اپنا کاروبار امرتسر سے جالندھر لے جا رہے ہیں۔"

سکھ نے اسے غصیلی آواز میں کہا۔

"لالہ جی! تم بزدل ہو۔ سکھ فوجی بزدل نہیں ہے۔ ہماری سکھ فوج کو تمہارے ہندو جرنیلوں نے مروایا ہے۔"

وہاں گرمی سردی ہونے لگی تو دکان کے مالک نے بیچ میں پڑ کر معاملہ ختم کر دیا۔ جب باہر شام کا اندھیرا پھیل گیا اور دکان کی بتیاں روشن ہو گئیں تو میں دکان سے نکل آیا اور

جہانگیر کی دکان کی طرف چلنے لگا۔

وہ اپنی دکان پر ہی تھا۔ مجھے اس نے دکان میں داخل ہو کر کاؤنٹر پر رکھی ہوئی ٹیکسٹ کی ہندی انگریزی اور گورمکھی کی کتابوں پر نظریں جھکائے کھڑے دیکھا تو میرے قریب آگیا۔ دکان میں ایک ہندو اپنے بچے کے ساتھ کتابیں دیکھ رہا تھا۔ جہانگیر نے مجھ سے وہاں کی ہندی گورمکھی آمیز پنجابی میں پوچھا کہ مجھے کونسی کتاب چاہئے؟ میں بھی وہاں کی گورمکھی اور ہندی آمیز پنجابی میں ہی بات کیا کرتا تھا۔ چونکہ اب مجھے ہندی گورمکھی کے وہ الفاظ یاد کرنے پڑتے ہیں اس لئے اپنی داستان بیان کرتے ہوئے میں اردو زبان میں ہی مکالمے لکھ جاتا ہوں۔ میں نے ایک کتاب اٹھا کر کہا۔

"مجھے ایسی دو کتابیں چاہئیں"

جہانگیر نے کہا۔

"آپ یہاں ٹھہریں میں دوسری کتاب بھی لا کر دیتا ہوں"

یہ کہہ کر وہ اپنی گدی کی طرف چلا گیا۔ وہاں سے وہ اسی طرح کی ایک اور کتاب اٹھا کر لایا۔ اور میرے آگے رکھتے ہوئے بولا۔

"یہ لیجئے۔ قیمت اس کے اندر لکھی ہوئی ہے۔"

میں نے ورق الٹ کر دیکھا۔ اندر کاغذ کے ٹکڑے پر لکھا تھا۔

"سینما کی گیلری میں پہنچ جاؤ"

میں نے کتاب وہیں رہنے دی۔ کاغذ کا ٹکڑا اٹھا لیا اور دکان سے باہر نکل کر سیدھا اسی سڑک پر کچھ دور جا کر جو سینما ہاؤس تھا وہاں چلا گیا۔ پہلا شو شروع ہونے والا تھا۔ میں نے گیلری کا ٹکٹ لیا اور گیلری میں آکر بیٹھ گیا۔

جہانگیر انٹرول کے بعد دکان بند کر کے آیا۔ میں نے اسے ساری بات بتائی۔ کہنے لگا۔

"میں ابھی گھر جاتا ہوں۔ تم فلم ختم ہونے کے بعد آجانا"

فلم نو بجے رات ختم ہوئی۔ جہانگیر کے گھر کا مجھے پتہ تھا۔ میں اس کے گھر آگیا۔ اس نے خود ہی چاول اور سبزی وغیرہ پکائی ہوئی تھی۔ ہم نے مل کر کھانا کھایا۔ پھر چائے پی اور

باتیں کرتے رہے۔ کہنے لگا۔

"اگر تم اپنے مشن میں کامیاب ہو گئے اور صوبیدار درگاداس کو تم نے ہلاک کر دیا تو ادھر سے سیدھا واپس جموں سری نگر کی طرف نکل جانا۔ اس طرف مت آنا۔"

میں نے کہا۔

"یہ بات میں نے پہلے ہی سے سوچ رکھی ہے۔"

اس نے کہا۔

"اگر تمہارے بیان کے مطابق صوبیدار درگا داس زخمی ہو گیا تھا تو وہ سول ہسپتال میں ہو گا۔ تمہیں پہلے ہسپتال جا کر دیکھنا چاہئے۔"

میں نے کہا۔

"میں پہلے اس کے محلے سے پتہ کرنا چاہتا ہوں۔ بازار مائی سیواں کی ساری گلیوں سے میں واقف ہوں"

"جیسے تمہاری مرضی"

دوسرے روز میں دن نکلنے کے تھوڑی دیر بعد بازار مائی سیواں کی طرف چل پڑا۔ جن لوگوں نے امرتسر دیکھا ہوا ہے یا جو امرتسر کے رہنے والے ہیں انہیں معلوم ہو گا کہ بازار مائی سیواں شہر کے اندر گنجان علاقے میں شری دربار صاحب کے قریب واقع ہے اور یہ سارا علاقہ ہندو سکھوں کا ہے۔ یہاں پاکستان کے قیام سے پہلے بھی شاید ہی کسی مسلمان کا مکان ہو۔ یہ ہندو سکھ اکثریت کا علاقہ تھا۔ ہم مجیٹھہ سے جب امرتسر آتے تھے تو دربار صاحب کو دیکھنے ضرور جاتے اور جب میں امرتسر کے سکول میں پڑھتا تھا تو میرا ایک سکھ کلاس فیلو بازار مائی سیواں میں رہا کرتا تھا جس کے گھر میں گڈیاں اڑانے آیا کرتا تھا۔ اب یہ بازار زیادہ گنجان اور گندا ہو گیا تھا۔ دکانوں کے تھڑوں پر بھی دکانیں کھل گئی تھیں۔ زیادہ دکانیں سکھوں کی تھیں۔ ہندو سکھ لوگ صبح دکان بڑی جلدی کھول لیتے ہیں یہاں زیادہ دکانیں منیاری کی تھیں۔ کتابوں اور کاپیوں کی دکانیں بھی تھیں۔ ایک دکان پر سکھوں کی کرپانیں اور تلوار لٹک رہی تھیں۔ ایک بوڑھا ہندو پنساری دکان پر بیٹھا کھرل

میں کچھ رگڑ رہا تھا۔ میں نے اسے جاتے ہی نمسکار کیا اور کہا۔

"مہاراج! مجھے صوبیدار درگاداس جی کو ملنا ہے۔ اس کا مکان کہاں ہے۔ میں جموں سے آیا ہوں۔"

ہندو پنساری کہنے لگا۔

"صوبیدار کا مکان تین گلیاں چھوڑ کر چھوٹی گلی میں پہلا مکان ہے۔ مگر وہ امرتسر میں نہیں ہے۔ سنا ہے کہیں باہر چلا گیا ہے۔ تم اس کے مکان پر جا کر پتہ کر لو۔ وہاں اس کا بیٹا کالی داس رہ رہا ہے۔"

میں اس گلی میں آ گیا جہاں پہلا مکان مجھے صوبیدار درگاداس کا بتایا گیا تھا۔ مکانوں میں پھنسا ہوا تین چار منزلہ بوسیدہ مکان تھا جس کے تھڑے کے باہر ایک بکری بندھی ہوئی تھی۔ دروازہ بند تھا۔ میں نے دروازے کی کنڈی بجائی۔ اوپر سے ایک عورت نے جھانک کر پوچھا کہ کس سے ملنا ہے۔ میں نے ہاتھ باندھ کر کہا۔

"بہن جی ذرا کالی داس جی کو نیچے بھیجنا۔ میں جموں سے آیا ہوں"

تھوڑی دیر بعد ایک پلپلے بدن والا زرد رو نوجوان سیڑھیاں اتر کر میرے سامنے آ گیا۔ اس نے دھوتی پہنی ہوئی تھی بدن پر صرف ایک پرنا لپیٹا ہوا تھا۔ میں نے کہا۔

"مہاراج جی! میں جموں سے آیا ہوں۔ میرا نام کلدیپ چند ہے۔ صوبیدار جی کے نام ان کے ایک فوجی دوست کا پیغام لایا ہوں۔ صوبیدار جی گھر پر ہوں تو ان سے ملا دیجئے۔"

یہ نوجوان کالی داس ہی تھا۔ کہنے لگا۔

"مہاراج! پتا جی تو لدھیانے کوشلیا بہن جی کے پاس چلے گئے ہیں۔"

میں نے ایک سیکنڈ کے لئے کچھ سوچ کر کہا۔

"کوئی بات نہیں۔ مجھے یہاں سے آگے انبالے ہی جانا ہے۔ میں راستے میں لدھیانے اتر کر صوبیدار جی سے مل لوں گا۔ مجھے ان کا لدھیانے کا پتہ لکھ دیجئے۔"

کالی داس بولا۔

"ابھی لکھ کر لاتا ہوں"

وہ اوپر گیا۔ اوپر کسی کاغذ پر لدھیانے کا ایڈریس لکھ کر لایا۔ مجھے کاغذ کا پرزہ دیتے ہوئے بولا۔

"کوشلیا بہن ہماری چھوٹی بہن ہے۔ اس کا گھر لدھیانے کے چوڑے بازار میں ہے۔ وہاں کسی سے امرت لال بجلی والے کے گھر کا پتہ پوچھ لیں۔ کوشلیا بہن کا خاوند بجلی کے دفتر میں الیکٹریشن ہے۔ میں نے پتہ بھی کاغذ پر لکھ دیا ہے۔"

"بڑی کرپا ہے آپ کی۔ رام رام"

میں واپس مڑا تو کالی داس نے کہا۔

"کوئی چائے پانی نہیں پیا آپ نے؟"

میں نے کہا۔

"بڑی کرپا ہے۔ بڑی کرپا ہے۔"

اور میں گلی سے نکل کر بازار مائی سیواں میں آ گیا۔ اور وہاں سے واپس جہانگیر کی دکان پر جا کر اسے ساری بات بتائی۔ اس وقت دکان میں کوئی نہیں تھا۔ وہ کہنے لگا۔

"لدھیانے میں ہمارا ایک آدمی موجود ہے۔ تم اس سے جا کر ملو اور صوبیدار درگاداس کا سراغ لگاؤ اور اسے ٹھکانے لگانے کے بعد وہیں سے جموں کی طرف نکل جانا"

جہانگیر نے مجھے لدھیانے میں اپنے مجاہد کا نام پتہ بتا دیا۔ یہ نام پتہ میں آپ کو نہیں بتاؤں گا۔ اگرچہ اب وہ مجاہد وہاں نہیں ہے۔ پھر بھی میں اس کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ اس کا نام اور پیشہ یہاں فرضی لکھوں گا۔ آپ یہ سمجھ لیں کہ اس کا اسلامی نام گل ریز تھا اور وہ ہندو نام بابو رام کے نام سے لدھیانے کے ریل بازار میں فوٹو گرافی کی دکان کرتا تھا۔

میں اسی دن ٹرین کے ذریعے لدھیانے روانہ ہو گیا۔ یاد رکھیں۔ ذمے دار کمانڈو وقت کی قیمت کو پہچانتا ہے۔ وہ کبھی وقت ضائع نہیں کرتا۔ لدھیانے پہنچ کر میں سیدھا بابو رام فوٹو گرافر کی دکان پر گیا۔ جہانگیر نے کسی طریقے سے اسے میرے آنے کی اطلاع کر

دی تھی۔ میرا حلیہ بھی بتا دیا تھا۔ اس کے باوجود مجھے ایک کوڈ لفظ بھی دیا گیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ فوٹو گرافی کی ایک چھوٹی سی دکان میں ایک درمیانی عمر کا آدمی کھدر کا کرتا' کھدر کا پاجامہ اور نہرو واسکٹ پہنے ایک فوٹو کو فریم میں جڑ رہا ہے۔ ایک عورت اس کے پاس کھڑی تھی۔ میں دکان میں داخل ہوا تو اس نے ایک نگاہ مجھ پر ڈالی۔ وہ مجھے پہچان گیا تھا۔

تصویر فریم میں لگا کر اس نے عورت کو دی اور کہا۔

"یہ لو بہن جی! اب یہ اپنی جگہ پر فٹ ہو گئی ہے"

ہندو عورت تصویر لے کر دکان سے چلی گئی تو بابو رام نے میری طرف متوجہ ہو کر پوچھا۔

"کیا چاہیئے مہاشہ جی؟"

میں نے کوڈ لفظ بولا تو اس نے آہستہ سے کہا۔

"اندر سٹوڈیو میں چلو۔ ابھی فوٹو کھینچ دیتا ہوں"

دکان کے پیچھے ایک چھوٹا سا سٹوڈیو بنا ہوا تھا جہاں تین پاؤں والا ایک کیمرہ اور سامنے دیوار پر سبزی والا پردہ لگا تھا پردے کے آگے لکڑی کی منقش کرسی رکھی ہوئی تھی۔ یہاں ہمارا آدمی گاہکوں کے فوٹو بناتا تھا۔ سامنے دیوار کے ساتھ بینچ بچھا ہوا تھا۔ میں بینچ پر بیٹھ گیا۔ اتنے میں اپنا آدمی جس کا نام میں نے بابو رام بتایا ہے آ گیا۔ کہنے لگا۔

"جہانگیر نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہوا ہے۔ تم جس مسلم کش کافر کی تلاش میں یہاں آئے ہو وہ لدھیانے میں نہیں ہے"

میں نے پوچھا۔

"پھر وہ کہاں ملے گا؟"

بابو رام بولا۔

"اس کو جان کا دھڑکا لگا ہے۔ اسے پتہ چل گیا ہے کہ کشمیری مجاہد اس سے کشمیری مسلمانوں کے خون کا بدلہ لینے اس کے پیچھے لگے ہوئے ہیں اور وہ کسی جگہ بھی قتل ہو سکتا ہے۔ فوج سے وہ ایک بار پھر سبکدوش کر دیا گیا ہے۔ وہ زخمی ہو گیا تھا۔ یہاں اور

امرتسر میں اس کا علاج ہوتا رہا ہے۔ یہاں تمہارے آنے سے ایک دن پہلے ہمارے ایک حریت پرست نے اس پر حملہ کیا تھا مگر وہ جان بچانے میں کامیاب ہو گیا۔ اب وہ لدھیانے سے بھی فرار ہو کر کسی نامعلوم مقام پر چلا گیا ہے۔"

میں نے پوچھا۔

"کیا یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ کس شہر میں ہے اور کہاں چھپا ہوا ہے۔ کوئی دوسرا حریت پرست اسے ٹھکانے لگانے میں کامیاب ہو یا نہ ہو لیکن میں اسے ہر حالت میں قتل کر کے اس سے ہزاروں بے گناہ نہتے کشمیریوں کے خون کا بدلہ لینا چاہتا ہوں"

بابو رام نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

"یہ معلوم کرنا پڑے گا۔ مجھے کم از کم آج کے دن اور رات کی مہلت دے دو۔ میرے آدمی یہ سیکرٹ معلوم کر لیں گے۔"

بابو رام اپنی دکان کے اوپر ہی ایک چوبارے میں رہتا تھا۔ میں نے بھی رات وہیں گزاری۔ بابو رام نے اسی وقت اپنے جاسوس صوبیدار درگا داس کا اتہ پتہ معلوم کرنے کے واسطے روانہ کر دیئے تھے۔ دوسرے دن دوپہر کے وقت بابو رام کھانے کے ٹائم پر دکان بند کر کے اوپر چوبارے میں میرے پاس آ گیا۔ کہنے لگا۔

"صوبیدار درگا داس لدھیانے سے کلکتے جا کر کسی جگہ روپوش ہو گیا ہے کلکتے میں اپنا ایک آدمی بہو بازار میں چائے کا ہوٹل چلاتا ہے۔ مسلمانوں کے اس خونی قاتل کو تلاش کرنے میں وہ تمہاری مدد کر سکتا ہے۔"

بابو رام نے مجھے کلکتے میں اپنے آدمی کا نام اور اس کی دکان کا ایڈریس اور اس سے مل کر جو کوڈ لفظ مجھے بولنا تھا وہ بتایا اور کہنے لگا۔

"اپنا یہ آدمی بہت ہوشیار ہے اور وہ کلکتے میں ایک قوم پرست مسلمان کی حیثیت سے کافی مشہور ہے۔ وہ تمہاری ہر طرح سے مدد کرے گا اور مجھے یقین ہے کہ یہ مسلمانوں کا خونی درگا داس جہاں بھی ہو گا وہ اس کا سراغ لگا لے گا۔ میں اسے خفیہ طریقے سے تمہارے آنے کی اطلاع بھی کر دوں گا"

میں اسی رات کو ہوڑہ ایکسپریس میں سوار ہو کر کلکتے کی طرف روانہ ہو گیا۔ اسے پہچان لیا۔ وہ کاؤنٹر کے قریب لوہے کی کرسی پر بیٹھا بنگلہ اخبار پڑھ رہا تھا۔ میں نے قریب
آدمی بابو رام نے مجھے خاص طور پر ہدایت کی تھی کہ میں کلکتے میں اپنے آپ کو پنجاب جا کر آہستہ سے کہا۔
کانگریسی مسلمان ظاہر کروں اور اپنا کوئی ہندوانہ نام بھی رکھ لوں لدھیانہ سٹیشن پر روا "کافی مل جائے گی؟"
ہونے سے پہلے اس نے میرے ماتھے پر ہندوؤں والا لال تلک بھی لگا دیا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔
میرے لئے ہندو بننا بڑا آسان تھا۔ میں ہندی گجراتی زبانوں پر کافی عبور رکھتا تھا۔ ہن "اندر بیٹھو۔ مل جائے گی"
دیو مالا میں نے ساری کی ساری پڑھ رکھی تھی۔ سنسکرت زبان بھی تھوڑی بہت سمجھ ل میں نے دوبارہ کہا۔
تھا۔ ویدوں کا بھی میں نے مطالعہ کر رکھا تھا۔ بنگلہ زبان بھی تھوڑی تھوڑی سمجھ لیتا "میں مدراسی کافی پسند کرتا ہوں"
اگرچہ بول نہیں سکتا تھا۔ اور کلکتے کے ایک دو پھیرے پہلے بھی لگا چکا تھا۔ کلکتہ ش تب شاہ دین نے اخبار سے نظریں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ وہ مجھے پہچاننے کی
میرے لئے کوئی نیا شہر نہیں تھا۔ ٹرین کلکتہ شہر کے ہوڑہ سٹیشن پر پہنچی تو میں رکشے م کوشش کر رہا تھا۔ اس کے قریب ہی ایک خالی کرسی پر بیٹھتے ہوئے میں نے دھیمی آواز
سوار ہو کر سیدھا بہو بازار پہنچ گیا۔ بہو بازار کلکتے کا ایک کاروباری بازار ہے۔ اور ا میں کہا۔
بازار میں دنیا کی ہر شے کی دکان موجود ہے۔ بابو رام نے مجھے لدھیانے میں ہی اپنے "مجھے شاہ دین سے ملنا ہے۔"
بازار والے مجاہد کی تصویر دکھا دی تھی۔ بہو بازار میں کافی رونق تھی۔ بنگالی مرد ا میری نظریں بازار پر لگی تھیں۔ اب اس نے مجھے پہچان لیا تھا اور اس نے دوبارہ
ساڑھیوں میں ملبوس بنگالی عورتیں خرید و فروخت میں مصروف تھیں۔ بازار میں سے اخبار پر نظریں جما لی تھیں۔ اس نے اخبار کا ورق الٹتے ہوئے پنجابی میں کہا۔
رکشا اور ہاتھوں سے کھینچی جانے والی لمبی لمبی ریڑیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ مجھے اپنے آد "تمہیں جس نے بھیجا ہے اس کا نام کیا ہے؟"
کی چائے کی دکان کی تلاش تھی۔ بھارت کے مشرقی اور جنوبی علاقوں میں چائے کافی بہ میں نے بابو رام کا اصلی اسلامی نام لیا۔ شاہ دین نے اخبار اپنے گھٹنوں پر رکھ دیا اور
پی جاتی ہے۔ یہ مرطوب علاقے ہیں۔ سال میں بارشیں بہت ہوتی ہیں یہاں دودھ گھی ا جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔ ایک سگریٹ خود سلگایا۔ ایک مجھے پیش کیا اور میرے
لسی کا وہ رواج نہیں ہے جو ہمیں پاکستان میں خاص طور پر پنجاب میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ سگریٹ کو سلگاتے ہوئے آہستہ سے بولا۔
بابو رام نے مجھے اپنے مجاہد کا نام بتا دیا تھا۔ مگر میں اس کا اصلی نام نہیں لکھوں گ "تمہارا کوڈ ورڈ کیا ہے؟"
آپ فرض کر لیں کہ اس کا نام شاہ دین تھا۔ جیسا کہ مجھے بتایا گیا تھا شاہ دین کلکتے میں کٹ میں نے سگریٹ کا دھواں اڑاتے ہوئے آہستہ سے وہ کوڈ لفظ بولا جو بابو رام نے مجھے
قوم پرست بھارتی مسلمان کی حیثیت سے کافی جانا پہچانا آدمی تھا۔ اس کی چائے کی دکا لدھیانے میں بتایا تھا شاہ دین نے پیچھے کسی نوکر کی طرف گردن موڑ کر دیکھا اور بنگلہ زبان
میں نے تلاش کر لی۔ لمبی دکان تھی۔ اندر کرسیاں میزیں لگی تھیں۔ لوگ چائے کافی و میں چیخ کر کہا۔
پینے میں مصروف تھے۔ باہر ایک جانب بنگالی پنواڑی کا کھوکھا تھا جہاں درگا دیوی کی شی "اچھا والا کافی دو صاحب کو"
میں جڑی ہوئی تصویر کے آگے لوبان سلگ رہا تھا۔ میں نے اپنے آدمی شاہ دین کو شکل وہ کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"اندر بیٹھو"

میں دکان میں جا کر بیٹھ گیا۔ لڑکا کافی کا پیالہ آگے رکھ گیا۔ میں کافی کی چسکیاں لینے لگا۔ میری نگاہیں شاہ دین پر لگی تھیں۔ وہ دکان سے اتر کر بازار میں پان سگریٹ کے کھوکھے کے پاس کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔ بازار میں پہلے اس نے دائیں جانب دیکھا۔ پھر بظاہر بڑی بے نیازی سے دوسری جانب دیکھا۔ یقینی طور پر وہ یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میرے پیچھے کوئی خفیہ پولیس والا تو نہیں لگا ہوا۔ جو آدمی دشمن ملک میں کس جگہ ٹک کر اپنے ملک کے لئے جاسوسی کرتے ہیں وہ خفیہ پولیس والوں کے چہروں سے بخوبی واقف ہوتے ہیں۔ دوسرے ملک میں جا کر اپنے ملک کے مفادات کے لئے جاسوسی کرنے کا ہر ملک کو حق ہوتا ہے۔ پکڑے جانے کی صورت میں ایک خاص بین الاقوامی قانون کے تحت جاسوس کو سزا ملتی ہے۔ مگر بھارت میں اس بین الاقوامی قانون کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا۔ بھارت میں پاکستان کا کوئی باقاعدہ جاسوس میں نے اپنے قیام کے دوران نہیں دیکھا۔ اگر کسی ایسے شخص سے ملاقات ہوئی بھی ہے تو وہ یا تو بھارتی مسلمان ہی تھا جو محض پاکستان سے محبت اور پاکستان کی سلامتی کی خاطر رضاکارانہ طور پر یہ کام کر رہا تھا یا پھر اس کا تعلق جموں کشمیر کی حریت پرست تحریک سے تھا جو کشمیر میں مسلمانوں پر بھارتی ظلم و ستم اور جارحانہ قبضے کے خلاف جنگ کر رہے تھے۔ اس کے بعد میں تھا۔ مجھے پاکستان نے بھارت میں جاسوسی کرنے نہیں بھیجا تھا۔ پاکستان کی حکومت کو تو معلوم ہی نہیں تھا کہ میں بھارت میں اپنے وطن کی سلامتی کی خاطر سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے ہوں۔ میں اپنے طور پر یہ فرض ادا کر رہا تھا اور میری کمانڈو سرگرمیوں کا زیادہ تعلق جہاد کشمیر سے تھا۔

شاہ دین کا تعلق بھی کشمیر کی حریت پرست تحریک سے تھا۔ کلکتے میں وہ کئی برسوں سے ایک قوم پرست بھارتی مسلمان کی حیثیت سے چائے کا ہوٹل چلا رہا تھا۔ حقیقت میں وہ سچا کشمیری مسلمان تھا اور پاکستان کی سلامتی اور استحکام بھی اس کے خفیہ مشن میں شامل تھا۔ وادی کشمیر سے اتنی دور بیٹھ کر وہ براہ راست جہاد کشمیر میں حصہ نہیں لے سکتا

تھا مگر وہ بھارتی حکومت اور بھارتی ملٹری ہائی کمانڈ کی سرگرمیوں پر ضرور کڑی نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ اس کے آدمی اسے سرکاری حلقے کی ہر نئی خبر لا کر دیتے تھے جسے وہ لدھیانے بابو رام کو پہنچا دیتا تھا اور بابو رام اسے سری نگر میں حریت پرستوں تک پہنچا دیتا تھا۔ جنگ ستمبر میں ہزیمت اٹھانے کے بعد بھارتی حکومت اور بھارتی فوجی ہائی کمانڈ کی خفیہ سرگرمیوں میں بے حد اضافہ ہو گیا ہوا تھا اور ظاہر یہی ہوتا تھا کہ بھارتی حکومت پاکستان سے 65ء کی جنگ کی اپنی شکست کا بدلہ لینا چاہتی ہے اور اس نے ہر قسم کی فوجی تیاریاں ابھی سے شروع کر دی ہیں۔ ان حقائق کی تصدیق بعد میں شاہ دین نے بھی کی۔

میں دکان کے اندر بیٹھا خاموشی سے کافی پیتا رہا۔ شاہ دین اب دکان میں آکر کرسی پر بیٹھ گیا تھا اور ایک بنگالی گاہک سے بنگلہ زبان میں ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ دکان میں گاہک کم ہو گئے تھے۔ میرے آس پاس کی میزوں پر کوئی گاہک نہیں تھا۔ شاہ دین شاید اسی لمحے کا انتظار کر رہا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ میرے اردگرد کوئی گاہک نہیں ہے تو وہ سگریٹ کے کش لگاتا میرے قریب آکر بنگلہ زبان میں بولا کہ کافی مجھے پسند آئی؟ میں نے بنگلہ زبان میں ہی بھالو کہہ دیا۔ وہ میز پر دونوں ہتھیلیاں جما کر جھک گیا اور آہستہ سے اردو میں بولا۔

"ہوڑہ سٹیشن کے نمبر تین پلیٹ فارم پر میرا انتظار کرو"

اس کے ساتھ ہی وہ میز سے پیچھے ہٹ گیا اور سگریٹ کا کش لگا کر ملازم کو بنگلہ میں کچھ ہدایت دینے لگا۔ جو پیغام اس نے مجھے دینا تھا دے دیا تھا۔ میں چائے کی دکان میں کچھ دیر بیٹھنے کے بعد اٹھا اور بازار میں آکر اس طرف چلنے لگا جدھر سے میں بازار میں داخل ہوا تھا۔ بازار میں ہی میں نے ایک رکشا لیا اور اسے ہوڑہ سٹیشن چلنے کو کہا۔

اگر آپ کلکتے گئے ہیں اور ہوڑہ سٹیشن پر ٹرین سے اتریں ہیں تو آپ کو یاد ہو گا کہ کلکتے کے دو بڑے ریلوے سٹیشن ہیں۔ ایک کا نام سیالدہ ہے۔ دوسرے کا نام ہوڑہ ہے۔ پنجاب اور بھارت کے دوسرے صوبوں سے آنے والی ٹرینیں ان دونوں سٹیشنوں پر ہی آکر ٹھہرتی ہیں۔ ہوڑہ کا ریلوے سٹیشن لمبے لمبے پلیٹ فارموں والا ہے۔ لوہے کی چھت

بہت اونچی ہے۔ میں پلیٹ فارم نمبر تین پر آ کر ایک بنچ پر بیٹھ کر سوچنے لگا کہ مجھے کس جگہ اطمینان سے بیٹھ کر شاہ دین کا انتظار کرنا چاہیئے؟ وہاں کوئی ریفرشمنٹ روم بھی نہیں تھا۔ کتابوں اور چائے کے سٹال ضرور تھے۔ میں لوگوں کی نظروں میں نہیں آنا چاہتا تھا۔ یہ بھی چاہتا تھا کہ شاہ دین مجھے دور سے دیکھ لے۔ چنانچہ میں ایک بک سٹال کے کونے کی جانب لوہے کے بہت بڑے صندوق پر بیٹھ گیا جو ریلوے والوں کا ہی لگتا تھا۔ شکل اور حلیے سے میں پنجاب کا کوئی ہندو نوجوان لگتا تھا۔ میری ڈاڑھی اور سر کے بڑھے ہوئے بالوں سے یہ تاثر ملتا تھا کہ میں مذہبی ٹائپ کا ہندو ہوں۔ زہریلی سوئیوں والا بال پوائنٹ اس وقت بھی میری جیکٹ کی اندر والی جیب میں محفوظ تھا۔ اس کے علاوہ کچھ انڈین کرنسی بھی تھی۔ ماتھے پر لال تلک لگا تھا۔ کلکتے کے آسمان پر بادل چھانے لگے تھے۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ لگتا تھا کہ بارش ہو گی۔ پلیٹ فارم پر کوئی ٹرین آنے والی تھی۔ شاید اسی ٹرین کو وہاں سے واپس بھی جانا تھا۔ مسافر آنے لگے تھے۔ قلی سروں پر اور ٹرالیوں میں سامان لادے آ رہے تھے۔ یہ بنگالی مسافر تھے۔ ان میں ہر عمر کی دبلی موٹی نوجوان اور بوڑھی بنگلہ عورتیں اور مرد تھے۔ کسی کو میری طرف دیکھنے کی فرصت نہیں تھی۔ ہر طرف بنگلہ زبان بولی جا رہی تھی۔ ایک سکھ بچہ گود میں اٹھائے اپنی بیوی کے ساتھ میرے قریب سے پنجابی بولتا گزر گیا۔ پنجابی زبان سن کر میرے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم آگیا۔ دوسرے ملک میں اپنی مادری زبان سن کر بڑی خوشی ہوتی ہے۔ مجھے اس کا کئی بار تجربہ ہو چکا ہے۔ میری نگاہیں اپنے آدمی شاہ دین کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ مجھے وہاں بیٹھے کافی دیر ہو گئی تھی۔ اتنے میں ایک ٹرین آکر پلیٹ فارم پر رک گئی۔ وہاں شور مچ گیا۔ اسی دوران مجھے شاہ دین دکھائی دیا۔ وہ ایک طرف سے میری جانب ہی چلا آ رہا تھا۔ اس نے مجھے دور سے دیکھ لیا تھا۔ میں اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ وہ بھی میرے پاس آکر لوہے کے صندوق پر بیٹھ گیا۔ وہ سگریٹ پی رہا تھا۔ سامنے ٹرین کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے پنجابی میں مجھے کہا۔

"چھ سات قدم کا فاصلہ ڈال کر میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ"

ہم ہوڑہ سٹیشن سے نکل گئے۔

شاہ دین ہوڑہ برج کی طرف مڑ گیا۔ دریائے ہگلی کلکتے شہر کے درمیان سے نہیں تو اس کے پہلو سے ضرور گزرتا ہے۔ پہلے اس دریا پر کشتیوں کا پل ہوا کرتا تھا۔ اس کے بعد لوہے کا بہت بڑا پل بنا دیا گیا اسے ہوڑہ برج کہا جاتا تھا۔ ہگلی دریا اصل میں دریائے جمنا ہے جس کا نام کلکتے سے گزرتے ہوئے ہگلی پڑ گیا ہے۔ یہ دریا کلکتے کی بندرگاہ خضر پور جیٹی سے ہو کر آگے خلیج بنگال میں جا گرتا ہے۔ شاہ دین سڑک پر ایک جگہ رک گیا۔ وہاں ایک بنگالی داب یعنی کچے ناریل کی ریڑھی لگائے بیٹھا تھا۔ شاہ دین نے ٹیکسی لی اور وہاں سے کچھ دور جا کر ٹیکسی کو رکوا دیا۔ میں تیز تیز چل کر ٹیکسی کے قریب گیا اور اس میں سوار ہو گیا۔ ہوڑہ برج وہاں سے دور نہیں تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہماری ٹیکسی ہوڑہ برج یعنی دریائے ہگلی کے پل پر سے گزر رہی تھی۔ جب ہم پل پر سے گزر گئے تو وہ کلکتے میں بولی جانے والی عام اردو میں کہنے لگا۔

"آج کل یہاں بارشیں بہت ہوتی ہیں"

میں نے کہا۔

"مگر برسات کا موسم تو گزر چکا ہے"

وہ بولا۔

"یہاں برسات کے آخر میں بھی خوب بارشیں ہوتی ہیں۔ دیکھ لو صبح سے آسمان پر بادل چھائے ہوئے ہیں۔"

معلوم ہوا کہ وہ محض باتیں کرنے کے لئے باتیں کر رہا تھا۔ تاکہ ٹیکسی ڈرائیور
حیرت نہ ہو کہ یہ دو آدمی اتنی دیر سے خاموش کیوں بیٹھے ہیں۔ دریائے ہگلی کے پار
علاقہ فیکٹری ایریا بھی کہلاتا ہے۔ یہاں ہر قسم کے کارخانے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے کارخا
بھی ہیں اور اونچی اونچی چمنیوں والے بڑے کارخانے بھی ہیں۔ اس علاقے میں
مزدوروں کے کوارٹروں کے علاوہ فیکٹریوں کے مالکوں کی بڑی بڑی کوٹھیاں بھی ہیں جو در
کے کنارے دور تک چلی گئی ہیں۔ ہماری ٹیکسی کارخانوں کے قریب ایک سڑک پر سے
گزر رہی تھی۔ شاہ دین کہنے لگا۔

"سیٹھ صاحب کا کارخانہ بھی اسی جگہ پر ہے وہ مجھے جانتے ہیں۔ بھگوان نے چاہا
تمہیں ان کے کارخانے میں ضرور نوکری مل جائے گی۔"

میں نے شاہ دین کی طرف دیکھا۔ اس نے آنکھ سے ٹیکسی ڈرائیور کی طرف اشار
کیا۔ گویا وہ یہ کہنا چاہتا تھا کہ میں صرف اس ٹیکسی ڈرائیور کے لئے یہ باتیں کر رہا ہوں
کہ اسے ہم پر کسی طرح کا کوئی شک نہ گزرے۔

اس نے ایک کارخانے کے بڑے گیٹ کے پاس ٹیکسی رکوائی اور ہم کارخانے کے
گیٹ کے پہلو میں ایک کھیت میں سے گزرنے کے بعد دریا کے کنارے پر آگئے۔ یہاں
کہیں کہیں مزدوروں کی جھونپڑیاں اور ٹین کی ڈھلانی چھتوں والے کوارٹر نظر آرہے
تھے۔ شاہ دین نے یہاں سے تھوڑی دور ایک کوارٹر اپنے رہنے کے لئے بنوا رکھا تھا۔
کہنے لگا۔

"میں کبھی کبھی یہاں پر آتا ہوں۔ لوگوں پر میں نے یہ ظاہر کیا ہوا ہے کہ یہ میرا
گودام ہے جہاں میں چائے چینی کا سٹاک رکھتا ہوں جو میرے ہوٹل میں کام آتا ہے۔
لیکن اصل میں میں اس کوارٹر سے اپنے آدمیوں کے ساتھ رابطہ رکھتا ہوں۔ وہ لوگ اسی
جگہ آکر مجھے ضرور رپورٹیں مہیا کرتے ہیں اور مجھ سے ہدایات وصول کرتے ہیں۔"

پٹ سن کے کھیتوں سے کچھ فاصلے پر دریا کے کنارے سرکنڈوں اور ناریل کے
جھنڈوں کے نیچے یہ لکڑی کی چھت اور پتھر کی دیواروں والا کوارٹر چھوٹا سا تھا۔ باہر پانی کا

ایک پمپ لگا تھا۔ ناریل کے کٹے ہوئے درختوں کے دو چار تنے اور سوکھی شاخوں کا ڈھیرا
پڑا تھا۔ کوارٹر کے اندر بانس کی چارپائی بچھی تھی۔ صحن میں پانی کے پمپ کے پیچھے ٹین
کی چھت والا ایک بوسیدہ کچن تھا۔ ہم اندر جا کر بیٹھ گئے۔

شاہ دین نے دروازہ بند کر دیا اور مجھے سگریٹ دیا کہنے لگا۔

"اب تم ساری بات مجھے تفصیل سے بتاؤ لدھیانے والے اپنے آدمی نے مجھے صرف
ایک اشارہ دیا تھا کہ تم کسی آدمی کی تلاش میں ہو"

میں نے شاہ دین کو شروع سے لے کر آخر تک ساری بات بیان کر دی اور اسے بتایا
کہ میں نے سری نگر کی شہید مسجد کے سامنے کھڑے ہو کر قسم کھائی ہے کہ میں سینکڑوں
مظلوم کشمیری مسلمانوں کا خون بہانے والے اس قصائی اور ظالم صوبیدار درداس سے
شہیدوں کے خون کا بدلہ ضرور لوں گا۔

"مجھے لدھیانے سے معلوم ہوا ہے کہ وہ کلکتے آگیا ہوا ہے اور شانے پر کسی حریت
پرست مجاہد کی گولی لگنے سے زخمی بھی ہے۔ میں اس کی شکل پہچانتا ہوں۔ اس کی بڑی
بڑی مونچھیں ہیں اور درمیانی عمر کا آدمی ہے۔"

شاہ دین میری باتیں بڑے غور سے سن رہا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ کچھ سوچتا بھی جا رہا
تھا۔ جب میں نے اپنی بات ختم کی تو وہ کہنے لگا۔

"صوبیدار درگاداس تمہارے کہنے کے مطابق اب فوج میں نہیں ہے۔ وہ زخمی بھی
ہے۔ اس لئے یقیناً یہاں وہ کسی ایسے ہسپتال میں پڑا ہو گا جس کا تعلق انڈین آرمی سے
ہو۔ اگرچہ کلکتہ بہت بڑا شہر ہے اور یہاں کسی ایک آدمی کا پتہ لگانا اتنا آسان کام نہیں
ہے۔ لیکن ہمارے آدمی بہت ہوشیار اور ذہین ہیں۔ وہ یہاں ہر جگہ اپنا اثر ورسوخ رکھتے
ہیں۔ مجھے کچھ وقت دو۔ میرے آدمی درگاداس کا پتہ ڈھونڈ نکالیں گے۔"

میں شاہ دین کی جھونپڑی میں پڑ گیا۔ مجھے اس نے شہر اپنے ہوٹل یعنی چائے کی دکان
پر آنے سے منع کر دیا تھا۔ ایک لڑکا مجھے صبح شام کوارٹر میں کھانا وغیرہ دے جاتا تھا۔ مجھے
وہاں رہتے تین دن گزر گئے۔ اس دوران شاہ دین مجھ سے ملنے بالکل نہیں آیا تھا۔ چوتھے

دن شام کو وہ آگیا۔ کہنے لگا۔

"میرے آدمیوں نے کشمیریوں کے قاتل درگاداس کا پتہ لگا لیا ہے۔"

میں نے جلدی سے پوچھا۔

"کیا وہ کسی ہسپتال میں ہے؟"

شاہ دین بولا۔

"اس کے بارے میں صرف اسی قدر معلوم ہو سکا ہے کہ وہ کلکتہ کی بندرگاہ کے پیچھے جو آبادی ہے وہاں کسی جگہ روپوش ہے۔ اسے خوف لگا ہوا ہے کہ کوئی نہ کوئی کشمیری کمانڈو اسے ضرور ہلاک کردے گا۔ اس وجہ سے وہ کسی خفیہ جگہ پر چھپ کر رہا ہے۔۔ ہمارا کوئی بھی آدمی سر توڑ کوشش کے باوجود اس کے ٹھکانے کا سراغ نہیں لگا سکا۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اس نے کچھ ریٹائرڈ فوجی اپنے اردگرد بطور باڈی گارڈ رکھے ہوئے ہیں جو ہر وقت مسلح اور چوکس رہتے ہیں اور صوبیدار درگاداس کی حفاظت کرتے ہیں۔"

کلکتے کی بندرگاہ کے پیچھے جو نئی اور پرانی کالونیاں تھیں میں ان کالونیوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ میں نے شاہ دین سے پوچھا۔

"وہاں وہ کس کالونی میں روپوش ہو سکتا ہے؟"

شاہ دین نے کہا۔

"مجھے کچھ اور مہلت دو۔ میرے آدمی یہ بھی پتہ کرلیں گے۔"

اس کے بعد مزید دو تین دن گزر گئے لیکن شاہ دین کے آدمی درگاداس کا اتا پتا معلوم نہ کرسکے۔ آخر میں نے شاہ دین سے کہا۔

"بھائی! اب میں خود اس کا پتہ لگانے جاؤں گا۔ میں بندرگاہ والی آبادیوں میں آتا جاتا رہا ہوں۔"

شاہ دین بولا۔

"جیسے تمہاری مرضی۔ اس کوارٹر کی ایک چابی تمہارے پاس رہے گی۔ تم جب اور

جس وقت چاہو یہاں آسکتے ہو۔ تمہیں کشمیری مسلمانوں کے اس موذی قاتل کی تلاش کے سلسلے میں کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتادو۔"

میں نے اسے اپنی زہریلی بال پوائنٹ پنسل کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ بعض چیزیں اور بعض راز ایسے ہوتے ہیں کہ عقلمند کمانڈو وہ راز اپنے آدمیوں سے بھی چھپا کر رکھتے ہیں۔ میں نے کہا۔

"تم مجھے صرف ایک چاقو لادو جس سے میں درگاداس کا کام تمام کرسکوں"

یہ بھی میں نے محض اس لئے شاہ دین سے کہہ دیا تھا کہ وہ یہ نہ سوچے کہ میں نہتا اس پیشہ ور فوجی کو کیسے ہلاک کروں گا۔ شاہ دین کو میرے بارے میں یہ علم نہیں تھا کہ میں حریت پرست ہونے کے علاوہ ایک تجربہ کار تربیت یافتہ کمانڈو بھی ہوں۔ ج شاہ دین نے اسی وقت ایک صندوق میں سے چاقو نکال کر مجھے دیا۔ یہ عام چاقو سے ذرا بڑا چاقو تھا۔ میں نے اسے جیب میں رکھ لیا۔ شاہ دین کے مخبروں نے صرف یہ اشارہ دیا تھا کہ صوبیدار درگاداس کو ایک بار ساونت کالونی کے درگا مندر میں جاتے دیکھا گیا ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ ساونت کالونی میں یا اس کے آس پاس ہی کہیں روپوش ہو گا۔ ساونت کالونی بندرگاہ پر کام کرنے والے مزدوروں کی کالونی تھی۔ یہاں ان کے جھونپڑا نما بوسیدہ کوارٹر تھے۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ درگاداس ان گندے کوارٹروں میں نہیں چھپ سکتا۔ وہ ضرور اردگرد کی کسی کالونی میں چھپا ہوا ہو گا اور اپنے پیچھے لگے ہوئے حریت پسندوں کے مخبروں کو دھوکا دینے کے لئے وہ ساونت کالونی کے درگا مندر میں پوجا وغیرہ کو گیا ہو گا۔

اس روز سارا دن وقفے وقفے سے کلکتے میں بارش ہوتی رہی۔ میں شاہ دین کے کوارٹر میں ہی رہا۔ شام کو بارش بالکل رک گئی اور ذرا اندھیرا ہوا تو میں دریا پار کر کے بس میں سوار ہو کر بندرگاہ پہنچ گیا۔ ساونت کالونی وہاں تھوڑے فاصلے پر ہی تھی۔ میں سیدھا اس کالونی کے درگاہ مندر میں پہنچ گیا۔ مندروں کا ماحول میرے لئے اجنبی نہیں تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ درگادیوی کی پوجا کس طرح کی جاتی ہے اور ہنومان اور ویشو اور شیو جی کے مندر میں پوجا کے وقت کیا رسومات ادا کی جاتی ہیں۔ میں نے کبھی کسی مورتی کے

آگے سر نہیں جھکایا تھا۔ بس ہاتھ سے گھنٹی بجا دیا کرتا تھا یا ہاتھ جوڑ کر مورتی کے آگے کھڑا ہو جاتا اور دل میں کہتا۔

"میں جانتا ہوں تو پتھر کا بت ہے۔ میرے نزدیک تمہاری کوئی حیثیت نہیں ہے۔ میرا سر صرف ایک خدا کے آگے جھکتا ہے جس کا کوئی شریک نہیں ہے اور سارے جہانوں کا رب ہے۔"

درگا دیوی کے مندر میں پوجا کرنے والوں کا کافی رش تھا۔ میں مندر کے دروازے میں داخل ہو کر ایک طرف کھڑا ہو گیا اور سوچنے لگا کہ یہاں کون ایسا شخص ہو سکتا ہے جو مجھے درگا داس کے بارے میں کوئی سراغ بتا سکے۔ ایسا آدمی مندر کا بڑا پجاری ہی ہو سکتا تھا۔ کیونکہ پجاری ہمیشہ مندر میں رہتا ہے اور وہ پوجا کرنے آنے جانے والوں سے واقف ہوتا ہے۔ میں نے دور سے پجاری کو دیکھا۔ وہ مورتی کے آگے ایک طرف ہو کر بیٹھا پجاریوں سے پیسے وصول کرنے اور انہیں پھول دینے میں مصروف تھا۔ میں ایک چبوترے کے پاس خاموشی سے بیٹھ گیا۔

کافی دیر بعد جب پوجا کرنے والوں کا رش ختم ہو گیا اور وہاں اکا دکا لوگ ہی رہ گئے تو میں پجاری کی طرف بڑھا۔ اسے دس روپے کا نذرانہ پیش کیا۔ وہ دس روپے دیکھ بڑا خوش ہوا۔ سمجھ گیا کہ میں کوئی موٹی آسامی ہوں اور نیا نیا اس علاقے میں آیا ہوں۔ اس نے مجھے پھولوں کے ساتھ تھوڑی سی مٹھائی بھی دی۔ میں نے سنسکرت کا ایک اشلوک پڑھا اور کہا۔

"مہاراج! ہم بڑی دور سے دیوی کے درشنوں کو آئے ہیں۔ آج رات مندر میں ٹھہرنے کا خیال ہے۔ کیا یہاں کوئی ٹھکانہ مل جائے گا۔ ہم اس کا کرایہ ادا کر دیں گے۔"

پجاری کو مجھ سے مال ملنے کی توقع تھی۔ کہنے لگا۔

"کیوں نہیں مہاراج کیوں نہیں۔ آپ کو ضرور کوٹھڑی مل جائے گی۔ آپ تھوڑی دیر بیٹھیں۔ میں خود آپ کو لے جا کر کوٹھڑی دکھاتا ہوں۔"

میں کچھ دیر مندر کے احاطے میں ہی ٹہلتا رہا۔ جب دیکھا کہ پجاری اپنی پوجا پاٹھ کی

دکان بڑھا رہا ہے تو میں اس کے پاس آ گیا۔ وہ مجھے احاطے میں ایک چھوٹی سی کوٹھڑی میں لے گیا جہاں کھاٹ پر بستر لگا تھا اور مچھردانی بھی لگی ہوئی تھی۔ اوپر چھت کے ساتھ پنکھا بھی چل رہا تھا۔ یہ جگہ اچھی تھی۔ میں نے اسے جیب سے بیس روپے نکال کر دیئے اور کہا۔

"مہاراج! جاتی دفعہ بھی آپ کی خدمت کروں گا۔ میں ویشنو ہوں۔ میرے لئے اگر دال سبزی کا انتظام ہو جائے تو ٹھیک رہے گا۔"

پجاری بولا۔

"مہاراج آپ کوئی فکر ہی نہ کریں۔ آپ جو کہیں گے آپ کو مل جائے گا۔"

رات کو وہ خود میرے لئے سبزی ترکاری اور چاول لے کر آیا۔ کہنے لگا۔

"مہاراج! آپ ماتا شیراں والی کے دیس سے آئے ہیں کیا؟"

میں نے یونہی کہہ دیا کہ ہاں میں وہیں سے آیا ہوں۔ اس کے بعد میں نے اسے سنسکرت کے کچھ اشلوک سنائے جو میں نے ایسے موقعوں کے لئے زبانی یاد رکھے تھے اور اسے گیتا کا تھوڑا سا پاٹھ بھی سنایا۔ وہ مجھ سے بڑا متاثر ہوا۔ ساتھ ہی میں نے مزید جیب سے بیس روپے نکال کر اسے دیئے۔ وہ تو خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔ اس وقت رات کا پہلا پہر گزر رہا تھا۔ میں نے ادھر ادھر کی باتوں کے بعد کہا۔

"بات یہ ہے پجاری جی! ہمارا ایک بڑا بھائی ہے۔ وہ فوج میں صوبیدار تھا۔ کشمیر کے محاذ پر اس نے بڑے انتک وادی مسلمان کشمیریوں کو ٹھکانے لگایا تھا۔ اب فوج نے اسے ریٹائر کر دیا ہے۔ اس کو خطرہ تھا کہ کشمیری مسلمان اس کو جان سے مارنے کے لئے اس کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ ہم نے بھائی جی کو بڑا سمجھایا کہ وہ کچھ نہیں کر سکتے مگر اس پر خوف بیٹھ گیا تھا۔ بس وہ ایک روز گھر سے نکل بھاگا۔ ہماری ماتا جی اور بھائی کے بچے سخت پریشان ہیں۔ مجھے کسی نے بتایا کہ وہ کلکتے کے ساونت کالونی میں رہ رہا ہے۔ بس اسی کی تلاش میں آیا ہوں۔ ماتا جی تو ویر جی کے غم میں سورگباش ہونے والی ہیں۔"

پجاری بڑے غور سے میری باتیں سنتا رہا۔ اس نے پوچھا۔

"اس کا نام کیا ہے؟"

میں نے کہا۔

"صوبیدار درگاداس اس کا نام ہے۔ کشمیر میں اسے کاندھے پر گولی بھی لگی تھی"

پجاری جھٹ بولا۔

"اس کی مونچھیں تو نہیں ہیں؟"

مجھے خبر مل چکی تھی کہ درگاداس نے پہچانے جانے کے خوف سے اپنی بڑی بڑی مونچھیں منڈوا ڈالی ہیں۔ میں نے کہا۔

"پہلے تھیں۔ مگر میرا خیال ہے اب ویر جی نے مونچھیں کٹوا دی ہوں گی"

پھر پجاری نے مجھے اس شخص کا جو حلیہ بتایا وہ ہو بہو صوبیدار درگاداس کا تھا۔ پجاری بولا۔

"مہاراج! اس شکل صورت کے آدمی کو میں نے تین چار بار مندر میں آتے دیکھا ہے۔ اس کے کندھے پر پٹی بھی بندھی ہوئی تھی۔"

میں نے جلدی سے کہا۔

"بس یہی میرے ویر جی ہیں۔ آپ مجھے ان کا پتا بتا دیں کہ وہ کہاں رہتے ہیں۔ آپ کی بڑی کرپا ہو گی"

پجاری کہنے لگا۔

"یہ میں آپ کو کل پتہ کر کے بتا دوں گا۔ جو آدمی اس کے ساتھ آتا ہے میں اسے جانتا ہوں۔ وہ اسی ساونت کالونی کا ہی رہنے والا ہے"

رات میں نے کوٹھڑی میں بسر کی۔ دوسرے دن دوپہر کے بعد پجاری میری کوٹھڑی میں آیا اور کہنے لگا۔

"آپ کے ویر جی صوبیدار درگاداس کل تک اسی کالونی میں تھے مگر آج صبح وہ یہاں سے چلے گئے ہیں۔"

میں سب سے پہلے یہ جاننا چاہتا تھا کہ پجاری اسی شخص کی بات کر رہا ہے جس کی

مجھے تلاش تھی یا وہ کوئی اور آدمی ہے۔ جب میں نے تصدیق کرنی چاہی تو پجاری نے کہا۔

"ہاں جی! میں آپ کے ویر جی کی ہی بات کر رہا ہوں۔ وہ صوبیدار تھا ڈوگرہ رجمنٹ میں۔ اس کا نام درگاداس ہے۔ وہ پہلے بھی فوج سے ریٹائر ہوا تھا۔ پھر اسے دوبارہ فوج میں رکھ لیا گیا اور کشمیر بھیج دیا۔ وہاں اسے کاندھے پر گولی لگی تھی۔ اس نے بہت سے اتنک وادی کشمیریوں کو مارا ہے۔ وہ تو بڑا مشہور فوجی ہے۔ کشمیری تو اسے مسلمانوں کا قصائی کہتے تھے مگر وہ تو امرتسر کا رہنے والا ہے اور آپ کہتے ہیں کہ میں ماتا شیراں والی کے شہر کا ہوں"

پجاری نے ٹھیک آدمی پہچانا تھا۔ وہ صوبیدار درگاداس کی ہی بات کر رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"اصل میں ہم امرتسر کے ہی رہنے والے ہیں مگر میں نے کانگڑہ میں جا کر منیاری کی دکان کر لی تھی۔ یہ بتائیں کہ ہمارے ویر جی کہاں چلے گئے ہیں؟"

پجاری بولا۔

"جس آدمی کی میں نے یہ ساری باتیں معلوم کرنے کی ڈیوٹی لگائی تھی اس کا کہنا ہے کہ صوبیدار درگاداس بہت ڈرا ہوا ہے۔ دو تین باڈی گارڈ ہر وقت اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔ یہاں کلکتے میں کسی جگہ درگاداس نے تھوڑی سی زمین کبھی خریدی تھی۔ ہو سکتا ہے وہ وہیں چلا گیا ہو۔"

میں نے پجاری کو جیب سے پچاس روپے نکال کر دیئے اور کہا۔

"مہاراج! اگر آپ مجھے پتہ کرا دیں کہ میرا بھائی کہاں پر ہے اور اس کی زمین یہاں کس جگہ پر ہے تو میں آپ کا بڑا ابھاری ہوں گا"

پجاری نے روپے فوراً اپنی صدری کی جیب میں رکھ لئے اور بولا۔

"آپ چنتا نہ کریں۔ بس مجھے ایک دن کی مہلت اور دو۔ میں سب کچھ معلوم کر کے بتاؤں گا۔"

وہ رات بھی میں نے مندر میں ہی گزار دی۔ اس سے اگلے روز رات کو پجاری

میری کوٹھڑی میں آیا۔ وہ خوش نظر آ رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"مہاراج! آپ کے ویری جی کا پورا پتہ چل گیا ہے۔"

اس پجاری کے بیان کے مطابق صوبیدار درگاداس نے کلکتہ کے جنوب میں واقع چائے کے ایک چھوٹے سے باغ میں اپنا حصہ ڈالا ہوا تھا۔ مگر وہ وہاں رہتا نہیں تھا۔ چائے کے باغ کے پیچھے کاکس بازار کو جانے والی سڑک کے کنارے ریٹائرڈ فوجیوں کی فلاح و بہبود کا ایک ادارہ تھا۔ یہ سرکاری ادارہ تھا۔ صوبیدار درگاداس اسی ادارے کے آفس میں ملازم ہو گیا ہوا تھا۔ اسی مکان میں وہ اکیلا رہ رہا تھا۔ رات کو تین باڈی گارڈ مکان کے اردگرد پہرہ دیتے تھے۔ دن کو یہی باڈی گارڈ اسے اپنی حفاظت میں لے کر ایک بس میں سوار ہوتے اور فوجی دفتر تک لاتے تھے۔ پھر جب دفتر سے چھٹی ہوتی تھی تو صوبیدار درگا داس کو اپنی حفاظت میں واپس بس میں سوار کروا کر گھر لے آتے تھے۔

اب میرا اس پجاری کے پاس کوئی کام نہیں تھا۔ میں اسی روز واپس اپنے کلکتے کے جاسوس مجاہد کے پاس اس کے دریائے ہگلی والے کوارٹر میں پہنچ گیا۔ رات کو اپنا جاسوس مجاہد شاہ دین آیا تو میں نے اسے ساری بات سنائی۔ وہ بولا۔

"ہاں دھرم چالی میں ایک فوجی فاؤنڈیشن کا بہت بڑا آفس ہے۔ میں نے دیکھا ہوا ہے مگر وہاں آنے جانے کی بڑی پابندی ہے۔ جنگ کے بعد تو یہ پابندی زیادہ سخت ہو گئی ہے۔"

میں نے کہا۔

"سب سے پہلے تو میں خود وہاں جا کر یہ تصدیق کرنا چاہتا ہوں کہ جس آدمی کی مجھے تلاش ہے یہ وہی آدمی ہے۔ اس کے بعد صورت حال کا جائزہ لے کر سوچوں گا کہ مجھے اس دشمن اسلام کو کس طریقے سے موت کے گھاٹ اتارنا ہو گا۔"

شاہ دین بولا۔

"میں تمہارے ساتھ دھرم چالی نہیں جا سکتا مگر میں تمہیں اس کا سارا حدود اربعہ سمجھا دوں گا۔"

میں کلکتے میں رہا ضرور تھا لیکن اس علاقے کی طرف کبھی میرا جانا نہیں ہوا تھا۔ یسے بھی کلکتہ اتنا بڑا شہر ہے کہ آدمی دو ایک بار یہاں رہنے سے سارا شہر نہیں دیکھ سکتا۔

ہ دین کے بتانے کے مطابق میں دھرم چالی کی کالونی میں پہنچ گیا۔ میں نے بھارت کے ابق فوجیوں کی فاؤنڈیشن کی عمارت کا بھی جائزہ لیا۔ جیسا کہ مجھے بتایا گیا تھا میرا ٹارگٹ کشمیری مسلمانوں کا قاتل صوبیدار درگاداس اسی دفتر میں کام کرتا تھا اور وہ اپنے تین ی گارڈز کے ساتھ آفس آتا تھا۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا تھا کہ وہ اپنے مکان سے بس میں ر ہو کر دفتر آتا ہے اور اس کے باڈی گارڈ اس کے اردگرد ہوتے ہیں۔ میں نے دیکھا فاؤنڈیشن کے گیٹ سے تھوڑے فاصلے پر بس سٹاپ تھا۔ اس وقت صبح کے آٹھ ڑھے آٹھ کا وقت تھا۔ میں اسی لئے آفس کے ٹائم پر وہاں گیا تھا تاکہ اگر درگا داس فاؤنڈیشن میں کام کرتا ہے تو اسے دفتر آتے ہوئے دیکھ سکوں میں بس سٹاپ سے چند موں کے فاصلے پر ایک درخت کے نیچے ایک کٹے ہوئے درخت پر بیٹھ گیا۔

آفس ٹائم ہو چکا تھا۔ مگر یہ کوئی اتنا بڑا آفس بھی نہیں تھا کہ اس کے کام کرنے والوں تعداد زیادہ ہو۔ ایک بس آ کر کھڑی ہوئی۔ اس میں سے دبلے پتلے سانولے رنگ کے الی بابو چھتریاں ہاتھوں میں لئے نکلے اور فوجی فاؤنڈیشن کے گیٹ کی طرف چل پڑے۔ ایک ایک آدمی کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ پندرہ سولہ مسافر بس سے اترے تھے۔ میں صوبیدار درگاداس نہیں تھا۔ اس کے پندرہ منٹ بعد ایک اور بس آ کر سٹاپ پر ی۔

اس میں سے پہلے دو بنگالی عورتیں اور دو بنگالی کلرک قسم کے آدمی اترے۔ اس بعد دو ذرا تنومند جسم والے آدمی اترے اور اترتے ہی انہوں نے دائیں بائیں ھا۔ پھر ایسے کھڑے ہو گئے جیسے ماحول پر کڑی نظر رکھے ہوئے ہوں۔ میں اٹھ کھڑا ا۔ اس کے بعد بس میں سے وہ آدمی باہر نکلا جس کی مجھے تلاش سری نگر سے کھینچ کر لائی تھی اور جو میرا ٹارگٹ تھا۔ میں نے اسے فوراً پہچان لیا۔ اگرچہ اس کی مونچھیں بس تھیں اور اس نے بنگالیوں والا لباس یعنی دھوتی کرتہ پہن رکھا تھا مگر اس کی شکل ہو

بھو اس تصویر سے ملتی تھی جو مجھے دکھائی گئی تھی۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک اور آدمی اس کے پیچھے پیچھے یوں چلنے لگا جیسے پیچھے سے اس کی حفاظت کر رہا ہو۔ اس دوران والے باڈی گارڈ بھی اس کے دائیں بائیں اسے اپنی حفاظت میں لے کر فاؤنڈیشن کے کی طرف چل پڑے تھے۔ وہ تین باڈی گارڈ تھے اور ان کے درمیان بنگالی حلیے میں والا آدمی سینکڑوں معصوم کشمیری عورتوں بچوں بوڑھوں کا قاتل صوبیدار درگاداس تھا۔

میں اپنی جگہ پر کھڑا اسے جاتے دیکھتا رہا۔ اب میں اسے قریب سے بھی دیکھنا چاہتا مگر اتنا وقت نہ ملا۔ درگاداس اپنے باڈی گارڈز کی حفاظت میں فوجی فاؤنڈیشن کے گیٹ داخل ہو چکا تھا۔ میں وہاں سے ہٹ کر ایک ناریل پانی بیچنے والے کی ریڑھی کے آگیا۔ اس سے ایک ناریل یا دھاب لی اور وہیں کھڑے کھڑے پینے لگا۔ میں نے ریڑھی والے بنگالی سے کلکتے کی اردو زبان میں پوچھا کہ دفتر میں چھٹی کس وقت ہوتی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ چھٹی چار ساڑھے چار بجے ہوتی ہے۔ سارا دن پڑا تھا۔ میں وہاں اتنی دیر نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ چنانچہ وہاں سے واپس چل پڑا۔ واپس اپنے مجاہد شاہ دین کے کوارٹر جانے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اس علاقے میں یا کسی قریبی علاقے میں دن کا باقی وقت گزارتا ہوں۔ چار بجے کے قریب یہاں دوبارہ آجاؤں گا اور بس سٹاپ پر کھڑا ہو کر صوبیدار درگاداس کو قریب سے دیکھوں گا۔

میں سب سے پہلے دھرم چالی کی کالونی میں آیا۔ یہ درمیانے درجے کی آبادی تھی۔ کوارٹر بھی تھے۔ پرانی کوٹھیاں بھی تھیں۔ ایک مارکیٹ بھی تھی۔ ایک مسئلہ میرے سامنے بھی تھا کہ مجھے لوگوں کی نظروں سے اپنے آپ کو چھپانا تھا۔ یا کم از کم زیادہ لوگوں کے سامنے نہیں جانا تھا۔ کیونکہ جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں بھارت کے تقریباً ہر بڑے اور شہر میں میں کمانڈو ایکشن سے فوجی تنصیبات کو زبردست نقصان پہنچا چکا تھا اور وسطی یعنی گوالیار اور پانڈی چری کے سول تھانوں اور ملٹری پولیس کے پاس میری تصویر بھی اور ایک دو بار میری تصویر مفرور پاکستانی جاسوس کے الزام کے ساتھ جالندھر اور ہوشنگ آباد کے اخباروں میں چھپ بھی چکی تھی۔ چنانچہ مجھے بھارت کے کسی بھی شہر

سر عام چلتے ہوئے بڑی احتیاط کرنی پڑتی تھی۔ اگرچہ میرا حلیہ کافی بدلا ہوا تھا مگر میرا ناک نقشہ وہی تھا۔ میں نے اپنے چہرے کی کوئی پلاسٹک سرجری نہیں کروائی ہوئی تھی۔ خفیہ پولیس کے آدمیوں کی تیز نگاہیں مجھے پہچان سکتی تھیں۔

چنانچہ میں نے دھرم چالی کالونی کی مارکیٹ کی طرف جانے سے گریز کیا اور کچھ فاصلے پر تین چار ماڈرن عمارتیں نظر پڑیں تو میں اس طرف چل دیا کہ یہاں کوئی ماڈرن قسم کا ریستوران ضرور ہو گا۔ وہاں کچھ دیر بیٹھ کر وقت گزار لوں گا۔ ماڈرن ریستورانوں میں زیادہ لوگ نہیں ہوتے اور وہاں روشنیاں بھی دھیمی ہوتی ہیں۔ یہ جدید عمارتیں کلکتے کے شمال مشرقی علاقے میں واقع سبھاش چندر بوس نگر کی تھیں۔ یہ ماڈرن کالونی آزادی ملنے کے بعد بنائی گئی تھی۔ کشادہ سڑکیں تھیں۔ درمیان میں خم دار کھمبوں پر نیون لائیٹ کی ٹیوبیں لگی تھیں۔ گرین بیلٹ پر پھولوں کی کیاریاں تھیں۔ ایک بہت بڑا سینما ہاؤس بھی تھا جہاں بنگلہ فلم کے بورڈ لگے ہوئے تھے۔ سڑک پر دو رویہ گاڑیاں آجا رہی تھیں۔ بلڈنگوں کے درمیان کشادہ جگہ چھوڑ دی گئی تھی جہاں ماڈرن بنگلے بنے ہوئے تھے۔ ان بنگلوں میں کثرت سے ناریل پام اور کیلے کے درخت اگے ہوئے تھے۔ آگے فٹ پاتھ تھا۔ میں فٹ پاتھ پر چلتا گیا۔ میری بائیں جانب بڑی ماڈرن دکانیں تھیں۔ ایک جگہ ایک ریستوران نظر آیا تو میں اس کے اندر چلا گیا۔ یہ کافی شاپ تھی۔ میں کافی منگوا کر خاموشی سے کونے میں بیٹھ گیا۔ حلیہ میرا یہ تھا کہ ڈاڑھی مونچھیں بڑھی ہوئی تھیں۔ ماتھے پر تلک لگا تھا۔ لباس میرا ضرور ماڈرن تھا۔ یعنی میں نے سرمئی مٹیالے رنگ کی جیکٹ اور گہرے کلر کی پتلون پہنی ہوئی تھی۔ شکل صورت سے میں بھارت کا کوئی ماڈرن جوگی سنیاسی یا جوتشی لگتا تھا۔ اس قسم کے لوگ بھارت کے بڑے شہروں میں عام نظر آجاتے ہیں۔

ریستوران میں میرے علاوہ چھ سات گاہک ہی بیٹھے تھے۔ ان میں ایک بنگالی فیملی بھی تھی۔ ایک پختہ عمر کی بنگالی عورت تھی اور اس کی عمر کا ایک آدمی جو اس کا خاوند لگتا تھا اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ دونوں خاموشی سے کافی پی رہے تھے۔ عورت نے ایک دو بار میری طرف دیکھا تھا۔ پھر اس نے اپنے خاوند سے کوئی بات کی تھی۔ اس کے بعد اس کے

خاوند نے بھی مجھے نظر بھر کر دیکھا تھا۔ یہ لوگ مجھے کسی طرح بھی خفیہ پولیس کے آ
نہیں لگ رہے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ میرے جوگی جوتشیوں والے حلیے کی وجہ
میری طرف دیکھ رہے ہیں۔ میں سگریٹ سلگا رہا تھا کہ ادھیڑ عمر کا بنگالی اٹھ کر میرے
آیا اور بڑی عاجزی اور ادب کے ساتھ ہاتھ جوڑ کر مجھے نمسکار کیا۔ میں نے بھی ہاتھ
کر نمسکار کیا۔ اس نے بنگلہ زبان میں کچھ کہا جس سے میں یہی معنی اخذ کر سکا کہ وہ
اپنی میز پر آنے کی دعوت دے رہا ہے۔ میں نے مسکراتے ہوئے کلکتے کی اردو زبان
کہا۔

"میں بنگلہ زبان زیادہ نہیں جانتا"

میں ایک بار پھر یاد دلانا چاہتا ہوں کہ میں جس شکستہ اردو میں بھارت کے مخ
شہروں میں دوسرے صوبوں کے آدمیوں سے گفتگو کرتا تھا میں یہاں وہ زبان نہیں لکھ
بلکہ اس کا مفہوم صاف اردو میں لکھ دیتا ہوں تا کہ آپ بخوبی سمجھ جائیں۔ اس بنگالی
ویسے ہی ہاتھ جوڑے ہوئے تھے۔ عاجزی کے ساتھ وہ بنگلہ اردو میں کہنے لگا۔

"میری اور میری بیوی کی زبردست خواہش ہے کہ آپ ہمارے ساتھ بیٹھ کر کافی
ایک پیالی پئیں۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔"

مجھے بھی وہاں کچھ وقت گزارنا تھا اور یہ بے ضرر قسم کے لوگ تھے۔ میں اٹھ کر
کی میز پر جا بیٹھا۔ بنگالی نے اپنا اور اپنی بیوی کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"میرا نام پنکج کمار ہے۔ یہ میری دھرم پتنی سروجنی کمار ہے۔ میں ریٹائرڈ انج
ہوں۔ ہمارا مکان دھرم چالی میں ہے۔"

وہ اپنی ادھیڑ عمر بنگالی بیوی کی طرف بھی دیکھ لیتا تھا۔ اس کی بیوی بڑی عقیدت
مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے ان سے پوچھا۔

"کہیں ایسی بات تو نہیں ہے کہ آپ نے مجھے کسی اور آدمی کے شبے میں اپنے
بلا لیا ہے؟"

پنکج کمار نے کہا۔

"نہیں نہیں بیٹا۔ ایسی بات نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ آپ کی صورت میں ہمیں
بھگوان کی صورت نظر آئی تھی۔ میری پتنی نے کہا کہ اس رشی جی کو ضرور بلاؤ۔ ہم رشی
جی کے درشن کریں گے۔ بس میں نے گستاخی کر کے آپ کو یہاں بلا لیا۔ اگر آپ کو برا لگا
ہو تو ہمیں شما کر دیجئے گا۔"

میں نے کہا۔

"نہیں نہیں پنکج بابو ایسی بات نہیں ہے۔ مجھے آپ سے مل کر خوشی ہوئی ہے۔"

اتنا میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ اپنے کسی گھریلو مسئلے کے بارے میں پوچھنا چاہتے
ہیں۔ بھارت میں یہ وبا بڑی عام ہے۔ جہاں کسی محلے یا ہوٹل میں کوئی میرے ایسے حلیے
والا آدمی نظر پڑے لوگ فوراً اس سے اپنے گھریلو مسئلے بیان کرنا شروع کر دیتے ہیں۔
عورتیں تو خاص طور پر اس معاملے میں انتہائی ضعیف الاعتقاد ہیں۔ مجھے ان لوگوں سے
کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں صرف دن کے چار بجانا چاہتا تھا۔

میں نے محسوس کیا کہ بنگالی عورت اپنے خاوند کو اشاروں میں مجھ سے کچھ
پوچھنے کے لئے کہہ رہی تھی۔ میں بظاہر بے نیازی سے بیٹھا سگریٹ پیتا رہا۔ انہوں نے
میرے لئے مزید کافی اور رس گلے منگوا لئے تھے۔

آخر پنکج بابو سے نہ رہا گیا۔ اس نے بڑی جھجک کے ساتھ کہا۔

"مہاراج! آپ شکل سے مہان رشی لگتے ہیں۔ آپ کو جوتش کا گیان بھی ضرور ہو
گا"

میرا اندازہ درست نکلا تھا۔ ان کا کوئی گھریلو مسئلہ تھا جس کی وجہ سے وہ پریشان تھے
اور مجھ سے علم جوتش کے ذریعے اس کا حل پوچھنا چاہتے تھے۔ میں نے ان کا دل رکھنے
کے لئے کہہ دیا۔

"جوتش کا پورا گیان تو نہیں ہے۔ مگر کچھ کچھ جاننا ضرور ہوں۔ کیا آپ کی کوئی پرابلم
ہے؟"

بنگالی پنکج بابو کی بیوی خاموش تھی اور اس کا کام مجھے عقیدت بھری نظروں سے دیکھنا

تھا۔ پنکج بابو نے میری پیالی میں کافی بناتے ہوئے بڑی سنجیدہ اور دھیمی آواز میں کہا۔

"مہاراج! ہماری ایک ہی بیٹی ہے۔ اوما کماری اس کا نام ہے۔ اس نے باٹنی میں ایس سی کیا ہوا ہے۔ وہ کالج میں لیکچرار ہے۔"

وہ چپ ہو گیا۔ میں نے پوچھا۔

"تو پھر آپ کو پرابلم کیا ہے؟"

پنکج بابو رس گلوں کی پلیٹ میرے آگے کھسکاتے ہوئے بولا۔

"مہاراج! پرابلم یہ ہے کہ ہماری اکلوتی بیٹی اوما کماری کو پچھلے ایک ماہ سے ا بیماری لگ گئی ہے۔ اس کو آدھے سر کی درد کا دورہ پڑتا ہے اور وہ دو دو دن تک ب ہوش پڑی رہتی ہے۔ ہم نے کلکتے کے سارے ڈاکٹروں کو دکھایا ہے مگر اس کی بیمار ٹھیک نہیں ہوئی۔ رات بھی اسے دورہ پڑا تھا اور وہ رات سے بے ہوش پڑی ہے۔ ت ڈاکٹر آکر اسے انجکشن لگا چکے ہیں مگر اوما بیٹی کو ہوش نہیں آیا۔ ایک بار ہوش آیا بھی تو درد کی شدت سے وہ چیخنے لگی اور پھر بے ہوش ہو گئی۔ ہم یہاں میڈیکل سٹور سے ا کے لئے دوائی لینے آئے تھے۔ سٹور بند تھا یہاں کافی پینے بیٹھ گئے۔ آپ کو دیکھا تو میر پتنی نے کہا کہ یہ رشی بڑے مہان لگتے ہیں ان سے بیٹی کا علاج پوچھو۔ بس مہاراج ہماری پرابلم ہے۔ آپ جوتش کے گیان سے پتہ کریں کہ ہماری بیٹی کی بیماری کب دور گی۔ ہمیں اس کی شادی بھی کرنی ہے۔ ہم بڑے پریشان ہیں مہاراج۔"

غم زدہ بنگالی باپ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے دیکھا کہ اس کی پتنی سرو کماری کی آنکھوں میں بھی آنسو تیرنے لگے تھے۔ مجھے جوتش وغیرہ کا خاک بھی علم نہیں تھ میں محض وقت گزارنا چاہتا تھا۔ البتہ دل میں اللہ کے حضور دعا ضرور مانگی تھی کہ ا پاک پروردگار اس غم زدہ ماں باپ کی بچی کو صحت عطا کر دے۔ میں نے یونہی کہہ دیا۔

"یہ تو لڑکی کا ہاتھ دیکھ کر ہی کچھ کہا جا سکتا ہے۔"

میرا خیال تھا کہ ابھی دن کے ساڑھے نو بجے کا وقت ہے۔ باقی کا وقت ان لوگوں گھر میں بیٹھ کر گزار دوں گا اس طرح سے لوگوں کی نگاہوں میں بھی نہیں آؤں گا اور ا

کا مکان بھی دھرم چالی کی کالونی میں ہی تھا جہاں سے میرا ٹارگٹ یعنی درگا داس کا دفتر قریب ہی تھا۔ میں وہاں سے تین ساڑھے تین بجے کے قریب اٹھ کر فوجی فاؤنڈیشن کے بس شاپ پر جا کر صوبیدار درگا داس کی واپسی کا انتظار کر سکتا تھا اور اسے اچھی طرح سے دیکھ بھی سکتا تھا۔ اگرچہ میں نے اسی روز اسے ہلاک کرنے کا پروگرام نہیں بنایا تھا مگر زہریلی بال پوائنٹ پنسل میری جیکٹ کی جیب میں موجود تھی اور میں نے سوچ رکھا تھا کہ اگر یہ شخص کشمیری مسلمانوں کا قاتل صوبیدار درگا داس ہی نکلا اور مجھے موقع بھی مل گیا تو میں آج ہی اس کا کام تمام کر دوں گا۔

پنکج بابو نے خوش ہو کر ہاتھ جوڑ دیئے اور بولا۔

"مہاراج! ہمارے دھن بھاگ کہ آپ ہمارے گھر چل کر بچی کا ہاتھ دیکھیں گے۔"

اس نے اپنی بیوی سے کہا۔

"سروجنی جی! تم جا کر دوائی لے آؤ۔ میڈیکل سٹور کھل گیا ہو گا۔"

اس کی بیوی بھی میرے جواب سے بڑی خوش ہوئی تھی۔ فوراً اٹھی اور ریستوران سے نکل گئی۔ اس کے جانے کے بعد پنکج بابو مجھ سے اپنی بیمار بیٹی اوما کماری کے بارے میں باتیں کرنے لگا۔ مجھے اس کی باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کی بیٹی کی صحت ضرور چاہتا تھا اور اس کے لئے میں نے خدا کے حضور بڑے سچے دل کے ساتھ دعا کر دی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اولاد جگر کا ٹکڑا ہوتی ہے۔ خدا کسی کو اولاد کا دکھ نہ دکھائے۔ اولاد خواہ سکھ کی ہو' خواہ ہندو کی ہو خواہ کسی دوسرے مذہب کے ماننے والے کی ہو۔ خدا اسے اپنے ماں باپ کی آنکھوں کے سامنے سلامت رکھے۔

تھوڑی دیر میں پنکج بابو کی بنگالی بیوی دوائی لے کر آ گئی۔ ہم ریستوران سے نکل آئے۔ میں نے گہری نگاہوں سے اردگرد کا جائزہ لیا۔ مجھے وہاں کوئی خطرے والی بات نظر نہ آئی۔ اتنی دیر میں پنکج بابو نے ایک خالی ٹیکسی رکوا لی تھی۔ ہم ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ ٹیکسی مختلف سڑکوں پر سے گزرتی ہوئی دھرم چالی کالونی میں داخل ہو گئی۔ ٹیکسی ایک منزلہ مکان کے آگے چھوٹی سی ویران سڑک پر رک گئی۔ مکان کے برآمدے پر

کھپریلوں کی ڈھلواں چھت پڑی تھی۔ سامنے چھوٹی سی جگہ تھی جہاں کیلے اور ناریل
دو چار درخت کھڑے تھے۔ مکان کی دیواریں کلکتے کی بارشوں اور دھوپ کی مار کھا کھا کر
کالی ہو رہی تھیں۔ ایک بوڑھے بنگالی نوکر نے جو برآمدے میں بیٹھا ناریل پی رہا تھا جلد
سے اٹھ کر برآمدے والے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ ہم اندر داخل ہو گئے۔ چھوٹا سا
کمرہ تھا۔ کونے میں مسہری والا پلنگ لگا تھا۔ دیواروں پر مہاتما گاندھی' پنڈت نہرو' سبھاش
چندر بوس اور درگا دیوی کی فریم کی ہوئی تصویریں لگی تھیں۔ کارنس پر پھولوں کا باسی
پڑا تھا۔ چھت کا پنکھا آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ پلنگ پر ایک لڑکی بے ہوش پڑی تھی۔ پلنگ
کے پاس ہی کرسی پر ایک بوڑھی بنگالی عورت چپ چاپ بیٹھی تھی۔ میرے لئے فوراً پلنگ
کے پاس کرسی ڈال دی گئی۔

پلنگ کی مسہری یا مچھر دانی جو کچھ بھی وہ تھی اٹھی ہوئی تھی۔ ایک طرف کھڑکی
تھی آگے سفید پردہ ہٹا ہوا تھا۔ اس میں سے دن کی روشنی اندر آ رہی تھی۔ میں نے لڑکی
کو دیکھا۔ لڑکی عام بنگالی لڑکیوں کی طرح دبلی پتلی تھی مگر اس کا رنگ کھلتا ہوا تھا۔ ماتھے
بندیا لگی تھی۔ اس کے آدھے جسم پر سفید چادر تھی۔ اس نے ہلکے کاسنی رنگ کی ساڑھی
پہن رکھی تھی اور بلاؤز کا رنگ گہرا کاسنی تھا۔ ناک نقشہ اچھا تھا۔ آنکھیں بند تھیں
چہرے سے ذہانت ٹپکتی تھی۔ کرسی کھینچ کر اس کا باپ بھی میرے پاس ہی بیٹھ گیا تھا۔ اپنی
بیٹی کو دیکھتے ہوئے غم زدہ آواز میں کہنے لگا۔

"ہے بھگوان! میری بچی کو اچھا کر دے۔"

اس کی بیوی ذرا پیچھے دوسری چارپائی پر سر جھکائے بیٹھی تھی۔ میں نے دل میں اللہ
تعالیٰ سے معافی مانگتے ہوئے کہا۔

"یا اللہ! تو جانتا ہے کہ مجھے ان لوگوں سے کوئی لالچ نہیں ہے۔ یہ لوگ اس خیال
سے مجھے یہاں لے آئے ہیں کہ میں ان کی بیٹی کا علاج کر دوں گا۔ میں نہ تو کوئی ڈاکٹر
ہوں نہ مجھے جوتش کا علم آتا ہے۔ میری یہ دعا ضرور ہے کہ اے پاک پروردگار اس
کے گناہ معاف فرما دے اور اسے اچھا کر دے۔"

اس دوران لڑکی کے باپ نے چادر کے نیچے سے اس کا ایک ہاتھ نکال کر آگے کر دیا
اور بولا۔

"مہاراج! دیکھیں۔ آپ کو بھگوان نے بڑا گیان دیا ہوا ہے۔ بھگوان کے واسطے میری
بچی کی ریکھائیں دیکھ کر اس کی بیماری کا کوئی اپائے بتا دیں۔ میری بچی کو اچھا کر دیں۔"

اس غم زدہ بنگالی باپ نے مجھے خواہ مخواہ امتحان میں ڈال دیا تھا۔ میں لڑکی کی ہتھیلی کی
لکیریں دیکھ رہا تھا اور مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ ان لکیروں کا کیا مطلب نکل سکتا ہے۔
غم نصیب ماں اور باپ کا دل بھی نہیں توڑنا چاہتا تھا۔ جھوٹ بھی نہیں بول سکتا تھا۔ ماضی
کے عہد میں روشن بزرگ کے سامنے میں عہد کر چکا تھا کہ زندگی میں کبھی جھوٹ نہیں
بولوں گا اور میرا ہر فعل اللہ کی خوشنودی کے لئے ہو گا۔

جب میں لڑکی کی ہتھیلی کی لکیریں دیکھ رہا تھا تو میں نے کنکھیوں سے دیکھا کہ بے
ہوش لڑکی کا باپ' اس کی ماں میری طرف انتہائی رحم طلب نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔
جیسے انہیں یقین ہو کہ میرے پاس ان کی بیمار بیٹی کا علاج موجود ہے۔ میں نے ہاتھ کی
لکیریں دیکھ کر کہہ دیا۔

"اس کی ریکھائیں بتا رہی ہیں کہ یہ جلد اچھی ہو جائے گی۔ آپ ڈاکٹروں کا علاج
جاری رکھیں۔"

بچی کے باپ اور ماں کے چہرے پر اداسی سی چھا گئی۔ ان کو یقین تھا کہ میں لڑکی کا
ہندو جوتشیوں کی طرح الٹی سیدھی لکیریں ڈال کر زائچہ بنا دوں گا اور پھر کافی دیر کی سوچ
بچار کے بعد انہیں لڑکی کا حال اور اس کی بیماری کا کوئی علاج بتاؤں گا۔

میں نے دیوار پر لگے کلاک کی طرف دیکھا۔ ابھی چار بجنے میں بہت وقت تھا۔ میں
مزید کچھ وقت گزارنے کے لئے ان سے لڑکی کی بیماری کے بارے میں ادھر ادھر کی باتیں
کرتا رہا۔ مگر میں نے دیکھا کہ لڑکی کے ماں باپ کے چہروں پر چھائی ہوئی افسردگی بڑھتی جا
رہی تھی۔ اس دوران لڑکی کی ماں نے دو تین بار اپنی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو
ساڑھی کے پلو سے پونچھے۔ میرے دل پر اس عورت کی غم نصیب مامتا کا بڑا اثر ہوا۔ مگر

میں ان کے لئے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ بس دل میں دعا کرتا رہا کہ اے رب العالمین
سب جہانوں کا پالنے والا ہے۔ تو بے شک وشبہ قادر مطلق ہے۔ اس بچی کو شفا عطا
دے۔

اس چھوٹے سے کمرے میں بڑی غم ناک اداسی چھائی ہوئی تھی۔ لڑکی کا باپ
طرف ہاتھ جوڑے سر جھکائے بیٹھا تھا۔ لڑکی کا ہاتھ اس نے میری طرف سے مایوس ہ
چادر کے اندر کر دیا تھا۔ ذرا پیچھے لڑکی کی بنگالی ماں بھی سر جھکائے سوگوار بیٹھی
بوڑھی بنگالن جو غالباً نوکرانی تھی چٹائی پر خاموش بیٹھی تھی۔ کمرے کی فضا میں
خاموشی کے ساتھ ایسی ہلکی ہلکی خوشبو پھیلی ہوئی تھی جیسے صبح کے وقت کسی نے
کمرے میں قنوج کی تیز خوشبو والی اگر بتیاں سلگائی ہوں۔ ان اگربتیوں کی خوشبو ابھی
فضا میں موجود تھی۔ میں نے گہرا سانس لیا تو مجھے فضا میں ایک اور خوشبو بھی محسو
ہوئی۔ میری چھٹی حس ایک دم بیدار ہو گئی۔ میرا خیال فوراً چندریکا کی بدروح کی ط
چلا گیا کہ کہیں یہ اس کی بو تو نہیں؟ کہیں وہ پھر مجھ پر حملہ کرنے کے لئے تو نہیں آ
لیکن یہ وہ خوشبو نہیں تھی۔ اس کی بدروح جب آتی تھی تو لوبان کی بو آنے لگتی تھی۔
کوئی خوشبو تھی۔ پھر میرا خیال اپنی شہید بہن کی طرف چلا گیا۔ کہیں اس کی روح تو نہ
آگئی۔ میری شہید بہن کی روح جب کبھی آتی تھی تو اس کے آنے سے چنبیلی کے پھول
کی مہک پھیل جاتی تھی۔ یہ چنبیلی کے پھولوں کی بھی خوشبو نہیں تھی۔ یہ کوئی اور
خوشبو تھی۔ بڑی کلاسیکل، قدیم اور گہری مگر انتہائی لطیف۔ پھر اچانک مجھے کسی لڑکی
جانی پہچانی آواز آئی۔ اس نے مجھے میرا نام لے کر بلایا تھا۔ میں نے چونک کر بے ہ
لڑکی کی طرف دیکھا کہ کہیں اسے ہوش تو نہیں آگیا۔ مگر اسے میرا نام کیسے معلوم ہوا؟

جیسے ہی میری نظریں اوپر اٹھیں میں نے بے ہوش لڑکی کے پلنگ کے پاس سرہا
کی طرف ماضی کے زمانے میں مجھے گائیڈ کرنے والی لڑکی سوسن کو دیکھا کہ اس کا د
پرانے زمانے والا سیاہ لباس ہے جو آج سے پانچ ہزار سال پہلے وادی بابل میں مقیم سمیر
قوم کی کنواری لڑکیاں پہنا کرتی تھیں۔ اس کے سیاہ بالوں میں اسی طرح سوسن کے

سجے ہوئے تھے۔ اس کے پرکشش نقوش والے سانولے چہرے پر معصوم مسکراہٹ
میں نے فوراً بنگالی بابو اور اس کی بیوی کی طرف دیکھا کہ ان لوگوں نے تو سوسن کو
یں دیکھا۔ سوسن بالکل ویسی ہی تھی جیسے میں اسے ماضی کے زمانے میں چھوڑ کر آیا تھا۔
ن نے اپنی سمیری زبان میں کہا۔

"ان لوگوں کی طرف سے بے فکر رہو۔ یہ نہ مجھے دیکھ سکتے ہیں نہ میری آواز سن
سکتے ہیں تم بھی اپنی آواز میں مجھ سے بات نہ کرنا۔ جو کہنا چاہو اپنے دل میں کہہ لینا میں
سن لوں گی۔"

میں نے کہا۔

"سوسن بہن! تم کیسے آگئیں؟ خیریت تو ہے؟"

یہ جملہ میں نے اپنے دل میں کہا تھا۔ سوسن تک میرا جملہ پہنچ گیا تھا۔ اس نے اپنی
آواز میں اور قدیم سمیری زبان میں کہا۔

"میں تمہیں صرف یہ بتانے آئی ہوں کہ تمہارے دل میں انسانی ہمدردی، خاص طور
اولاد سے ماں باپ کی محبت کا جو جذبہ بیدار ہوا ہے قدرت نے اسے پسند کیا ہے۔ اور
تمہیں یہ خوش خبری سنانے آئی ہوں کہ تمہاری وجہ سے اس لڑکی کی بیماری ہمیشہ کے
لئے ختم ہو جائے گی۔ یہ سب کچھ قدرت خداوندی کی مرضی سے ہو گا لیکن اس کا وسیلہ
تم بنو گے۔"

میں دل میں بڑا خوش ہوا۔ میں نے کہا۔

"سوسن بہن! جلدی سے بتاؤ قدرت خداوندی کی طرف سے یہ لڑکی کیسے اچھی ہو گی
ور اس کے غم نصیب ماں باپ کی خوشیاں کیسے واپس لوٹیں گی؟"

سوسن کہنے لگی۔

"تم اپنی جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالو گے تو تمہیں وہاں ایک پڑیا ملے گی۔ اس پڑیا
سوسن کا ایک خشک پھول ہو گا۔ یہ پھول بے ہوش لڑکی کو سنگھاؤ وہ ہوش میں آجائے
ں اور پھر کبھی اس کے سر میں درد نہیں ہو گی۔ خدا کی طرف سے اسے شفا مل جائے

گی۔"

میں نے کہا۔

"سوسن بہن! میں تمہارا کس طرح شکریہ ادا کروں؟"

سوسن نے کہا۔

"ہر حال میں صرف اللہ کا شکر ادا کیا کرو۔ کیونکہ بیمار انسان اپنی غلطیوں کی وجہ
ہوتا ہے۔ اپنے گناہوں کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اور شفا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو
ہے۔"

اتنا کہہ کر سوسن میری نظروں سے غائب ہو گئی۔

یہ سب کچھ یوں سمجھ لیں کہ ایک دو سیکنڈ کے اندر اندر ہی ہو گیا تھا۔ میں نے ا
جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا تو وہاں کاغذ کی ایک پڑیا ملی۔ میں نے اسے باہر نکال کر کھولا
اس میں سوسن کا خشک نیلا پھول تھا جو مرجھانے اور خشک ہونے کے بعد سیاہ ہو رہا تھا
مجھے جیب سے پڑیا نکالتے ہوئے لڑکی کا غم زدہ باپ اور ماں بڑی پر اشتیاق نظروں سے
دیکھنے لگے تھے۔ انہوں نے نہ تو سوسن کو دیکھا تھا نہ اس کی باتیں ہی سنی تھیں۔ وہ صرف
مجھے جیکٹ کی جیب سے پڑیا نکال کر اسے کھولتے ہوئے دیکھ رہے تھے اور قدرتی طور پر
یہی سمجھ رہے تھے کہ میں ان کی بیمار زدہ بے ہوش لڑکی کے لئے کوئی خاص دوائی نکال رہا
ہوں۔ میں نے دل میں کہا۔

"یا اللہ! یہ سب کچھ تیری رضا اور تیری مرضی سے اگر ہو رہا ہے تو پھر اس خشک
مردہ پھول میں اثر ڈال دے کہ لڑکی کو ہوش آجائے۔"

میں نے لڑکی کے باپ پنکج بابو سے کہا۔

"ایک آخری کوشش کر کے دیکھتا ہوں۔ یہ خشک پھول مجھے ایک بزرگ نے دیا تھا
وہ مسلمان بزرگ تھا۔ اس پھول کو لڑکی کے ناک کے آگے رکھ کر سنگھاؤ۔ دیکھو۔ پھر
ہوتا ہے۔"

لڑکی کی ماں اور بنگالی نوکرانی بھی اٹھ کر پلنگ کے پاس آگئیں۔ پنکج بابو نے

سمیت خشک پھول میرے ہاتھ سے لے لیا۔ وہ اپنی بیٹی کے چہرے کے قریب گیا اور پڑیا
والے کاغذ پر سے خشک پھول بڑی احتیاط کے اٹھایا اور بے ہوش اوما کماری کے ناک کے
قریب لے جا کر اسے سنگھایا۔ چار پانچ سیکنڈ کے بعد بے ہوش لڑکی نے آنکھیں کھول
دیں۔ غم زدہ ماں باپ کے چہرے خوشی سے چمکنے لگے۔ میں نے سوسن کا خشک پھول پنکج
بابو کے ہاتھ سے لے لیا اور کہا۔

"پنکج بابو! تمہاری لڑکی اچھی ہو گئی ہے"

وہ تو میرے قدموں پر گر پڑا۔ اوما کماری بالکل ہوش میں آچکی تھی۔ اس نے مسکرا
کر اپنی ماں کی طرف دیکھا اور کہا۔

"ماتا جی!"

ماں اس سے لپٹ گئی۔ پھر اس نے اپنے باپ کو پتا جی کہہ کر پکارا۔

"پتا جی! میں بالکل اچھی ہو گئی ہوں میرے سر میں ذرا بھی درد نہیں ہوتا"

گھر کی سوگوار فضا ایک دم مسرتوں کے گہوارے میں جیسے تبدیل ہو گئی۔ ماں باپ اپنی
بیٹی کی بلائیں لے رہے تھے۔ بار بار میرے ہاتھ چوم رہے تھے۔ پنکج بابو نے لڑکی سے
کہا۔

"بیٹی یہ سب کچھ ان رشی مہاراج کی دوا سے ہوا ہے۔ ہے بھگوان!"

میں نے دل میں خداوند کریم کا شکر ادا کیا کہ اس کی نظر کرم سے نہ صرف یہ کہ غم
زدہ گھر کی خوشیاں لوٹ آئی تھیں اور ماں باپ کے سینوں میں ٹھنڈ پڑ گئی تھی بلکہ میری
عزت بھی رہ گئی تھی۔ اب جناب میری وہاں پیر مرشدوں والی آؤ بھگت شروع ہو گئی۔
اوما کماری یعنی پنکج بابو کی اکلوتی بیمار بیٹی صحت مند ہو کر اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ پہلے وہ ہوش
میں آتی تھی تو سر درد کی شدت کی وجہ سے چیخیں مارتی اور دوبارہ بے ہوش ہو جاتی
تھی۔ اب وہ بالکل تندرست تھی اور مسکراتے ہوئے اپنے ماں باپ سے باتیں کر رہی
تھی۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر میرا بھی شکریہ ادا کیا اور کہا۔

"مہاراج! آپ بڑے مہان ہیں کہ آپ کی وجہ سے میرا روگ ہمیشہ کے لئے جاتا

رہا۔"

میں اب وہاں سے کھسکنے کا سوچ رہا تھا۔ میں نے کلاک پر نگاہ ڈالی۔ ابھی دوپہر نہیں ہوئی تھی۔ سوچا باہر کہاں سڑکوں پر پھروں گا۔ خوامخواہ کسی خفیہ پولیس والے نگاہوں میں نہ آجاؤں۔ یہ جگہ ٹارگٹ کے قریب بھی ہے۔ بہتر ہے کہ کم از کم تین ساڑھے تین بجنے تک یہیں بیٹھا رہتا ہوں۔ یہاں تو کسی خفیہ پولیس والے کا خطرہ نہیں تھا۔ جگہ بڑی محفوظ تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہاں کھانا لگا دیا گیا۔ بڑا پر تکلف کھانا تھا۔ اوما کماری اگرچہ ہمارے ساتھ میز پر بیٹھ کر کھانا کھانا چاہتی تھی مگر اس کے باپ نے کہا۔

"نہیں بیٹی ابھی پلنگ پر ہی آرام کرو۔"

میری تعریفوں کے پل باندھے جا رہے تھے۔ میں بھی چپ تھا۔ دیوار والے کلاک دیکھ لیتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ پورے ساڑھے تین بجے مجھے وہاں سے اپنے ٹارگٹ کی طرف نکل جانا ہے۔ پھر شاید ساری زندگی ان لوگوں سے ملاقات نہیں ہوگی۔ میں ان لوگوں کی تعریفیں ایک کان سے سنتا اور دوسرے کان سے نکال رہا تھا۔

پنکج بابو کے گھر کھانا وغیرہ کھانے اور باتیں کرنے میں وقت تیزی سے گزر گیا۔ جب کلاک نے ٹھیک ساڑھے تین بجائے تو میں چلنے کے لئے اٹھا۔ پنکج بابو کہنے لگے۔

"مہاراج! آپ جب تک کلکتے میں ہیں ہمارے ہاں ہی ٹھہریں۔ یہ ہمارے بڑے سوبھاگ ہوں گے۔"

میں نے کہا۔

"میں اپنے ایک دوست کے پاس ٹھہرا ہوا ہوں۔ وہ مجھ سے ناراض ہو جائے گا۔ ہاں۔ میں کبھی کبھی موقع نکال کر آپ کے پاس آجایا کروں گا۔ ابھی مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔"

وہ لوگ مجھے چھوڑنے مکان کے برآمدے سے بھی باہر تک آئے۔ آخر میں نے انہیں نمسکار کیا اور سڑک پر اس طرف چلنے لگا جہاں سے بڑی سڑک فوجی فاؤنڈیشن کی طرف مڑ جاتی تھی۔

کلکتے کے ابر آلود آسمان پر دن کی روشنی کم ہونا شروع ہو گئی تھی۔ راستہ مجھے یاد نہیں رہا تھا۔ بڑی سڑک پر آکر مجھے ایک آدمی سے فوجی فاؤنڈیشن کا دفتر پوچھنا پڑا۔ میں بائیں جانب ایک سڑک پر مڑ گیا۔ وہاں سے دور مجھے فوجی فاؤنڈیشن کی عمارت نظر آنے لگی۔ میں فٹ پاتھ پر بڑے آرام سے چل رہا تھا۔ مجھے کوئی جلدی نہیں تھی۔ دفاتر میں چار بجے چھٹی ہوتی تھی اور میرے اندازے کے مطابق ابھی چار بجنے میں دس پندرہ منٹ باقی تھی۔ ایک بات میرے حق میں جاتی تھی کہ کشمیری مسلمانوں کا قاتل درگاداس مجھے

شکل سے نہیں پہچانتا تھا۔ اس لئے میں فوجی فاؤنڈیشن کی عمارت کے پاس جو بس سٹاپ
اس کے شیڈ کے نیچے جا کر خالی بنچ پر بیٹھ گیا۔

اس دوران ایک دو بسیں آئیں اور مسافروں کو اتار کر دو تین مسافر لے کر آ
نکل گئیں۔ اتنے میں فوجی فاؤنڈیشن سے گیٹ میں لوگ باہر نکلنا شروع ہو گئے۔ دفاتر م
چھٹی ہو گئی تھی۔ میں بنچ پر سے اٹھ کر شیڈ کے کونے میں ایسی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ جہا
سے میں صوبیدار درگاداس کو بس میں داخل ہوتے ہوئے آسانی سے دیکھ سکتا تھا۔ آ
میرا خیال محض اس کی چہرہ شناسی کرنی تھی۔ لیکن میں نے یہ بھی سوچ رکھا تھا کہ ا
موقع مل گیا تو اس کا کام تمام کر ڈالوں گا۔ اس معاملے کو دوسرے دن پر نہیں اٹھاؤں گا۔
دفتر کے لوگ چھٹی کے بعد سائیکلوں موٹر سائیکلوں وغیرہ پر نکل کر اپنے اپنے گھروں کو
رہے تھے۔ کچھ کلرک ٹائپ کے بابو بس سٹاپ کے شیڈ میں آ کر کھڑے ہو گئے۔ میر
نگاہیں درگاداس کو تلاش کر رہی تھیں۔

وہ مجھے ابھی تک دکھائی نہیں دیا تھا۔ ایک بس آئی۔ مسافر اس میں سوار ہوئے او
وہ چل دی۔ کچھ اور لوگ آ کر سٹاپ پر کھڑے ہو گئے۔ دوسری بس آئی وہ لوگ بھی بس
میں سوار ہوئے اور بس چلی گئی۔ میں نے سوچا کہ درگاداس شاید سب سے آخر میں دفتر
سے نکلتا ہو گا۔ میں شیڈ کے بنچ پر بیٹھ گیا۔ میری نظریں فاؤنڈیشن کے گیٹ پر لگی ہوئی
تھیں۔ میں نے احتیاطاً زہریلی بال پوائنٹ پنسل کو اپنے سیدھے ہاتھ والی جیب میں رکھ لیا
تھا۔ تاکہ اگر حملہ کرنا پڑ جائے تو پنسل نکالنے میں آسانی ہو۔ وقت گزرتا جا رہا تھا۔
فاؤنڈیشن کے گیٹ کو بند کر دیا گیا۔ اب کوئی کوئی ملازم چھوٹے گیٹ میں سے نکلتا دکھائی
دے جاتا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ درگاداس شاید آج دفتر نہیں آیا۔ ورنہ اب تک اسے باہر
آ جانا چاہیے تھا۔ پھر سوچا کہ اس پر موت کا خوف سوار ہے۔ وہ ضرور اندھیرا ہو جانے
کے بعد دفتر سے نکلتا ہو گا۔

تھوڑی دیر بعد شام کا اندھیرا چھانے لگا۔

اس دوران میں نے ایک آدمی کو دیکھا جو فاؤنڈیشن کے گیٹ کے قریب ہی ایک

سکوٹر کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ مجھ سے اس کا فاصلہ کوئی بیس پچیس قدم کا
ہو گا۔ اس نے کرتا پاجامہ پہن رکھا تھا۔ گلے میں کھدر کا تھیلا تھا۔ دور سے دیکھنے پر وہ
زیادہ عمر کا لگتا تھا۔ میں اس کی طرف توجہ نہ دیتا لیکن میں نے محسوس کیا کہ میں اس کی
نظروں میں ہوں۔ اس نے دو تین بار مجھے گھور کر دیکھا تھا۔ جب شام کا اندھیرا گہرا ہونے لگا
تو میں نے سوچا کہ مجھے یہاں سے چل دینا چاہیئے۔ آج درگاداس یقیناً دفتر نہیں آیا ہو گا۔
کہیں ایسا نہ ہو کہ میں الٹا کسی مصیبت میں پھنس جاؤں۔ یہ سوچ کر میں بنچ سے اٹھنے ہی
لگا تھا کہ میں نے فاؤنڈیشن کے چھوٹے گیٹ میں سے یکے بعد دیگرے چار آدمیوں کو نکلتے
دیکھا۔ دو آدمی آگے آگے تھے۔ ان کے درمیان ایک درمیانے قد کاٹھ کا گول مٹول سا
آدمی تھا۔ اس کے پیچھے ایک اور آدمی تھا۔ گیٹ سے باہر آتے ہی دو درمیان والے آدمی
کے دائیں بائیں ہو گئے اور تیسرا آدمی درمیان والے آدمی کے عقب میں ہو کر چلنے لگا۔
ان تینوں کے انداز سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ یہ تینوں آدمی درمیان والے آدمی کی
حفاظت پر مامور ہیں اور باڈی گارڈ ہیں۔ میرے خون کی گردش ایک دم تیز ہو گئی۔

یہ لوگ سیدھے بس سٹاپ کی طرف آ رہے تھے۔ جب ذرا قریب آئے تو میں نے
صوبیدار درگاداس کو صاف پہچان لیا۔ اس کی مونچھیں اگرچہ غائب تھیں مگر چہرہ بالکل وہی
تھا جو میں نے اس کی تصویر میں دیکھا تھا۔ وہ اپنے باڈی گارڈز کے درمیان بڑا محتاط ہو کر
دائیں بائیں دیکھتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ میں اپنے آپ کو مسافر ظاہر کرتے ہوئے بنچ کے کونے
میں بیٹھا رہا۔ یہ لوگ شیڈ میں آ کر اس طرح کھڑے ہو گئے کہ تینوں باڈی گارڈز نے
درگاداس کو گھیرے میں لے رکھا تھا۔ ان محافظوں کے ہاتھوں میں کوئی پستول وغیرہ نہیں
تھا لیکن یہ یقینی بات تھی کہ ان کی جیبوں میں پستول ضرور تھے۔

بس ابھی تک نہیں آئی تھی۔ اتنے میں وہ آدمی جو گیٹ کے پاس کھڑے سکوٹر پر بیٹھا
سگریٹ پی رہا تھا شیڈ میں آ گیا۔ وہ میرے بالکل ساتھ بنچ پر آ کر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے میری
طرف گہری نظروں سے دیکھا اور بنگلہ میں کوئی سوال کیا۔ میں بنگلہ زبان نہیں بول سکتا
تھا۔ میں نے اردو میں کہا۔

"مجھے بنگلہ نہیں آتی"

اس نے اردو میں پوچھا۔

"تم کہاں سے آئے ہو؟"

اس کا مطلب تھا کہ میں کس شہر سے آیا ہوں۔ میں نے بڑی بے نیازی سے کہا۔

"امرتسر سے آیا ہوں۔ کلکتے کی سیر کرنے"

وہ بولا۔

"یہ کوئی سیر کرنے کی جگہ نہیں ہے۔ یہاں تم ڈیڑھ گھنٹے سے بیٹھے کس کا انتظار کر رہے ہو؟"

میں نے ذرا سخت لہجے میں کہا

"تم یہ پوچھنے والے کون ہوتے ہو؟"

ہماری گفتگو سن کر صوبیدار درگاداس اور اس کے باڈی گارڈز بھی ہماری طرف دیکھنے لگے۔ صوبیدار درگاداس کو تو پہلے ہی اپنے پیچھے لگے ہوئے حریت پرستوں کا خوف رہتا تھا۔ اس نے مجھ سے سختی سے پنجابی میں کہا۔

"تم امرتسر میں کہاں رہتے ہو؟ مجھے بتاؤ۔ میں خود امرتسر کا رہنے والا ہوں"

میں نے کہا۔

"چوک پراگ داس میں رہتا ہوں۔ اور کیا پوچھنا چاہتے ہو"

اتنے میں بس آگئی۔ وہاں ہمارے سوا اور کوئی مسافر نہیں تھا۔

درگاداس نے حکم دینے کے انداز میں مجھ سے کہا۔

"ہمارے ساتھ چلو۔ ابھی معلوم ہو جائے گا تم کون ہو اور یہاں کس لئے بیٹھے ہوئے تھے۔"

میں اس کے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔ میں سمجھ گیا کہ کشمیری مسلمانوں کے درندہ صفت قاتل درگاداس کی موت کا وقت آگیا ہے۔ جو آدمی میری نگرانی کر رہا تھا۔ اس نے درگاداس کو بتایا کہ میں خفیہ پولیس کا آدمی ہوں۔ درگاداس کے باڈی گارڈز نے اسی وقت

مجھے قابو کر لیا اور گھسیٹ کر بس میں لے گئے۔ بس کے دروازے والی پچھلی سیٹ ساری خالی تھی۔ انہوں نے وہاں مجھے اپنے درمیان پکڑ کر بٹھا لیا۔ درگاداس میرے بالکل ساتھ بیٹھا تھا۔ اس کے ساتھ دو باڈی گارڈ تھے۔ دوسری جانب ایک باڈی گارڈ تھا اور خفیہ پولیس والا اس کے بعد سیٹ پر بیٹھا تھا۔ بس چل پڑی تو میں نے کہا۔

"تم لوگ خوا مخواہ مجھے پریشان کر رہے ہو۔ میں اخبار کا آدمی ہوں۔ تمہاری خبر کل اخبار میں آجائے گی"

صوبیدار درگاداس پر میری اس دھمکی کا اثر نہ ہوا۔ اس نے میری پسلیوں میں کہنی مارتے ہوئے کہا۔

"آرام سے بیٹھے رہو۔ تھانے چل کر یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ تم کس اخبار کے آدمی ہو"

بس شام کے گہرے ہوتے ہوئے اندھیرے میں سڑک پر چلی جا رہی تھی۔ میں ایک سیکنڈ بھی ضائع نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے صوبیدار درگاداس کو ہلاک کر کے بس سے فرار ہونے کی منصوبہ بندی شروع کر دی۔ مشکل یہ آن پڑی تھی کہ میرا مقابلہ زیادہ آدمیوں سے تھا۔ تین اس کے باڈی گارڈ تھے جن کے پاس ضرور پستول بھی تھے۔ ایک خفیہ پولیس والا آدمی تھا اور ایک خود صوبیدار درگاداس تھا جو فوج کا تربیت یافتہ فوجی تھا۔ اس کے باوجود مجھے یقین تھا کہ پولیس سٹیشن پہنچنے سے پہلے پہلے میں ان لوگوں کے چنگل سے نکلنے میں کامیاب ہو جاؤں گا اور کشمیری مسلمانوں کے قاتل سے بھی بے گناہ کشمیریوں کا خون کا بدلہ لے لوں گا۔ مگر مجھے جو کچھ بھی کرنا تھا جلدی کرنا تھا۔ اس علاقے کا پولیس سٹیشن کسی بھی وقت آسکتا تھا۔ ایک باڈی گارڈ نے میرا دایاں بازو پکڑ رکھا تھا۔ میں نے اسے کہا۔

"اب میرا بازو پکڑنے کی کیا ضرورت ہے میں کہیں بھاگا نہیں جا رہا۔"

اس نے میرا بازو چھوڑ دیا۔ درگاداس نے مجھے بے رحم گہری نگاہوں سے دیکھا اور کہا۔

"مجھے تم پاکستانی جاسوس لگتے ہو۔ ابھی سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔"

میں نے اس دوران اپنا سیدھا ہاتھ پتلون کی جیب میں ڈال لیا تھا اور ہلاکت خیز
زہریلا بال پوائنٹ میری گرفت میں تھا۔ درگاداس نے ایک اور حکم دیا

”تمہاری جیب میں کیا ہے۔ باہر نکالو“

باڈی گارڈ میری ہر حرکت پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھے۔ میں نے جیب سے بال
پوائنٹ پنسل نکال کر انہیں دکھائی اور کہا۔

”یہ بال پوائنٹ پنسل ہے۔ میرے پاس کوئی پستول نہیں ہے۔ میں اخبار نویس
ہوں۔ کوئی اٹنک وادی نہیں ہوں“

”مجھے دکھاؤ“

درگاداس نے بال پوائنٹ لے کر اسے اوپر نیچے غور سے دیکھا۔ میں نے اس کے
ہاتھ سے پنسل پکڑ لی اور کہا۔

”قلم اخبار نویس کا سب سے بڑا ہتھیار ہوتا ہے۔ یہ مجھے دے دو“

اس وقت کوئی بس شاپ آرہا تھا۔ بس کی رفتار ہلکی ہو رہی تھی۔ میں نے جو کچھ کہا
تھا۔ اس پر عمل کرنے کا وقت آگیا تھا۔ مجھے فوراً کمانڈو اٹیک کرنا تھا۔ اب مجھے یا تو
ٹارگٹ مارنا تھا اور یا ٹارگٹ مارنے کے بعد خود بھی مرنا تھا۔ بال پوائنٹ پنسل میرے
سیدھے ہاتھ میں تھی۔ میں نے ہاتھ بغلوں میں دے دیئے۔ اس طرح میرے سیدھے
ہاتھ میں پکڑی ہوئی بال پوائنٹ پنسل کی نوک میرے بائیں جانب بیٹھے ہوئے صوبیدار
درگاداس کی پسلیوں کے بالکل قریب تھی۔ سب سے پہلے مجھے کشمیری مسلمانوں کے
قاتل کو ہی ہلاک کرنا تھا۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ بال پوائنٹ کی خفیہ ٹیوب میں
چھوٹی چھوٹی سوئیاں میگزین کی طرح ایک دوسرے کے آگے پیچھے لگی ہوئی ہیں وہ دنیا کے
سب سے زیادہ ہلاکت خیز زہر میں بجھی ہوئی ہیں اور بٹن دباتے ہی سوئی بال پوائنٹ سے
گولی کی طرح فائر ہو کر صوبیدار درگاداس کی پسلیوں میں اتر جائے گی اور اس کی اسی
وقت موت واقع ہو جائے گی۔

جیسے ہی بس اپنے شاپ پر ایک دھچکے سے رکی میں نے بال پوائنٹ کا بٹن دبا دیا۔

سوئی فائر ہو کر درگاداس کی پسلیوں میں اتر چکی تھی۔ کیونکہ اس کے فوراً بعد درگا
داس آگے کو گر پڑا۔ سب یہی سمجھے کہ وہ بس کے دھچکے سے توازن برقرار نہیں رکھ سکا
اور گر پڑا ہے۔ فوراً باڈی گارڈ اسے اٹھانے کے لئے جھکا بال پوائنٹ میرے ہاتھ میں
تھی۔ میں نے بھی یہ ظاہر کیا کہ جیسے اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکا اور ایک طرف کو
لڑھک گیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اپنی دائیں جانب والے باڈی گارڈ پر دوسرا فائر کر
دیا۔ اس بال پوائنٹ سے پندرہ بیس فٹ کے فاصلے تک فائر ہو سکتا تھا۔ دوسرا باڈی گارڈ
بھی منہ کے بل گرا تو وہاں افراتفری سی مچ گئی۔ میں بھی درگاداس کو سنبھالنے لگا۔
تیسرے باڈی گارڈ نے مجھے بازو سے پکڑ کر پیچھے کھینچا اور جیب سے پستول نکال لیا۔ اس
دوران یہ معلوم ہو چکا تھا کہ صوبیدار مر گیا ہے۔ جیسے ہی پہلے باڈی گارڈ نے چلا کر کہا۔

”صوبیدار مر گیا ہے“

میں نے تیسرے باڈی گارڈ پر فائر کر دیا۔ خدا جانے سائی نائیڈ زہر کس نے ایجاد کیا
تھا۔ میں آج بھی حیران ہوں کہ زہریلی سوئی جسم کے اندر جاتے ہی آدمی کس طرح کٹے
ہوئے درخت کی طرح گر پڑتا ہے۔ تیسرے باڈی گارڈ کے گرتے ہی میں نے بس میں سے
باہر چھلانگ لگا۔ صرف وہ باڈی گارڈ جو سب سے پہلے درگاداس کو اٹھانے کے لئے جھکا تھا
اور خفیہ پولیس والا آدمی ہی زندہ بچے تھے۔ میں اندھیرے میں فٹ پاتھ پر بھاگا۔ پیچھے سے
مجھ پر پستول کا فائر ہوا۔ اس کے ساتھ ہی وہاں پکڑو پکڑو کا شور مچ گیا۔ مجھے اپنے پیچھے
دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ میں نے بھی اپنی رفتار تیز کر دی۔ سڑک پر
بتیاں روشن تھیں جس کی وجہ سے میں دوڑتے ہوئے نظر آرہا تھا۔ پیچھے سے ایک اور فائر
ہوا۔ گولی تیز سیٹی کی آواز کے ساتھ میرے کان کے قریب سے گزر گئی۔ اب روشنی میں
دوڑنا اپنی موت کو آواز دینا تھا۔ میری ایک جانب کشادہ سڑک تھی جس پر ٹریفک جاری
تھی۔ دوسری جانب درخت اور جھاڑیاں تھیں۔ میں فٹ پاتھ پر سے جھاڑیوں میں کود
گیا۔ گرتے ہی اٹھا اور جدھر میرا منہ تھا اسی طرف دوڑ لگا دی۔ جھاڑیاں درخت اندھیرا
پھر روشنی پھر اندھیرا۔ پیچھے پکڑ لو پاکستانی جاسوس پکڑ لو۔ قاتل ہے۔ پکڑو۔ یہ سب کچھ

دیکھتا اور سنتا میں دوڑتا جا رہا تھا۔ آگے پھر جھاڑیاں آگئیں میں ان میں گھس کر دو
طرف ایک چھوٹی سڑک تھی اس پر نکل آیا۔ مجھے دور نزدیک مکانوں کی روشنیاں
آئیں۔ میرے پیچھے شور کچھ دور ہو گیا تھا مگر خطرہ برابر میرے سر پر منڈلا رہا تھا۔
ہوائی فائر ہوئے اور آوازیں ایک بار پھر میرے قریب آنے لگیں۔ میں نے اپنے حو
درست کرتے ہوئے سڑک کو غور سے دیکھا۔ میں نے فوراً اس سڑک کو پہچان
یہ وہی سڑک تھی جس پر اوماکماری کے باپ پنکج بابو کا گھر تھا۔ لوگوں کی آوازیں بہت
تھیں۔ میں سڑک کے کنارے کنارے اندھیرے میں تیز تیز چلنے لگا۔ پنکج بابو کا گھر میں
پہچان لیا تھا۔ میں فوراً مکان کے چھوٹے سے احاطے میں گھس گیا۔ گھبراہٹ میں
لوگوں کے پاس جانے سے انہیں بھی شک پڑ سکتا تھا اور لوگ مجھے تلاش کرتے کرتے
مکان میں بھی آسکتے تھے۔

پنکج بابو کے مکان کے برآمدے کی بتی جل رہی تھی۔ میں اندھیرے میں ناریل
درخت کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گیا۔ اس خیال سے کہ میرے پیچھے جو لوگ لگے ہوئے
اگر وہ میری تلاش میں پنکج بابو کے مکان میں آئے تو میں موقع پا کر باہر ہی باہر سے فرار
جاؤں گا۔ اس دوران میں نے گہرے گہرے سانس لینے شروع کر دیئے تا کہ میرا سا
نارمل ہو جائے اور اگر مجھے گھر میں داخل ہونا پڑے تو کسی کو میرا پھولا ہوا سانس دیکھ
شک نہ پڑے۔ پنکج بابو کے مکان کے آگے جو کچی سڑک گزرتی تھی اس پر کافی دور دور
کے کھمبے لگے تھے اور سڑک ویران ویران تھی۔ ایک مکان میں سے بنگلہ میوزک کی
ہلکی آواز آ رہی تھی۔ پنکج بابو کے گھر میں بھی خاموشی چھائی تھی۔ سڑک پر ایک
سے لوگوں کے تیز تیز بنگلہ اور اردو میں باتیں کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔
اندھیرے میں درخت کے پیچھے اور سمٹ گیا۔ احاطے کی تین فٹ اونچی دیوار کے اوپر
سامنے والے مکانوں کی مدھم روشنیوں میں سڑک پر آتا جاتا آدمی مجھے نظر آ سکتا تھا۔

آوازیں قریب آتی گئیں۔ کسی نے اردو میں کہا۔

"وہ یہیں کہیں چھپا ہو گا۔"

پھر کسی نے اونچی آواز میں بنگلہ زبان میں کچھ کہا۔ میں نے آواز پہچان لی۔ یہ
صوبیدار درگاداس کے ایک باڈی گارڈ کی آواز تھی۔ کسی نے کہا۔

"ہم نے سارا علاقہ گھیرے میں لے لیا ہے۔ پولیس گارڈ پہنچ رہی ہے۔"

اب میرا وہاں سے نکل کر کسی طرف بھاگنا ٹھیک نہیں تھا۔ میں پکڑا جا سکتا تھا۔ اب
میں صرف ایک کشمیری یا ان لوگوں کے بقول پاکستانی جاسوس ہی نہیں تھا بلکہ ایک ریٹائرڈ
انڈین آرمی صوبیدار اور اس کے باڈی گارڈ کا قاتل بھی تھا۔ کچھ لوگ دوڑتے ہوئے
سڑک پر سے گزر گئے۔ پیچھے سے بھی لوگوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ مجھے یہ بھی خیال تھا
کہ باہر کی آوازیں سن کر اگر پنکج بابو مکان سے نکل آیا اور اس کی نظر مجھ پر پڑ گئی تو
معاملہ خراب ہو جائے گا۔ میری عافیت اسی میں تھی کہ میں اب کسی طریقے سے پنکج بابو
کے مکان کے اندر چلا جاؤں۔

میرا سانس بالکل نارمل ہو چکا تھا۔ میں نے درخت کے پیچھے اندھیرے میں چھپے چھپے
اپنے سر پر ہاتھ پھیر کر بالوں کو درست کیا۔ ڈاڑھی پر بھی ہاتھ پھیرا اور سڑک پر نگاہ ڈالی۔
مکان کے آگے سڑک خالی تھی۔ لوگوں کی آوازیں یا تو آگے سے آ رہی تھیں اور یا پیچھے
سے آ رہی تھیں۔ بڑا مناسب موقع تھا۔ خطرہ صرف اس بات کا تھا کہ اگر برآمدے والے
کمرے کا دروازہ اندر سے بند ہوا تو مجھے دستک دے کر دروازہ کھلنے کا انتظار کرنا پڑے گا
جو میرے لئے انتہائی مہلک ثابت ہو سکتا تھا۔ لیکن اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ بھی
نہیں تھا۔ میں نے یہی سوچا کہ دروازے پر دستک دے کر دوڑ کر درخت کے پیچھے آ کر
طرح چھپ جاؤں گا اور جب اندر سے کوئی دروازہ کھولے گا تو اندھیرے میں سے نکل کر
سامنے آ جاؤں گا۔ یہ دھڑکا بھی لگا تھا کہ پولیس گارڈ بھی پہنچنے والی ہے اور جو لوگ اس
سڑک پر آگے پیچھے موجود ہیں ان میں سے کوئی اچانک سامنے نہ آ جائے۔

ان تمام خطرات کے باوجود میں درخت کے پیچھے سے اٹھ کر برآمدے میں آیا اور
آتے ہی سب سے پہلے بند دروازے کو اندر کی طرف دھکیلا۔ میری خوش قسمتی تھی کہ
دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔ دروازہ کھل گیا۔ میں نے اندر داخل ہوتے ہی دروازہ بند

کر دیا۔ کمرے میں بتی جل رہی تھی۔ جس پلنگ پر میں پنکج بابو کی بیٹی اوماکماری کو
مند حالت میں لیٹا چھوڑ گیا تھا وہ پلنگ خالی تھا۔ کمرے میں کوئی بھی نہیں تھا۔ میں نے
کام یہ کیا کہ کمرے کے اندر سے چٹخنی لگا دی۔ پھر میں نے بڑی پرسکون آواز میں کہا۔

"پنکج بابو؟ اوما جی؟"

ساتھ والے کمرے کے دروازے پر پردہ لٹک رہا تھا۔ پردہ ایک طرف ہٹا اور
کماری اپنے بالوں میں کنگھی کرتی نمودار ہوئی۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے ہاتھ جوڑ کر
عقیدت سے نمسکار کیا اور کرسی پر سے تولیہ اٹھاتے ہوئے بولی۔

"بیٹھئے مہاراج! بابو جی میرے لئے کافی کاٹن لینے گئے ہیں۔ ماتا جی رسوئی میں ہیں

میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ اوماکماری نے کنگھی کارنس پر رکھ کر سر کر ساڑھی کے پلو
ڈھانپا اور مسکراتے ہوئے بولی

"مجھے انگلش کافی بہت پسند ہے۔ نوکر گھر پر نہیں تھا۔ پتا جی خود لینے چلے گئے
آپ بیٹھیے میں ماتا جی کو بلاتی ہوں۔"

اس دوران میں نے سوچ لیا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ میرے لئے اب اس علاقے
صرف یہی ایک گھر ایسا تھا جہاں مجھے پناہ مل سکتی تھی لیکن اس کے واسطے ایک خا
حکمت عملی کی ضرورت تھی جو اسی وقت میرے ذہن میں آگئی تھی۔ میں نے اوماکماری
روکتے ہوئے کہا۔

"نہیں اوما جی! ماتا جی کو نہ بلاؤ یہاں کسی کو سوائے تمہارے نہیں آنا چاہیے۔
شبھ شگن ہوا ہے کہ گھر میں آتے ہی مجھے تم مل گئی ہو۔ اب تمہاری رہی سہی بیماری
ختم ہو جائے گی میں نے تھوڑی دیر پہلے تمہارا زائچہ بنایا تھا۔ میں نے دیکھا ہے
تمہارے گرہ پر برہسپتی کا منحوس سایہ پھر پڑنے لگا ہے۔ میں بھاگ کر تمہارے گھر آ
اس وقت مجھے ایک الگ کمرے کی ضرورت ہے جہاں بیٹھ کر میں ایسے منتروں کا
کروں گا کہ تمہارے اوپر سے برہسپتی کا منحوس سایہ ہمیشہ کے لئے دور ہو جائے گا۔
اس کی شرط یہ ہے کہ تمہارے سوا اس گھر میں کوئی دوسرا نہ [illegible] شکل دیکھے اور

از کم آدھی رات تک کسی کو معلوم ہو کہ میں اس گھر میں خفیہ منتروں کا جاپ کر رہا
ہوں۔ تمہارے ماتا پتا اور نوکروں کو بھی پتہ نہ لگے کہ میں اس گھر میں کسی جگہ سمادھی لگا
کر بیٹھا ہوں"

اوماکماری میری پہلے ہی زبردست عقیدت مند تھی۔ اب اس نے سنا کہ میں اس کی
بیماری کو ہمیشہ کے لئے دور کرنے کے واسطے کچھ دیر کے واسطے روپوشی کی حالت میں
منتروں کا جاپ کرنے والا ہوں تو وہ جلدی سے مجھے مکان کے ایک سٹور روم میں لے
گئی۔ اس کمرے میں الابلا چیزیں پڑی تھیں۔ ایک جگہ میں نے وہیں سے دری اٹھا کر
بچھائی اور کہا۔

"بس اوما جی! اب تم جاؤ اور خبردار کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو کہ میں یہاں بیٹھا چلا
کاٹ رہا ہوں"

وہ بولی۔

"مہاراج آپ فکر نہ کریں۔ میں کسی کو نہیں بتاؤں گی۔"

جب وہ جانے لگی تو میں نے کہا۔

"اگر مجھے جانے کی ضرورت پڑی تو صبح ہوتے ہی خاموشی سے چلا جاؤں گا۔ تم باہر
سے تالا کنڈی نہ لگانا۔"

"اچھا مہاراج!"

وہ دروازہ بند کر کے چلی گئی۔

میرے کان باہر گھر کی آوازوں پر لگے تھے۔ مجھے خطرہ تھا کہ ابھی باہر سے پولیس
دروازہ کھٹکھٹائے گی اور میرے بارے میں پوچھے گی۔ یہ خطرہ بھی تھا کہ باڈی گارڈوں اور
خفیہ پولیس والے نے میرا چہرہ دیکھا ہوا تھا اگر اس نے میرا حلیہ بتاتے ہوئے کہا کہ اس
شکل صورت کا آدمی دو قتل کر کے ادھر کہیں چھپا ہوا ہے تو اوماکماری خوف کے مارے
پولیس کو میرے بارے میں نہ بتا دے۔ پھر یہ سوچ کر دل کو تسلی دی کہ یہ اوماکماری کی
بیماری کا معاملہ ہے وہ ایسی غلطی ہرگز نہیں کرے گی۔ لیکن خدا نے بڑا کرم کیا۔ وہاں

پولیس ضرور آئی مگر پنکج کمار کے گھر پر کسی نے دستک نہ دی اور نہ میرے بارے
پوچھا۔ آدھی رات کے وقت سٹور روم کے دروازے پر بڑی ہی آہستہ دستک ہوئی۔ میں
جاگ رہا تھا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ باہر سے اوما کماری کی دھیمی آواز آئی

"مہاراج! میں ہوں اوما"

میں نے کہا۔

"آجاؤ"

اوما کماری دروازہ کھول کر اندر آگئی۔ اس کے ہاتھ میں پیالی تھی۔ کہنے لگی۔

"مہاراج! میں نے آپ کی تپسیا خراب تو نہیں کر دی؟"

میں نے کہا۔

"نہیں اوما جی! میں منتروں کا جاپ ختم کر چکا ہوں۔ تمہیں بدھائی ہو۔ تمہارے
پر سے منحوس ستارے کا سایہ ہمیشہ کے لئے دور ہو گیا ہے۔"

وہ بڑی خوش ہوئی۔ پیالی میرے قریب رکھ کر جھکی اور میرے قدموں کو ہاتھ لگا
اپنے چہرے پر پھیرا اور بولی۔

"مہاراج! میں آپ کے لئے کافی بنا کر لائی ہوں"

میں نے پوچھا۔

"گھر میں کسی کو میرا پتہ تو نہیں چلا؟"

اس نے کہا۔

"بالکل نہیں مہاراج! میں نے کسی سے ذکر تک نہیں کیا۔ باہر پتا جی کہتے تھے
پولیس پھر رہی ہے۔ پتہ نہیں کوئی قیدی جیل سے بھاگ گیا ہے شاید"

میں نے کہا۔

"ہو گا۔"

میں نے فوراً موضوع بدلا اور کہا۔

"اوما کماری! تم بڑی بھاگیہ وان ہوں۔ میں نے ایسا منتر پڑھ کر پھونک دیا ہے کہ

تمہیں ساری زندگی کبھی سر میں درد نہیں ہو گا"

وہ ہاتھ جوڑ کر میرے سامنے دو زانو بیٹھی تھی۔ کہنے لگی۔

"مہاراج! میں تو آپ کی داسی ہوں۔"

میں نے سوچا کہ میرا یہاں سے منہ اندھیرے نکلنا بھی درست نہیں ہے۔ پولیس نے
ضرور چاروں طرف ناکہ بندی کر رکھی ہو گی۔ باہر نکلنے کی کوشش کی تو بہت ممکن ہے کہ
پکڑ لیا جاؤں۔ بہتر یہی ہے کہ ابھی پنکج بابو کے مکان پر ہی ٹھہرا جائے۔ یہاں رک کر
حالات کا مطالعہ کیا جائے۔ اگر حالات موافق ہوئے تو نکل جاؤں گا۔ میں نے اپنا مشن تو
مکمل کر ہی لیا تھا۔ اب مجھے واپس یا سری نگر کی طرف نکل جانا تھا یا ہگلی دریا کے کنارے
اپنے کشمیری مجاہد شاہ دین کے خفیہ کیمپ گاہ میں جا کر اسے اپنے مشن کی کامیابی کی خبر کرنی
تھی اور اگر ہو سکے تو وہیں سے سری نگر کمانڈر شیروان کو بھی یہ اطلاع پہنچانی تھی میں نے
یہ سوچ کر اوما کماری سے کہا۔

"اوما جی! میں صبح کے وقت ناشتہ تمہارے گھر پر ہی کروں گا۔ لیکن میں یہ ظاہر کرنا
چاہتا ہوں کہ جیسے میں باہر سے آیا ہوں۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟"

اوما کماری پڑھی لکھی خاتون تھی۔ کہنے لگی۔

"مہاراج! سٹور کے پیچھے ایک دروازہ مکان کے پچھواڑے کھلتا ہے۔ آپ اس
طرف سے گزر کر مکان کے برآمدے والے دروازے سے گھر میں آسکتے ہیں۔ سب یہی
سمجھیں گے کہ آپ ابھی باہر سے آئے ہیں"

میں نے کہا۔

"بس ٹھیک ہے۔ اب تم جاؤ۔ میں دن نکلنے کے بعد گھر میں آؤں گا"

وہ میرے قدموں کو چھو کر چلی گئی۔ کافی نے میرے جسم میں چستی پیدا کر دی۔ نیند
پہلے بھی نہیں آرہی تھی۔ صبح تک میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا اپنے اگلے مشن کے
بارے میں سوچتا رہا۔ آخر صبح ہو گئی۔ سٹور روم کے روشندان میں سے دن کی روشنی
اندر آنے لگی۔ باہر سڑک پر سے اخبار والے کی آواز بھی آئی۔ ایک سکوٹر تیزی سے گزر

گیا۔ درختوں پر بولتے پرندوں کی آوازیں بھی شروع ہو گئیں۔ جب ذرا دن نکل آ
میں خاموشی سے اٹھا۔ دروازہ کھولا اور باہر دیکھا۔ سامنے ایک اور دروازہ تھا جو بند
میں سٹور روم کے پیچھے آ گیا۔ میں دبے پاؤں چل رہا تھا۔ مکان کے اندر سے اوماکما
اور اس کی ماتا جی کی باتیں کرنے اور نوکر کو بلانے کی آواز آئی۔ میں نے دیکھا کہ
واقعی ایک دروازہ تھا۔ کنڈی کھول کر میں نے دروازے کا ایک پٹ ذرا سا کھولا۔ یہ م
کا پچھوڑا تھا جہاں مرغیوں کے ڈربے اور کاٹھ کباڑ پڑا تھا۔ مرغیاں ادھر ادھر دانہ
رہی تھیں۔ یہاں سے میں انتہائی احتیاط سے چلتا مکان کے برآمدے کی طرف آ گیا۔
سے پہلے میں نے سڑک کا جائزہ لیا۔ مجھے وہاں کوئی پولیس کانسٹیبل نظر نہ آیا۔ میں
برآمدے میں آ کر دروازے پر دستک دی۔ اوماکماری شاید میرا انتظار ہی کر رہی تھی۔
نے دروازہ کھولا۔ مجھے دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرائی اور اونچی آواز میں بنگلہ زبان
اس نے ماتا جی اور پتا جی سے کہا کہ مہاراج آئے ہیں۔

میں جلدی سے کمرے میں داخل ہو گیا۔ اوماکماری نے دروازہ بند کر کے کنڈی لگا
دی۔ دوسرے کمرے میں سے پنکج بابو اور رسوئی میں سے اوماکماری کی ماں نکل کر وہا
آ گئی۔ انہوں نے مجھے عقیدت مندانہ نمسکار کیا۔ پنکج بابو نے میرے پاؤں چھوئے
اوماکماری جی نے بھی میرے پاؤں چھوئے۔ اس کی ماتا جی میرے پاؤں کو ہاتھ لگانے لگیں
تو میں پیچھے ہٹ گیا۔ یہ بزرگ عورت تھی۔ ایک شفیق ماں تھی۔ مجھے یہ گوارہ نہیں تھا
کہ وہ مجھ گناہ گار کے پاؤں کو ہاتھ لگائے۔

میں نے انہیں بتایا کہ میں اوماکماری کی خبر پوچھنے آیا ہوں کہ اب اس کا کیا حال ہے
پنکج بابو بولے۔

”مہاراج! آپ کی مہربانی سے بھگوان نے اسے بالکل اچھا کر دیا ہے۔ دیکھ لیں یہ
سے کتنی اچھی لگ رہی ہے۔“

اوماکماری نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

”مہاراج! مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ کبھی سر درد ہوئی ہی نہیں“

میں نے کرسی پر بیٹھے ہوئے کہا۔

”بس۔ اب کبھی نہیں ہو گی سر درد۔“

پنکج بابو نے اوماکماری کی ماں سے کہا۔

”سروجنی جی! مہاراج کے لئے ناشتہ تیار کرو۔ رامو کو بھیج کر چوک میں سے کچوریاں
رس گلے بھی منگوا لو“

میں نے کہا۔

”پنکج بابو! تکلف بالکل نہ کریں۔ میں اس وقت کچوریاں اور رس گلے نہیں کھاؤں
معمولی ناشتہ کروں گا۔“

اوماکماری اور اس کی ماتا جی رسوئی کی طرف چلی گئیں۔ پنکج بابو میرے پاس بیٹھ گیا۔
اس سے باہر کے حالات معلوم کرنا چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔

”ہمارا محلہ یہاں سے دور نہیں ہے۔ رات وہاں پولیس پھر رہی تھی۔ بھگوان جانے
کیا بات ہو گئی تھی۔ کیا یہاں کوئی گڑبڑ ہوئی تھی؟“

پنکج بابو کہنے لگا۔

”مہاراج! مجھے تو معلوم نہیں۔ میں رات دیر سے گھر آیا تھا۔ سنیل جی کے ہاں شطرنج
کھیلتا رہا۔ صبح بازار گیا تو لوگوں نے بتایا کہ رات ملٹری فاؤنڈیشن کے پاس دو آدمیوں کا
خون ہو گیا ہے۔ پولیس علاقے میں قاتل کو تلاش کر رہی ہے۔ میں نے اپنی سڑک کے
کے پر پولیس کی گاڑی بھی دیکھی ہے۔“

میں نے انجان بن کر کہا۔

”جب ہی میں بھی کہوں یہ پولیس رات کے وقت ہمارے علاقے میں کیا کر رہی
ہے۔ کیا کسی فوجی کا خون ہوا ہے؟“

پنکج بابو بولا۔

”کچھ نہیں پتہ چلا مہاراج۔ تھوڑی دیر میں بازار جا کر سارے حالات معلوم کروں
گا۔“

اتنے میں اوماکماری اور بنگالن نوکرانی ناشتہ لے کر آگئیں۔ ناشتے پر جنگ کی با
شروع ہو گئیں۔ میں نے کہا۔

"ہماری بھارتی حکومت نے سوچ سمجھ کر پاکستان پر حملہ نہیں کیا تھا۔ ورنہ آج لا
پر ہمارا قبضہ ہوتا"

پنکج بابو کہنے لگا۔

"مہاراج! ہمارے لیڈروں کے دماغ ہی نہیں ہیں۔ فوجی کیا کریں۔ مگر اب نہ
کہ ہماری فوج نے پاکستان پر ایک اور حملہ کرنے کی زبردست تیاریاں شروع کر
ہیں۔"

اوماکماری بولی۔

"اب تیاریاں کرنے سے کیا ہو گا پتا جی جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ ساری دنیا میں بھار
کی بدنامی ہوئی ہے۔ لوگ کہتے ہیں پاکستان تو بڑا چھوٹا سا ملک تھا۔ ہندوستان کے پاس
زیادہ فوج تھی۔ اتنے ہوائی جہاز تھے۔ اتنے ٹینک تھے۔ پھر ہماری فوج سے اتنا بھی
سکا کہ لاہور کے شالامار باغ پر ہی قبضہ کر لیتی۔"

پنکج بابو بولا۔

"بیٹی! ایک اور بات بھی ہے۔ اس بات کو چاہے ہم مانیں یا نہ مانیں۔ اور وہ
ہے کہ پاکستان کے لوگ بڑے بہادر لوگ ہیں۔ جہلم گجرات میرپور پوٹھوہار سرح
میانوالی کے سارے علاقے بہادر فوجیوں کے علاقے ہیں۔ ان پنجابیوں نے تو سکندر
کی فوج کو نانی یاد کرا دی تھی۔ پورس کے ہاتھی نہ بدکتے تو سکندر قیدی بن کر پورس
دربار میں حاضر ہوتا۔"

میں نے یونہی کہہ دیا۔

"اب ہماری بھارتی سینا کس قسم کی تیاریاں کر رہی ہے؟ کیا وہ کوئی ایٹم بم
ہے؟"

پنکج بابو بولا۔

"مہاراج! ایٹم بم اگر ہم بنائیں گے تو پاکستان بھی بنا لے گا"

اوماکماری نے اپنے والد سے پوچھا۔

"پتا جی! کیپٹن سانیال بابو کیا کہتے ہیں۔ وہ تو میجر جنرل کے اے ڈی سی ہیں۔"

میرے کان کھڑے ہو گئے۔ میں نے یونہی پوچھا۔

"یہ کیپٹن سانیال کون ہیں؟"

پنکج بابو نے کہا۔

"میری بہن کا بیٹا ہے مہاراج! بڑا اچھا بچہ ہے۔ کبھی کبھی ملنے آجاتا ہے ویسے چندر
ر میں ہی اس کی آج کل ڈیوٹی لگی ہوئی ہے۔ کہہ رہا تھا کہ لاہور سیالکوٹ کے محاذ پر
ستان کی جن رانی توپوں نے بھارتی فوج کو زبردست نقصان پہنچایا تھا اس کے بارے میں
میں بڑی معلومات حاصل ہوئی ہیں اور اب ہم بھی ویسی ہی دور مار توپیں سویڈن سے
خرید رہے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"رانی توپوں کے بارے میں یہ معلومات کیپٹن سانیال کو کہاں سے حاصل ہوئی
ہیں؟"

پنکج بابو کہنے لگا۔

"اس نے بتایا تھا کہ ستمبر کی جنگ میں چونڈہ کے محاذ پر پاکستان کا ایک حوالدار پکڑا گیا
تھا۔ جو بہت زیادہ زخمی تھا۔"

میں نے ہنس کر کہا۔

"پنکج بابو! یہ تو ہماری بھارتی جنتا بھی جانتی ہے کہ ستمبر کی جنگ میں ہماری سینا کے
بے شمار فوجی پاکستان کے قیدی بن گئے تھے۔ اور یہ بھی ہم سب جانتے ہیں کہ پاکستان کا
اگر کوئی فوجی ہم نے قید کیا بھی ہے تو اس نے تشدد کے باوجود اپنی زبان نہیں کھولی۔ پھر
اس قیدی نے کیپٹن سانیال کو رانی توپوں کے بارے میں سب کچھ کیسے بتا دیا؟"

پنکج بابو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”نہیں نہیں۔ یہ بات نہیں؟ مہاراج پاکستانی فوج کے اس قیدی نے رانی توپوں کی جنگی پوزیشنوں کے بارے میں کچھ بتایا تھا۔ بات یہ ہے کہ یہ پاکستانی فوجی جو پاکستانی توپ خانے کا گنر تھا اب بھی بھارتی فوج کی قید میں ہے اور چندر نگر میں ہی ہے۔ اس سے پوچھ گچھ ہو رہی ہے۔ کیپٹن سانیال کہہ رہا تھا کہ ہم اس قیدی سے رانی توپوں کے بارے میں سب کچھ معلوم کر لیں گے۔“

یہ میرے لئے بڑی اہم خبر تھی۔ میں نے پنکج بابو کو مزید کریدنا چاہا۔ میں نے پوچھا۔

”کیا چندر نگر میں کوئی فوجی چھاؤنی ہے؟“

وہ بولا۔

”فوجی چھاؤنی نہیں ہے مہاراج! وہاں انڈین آرمی کی ایک آرٹلری رجمنٹ کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ میرا بھانجہ کیپٹن سانیال چونکہ آرٹلری رجمنٹ کے کمانڈنگ آفیسر کا اے ڈی ہے اس لئے اسے پاکستانی فوج کی آرٹلری رجمنٹ کے قیدی سے انٹروگیشن کے لئے چندر نگر بھیجا گیا ہے۔ تاکہ وہ اس سے پوری انفارمیشن لے کر اس کی فل رپورٹ تیار کر کے کمانڈنگ آفیسر کو پیش کرے۔“

میں خدا کی قدرت پر حیران ہو رہا تھا کہ کس طرح پاک فوج کے ایک زخمی جنگی قیدی کے بارے میں مجھے فل رپورٹ پوری تفصیل کے ساتھ مل رہی تھی۔ اگر میری ملاقات پنکج بابو سے نہ ہوتی اور میں اسی رات کشمیری مسلمانوں کے قاتل کو جہنم میں پہنچانے کے بعد پنکج بابو کے گھر نہ جاتا تو مجھے کبھی بھی علم نہیں ہو سکتا تھا کہ پاک فوج کا ایک زخمی فوجی اس وقت کلکتہ کے قریب ایک شہر چندر نگر میں قید ہے اور بھارتی فوج کے ظلم و ستم کا نشانہ بنا ہوا ہے۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ میرا اگلا کمانڈو مشن پاک فوج کے اس غیور جوان کو انڈین آرمی کے ٹارچر سیل میں سے نکال کر پاکستان پہنچانا ہو گا۔

اس مشن کی کامیابی کے لئے چندر نگر میں کیپٹن سانیال سے میل ملاقات اور اس کا اعتماد حاصل کرنا ضروری تھا۔ اور یہ سب قدرت نے پنکج بابو کی فیملی سے میرے تعلقات کی شکل میں پیدا کر دیا ہوا تھا۔ میں نے جان بوجھ کر گفتگو کا موضوع بدل دیا اور اوما کمار

بیماری کے بارے میں باتیں شروع کر دیں۔ میں نے ان لوگوں کو بتایا کہ ان کی بیٹی کو بیماری سے ہمیشہ کے لئے نجات مل چکی ہے۔ اس طرح میں ان کے دل میں اپنی عقیدت کو مزید ابھارنا چاہتا تھا۔ پھر میں چندر نگر کی باتیں کرنے لگا۔ میں نے کہا۔

”میرا ارادہ ابھی واپس پنجاب جانے کا نہیں ہے۔ سوچتا ہوں کچھ روز چندر نگر میں قیام کروں اور اس شہر کو دیکھو جو آزادی ملنے تک فرانس کے قبضے میں تھا۔“

پنکج بابو نے فوراً کہا۔

”یہ تو بڑی اچھی بات ہے مہاراج! آپ چندر نگر کی سیر ضرور کریں۔ آج کل اپنا بھانجہ کیپٹن سانیال وہیں ہے۔ میں اسے فون کر دوں گا۔ آپ جتنے دن چاہیں اس کے پاس جا کر ٹھہریں۔ وہ خود آپ کو چندر نگر کی سیر کرائے گا۔“

میں یہی چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔

”آپ سانیال بابو کو فون کر کے میرے بارے میں بتا دیں۔ میں سوچتا ہوں کہ آج رات کو ہی چندر نگر چلا جاؤں۔ کیونکہ پھر مجھے واپس پنجاب بھی جانا ہے۔“

”میں اسے ابھی فون کئے دیتا ہوں“

یہ کہہ کر پنکج بابو نے اپنی بیٹی کو اشارہ کیا۔ اس نے کارنس پر رکھا ہوا ٹیلی فون لا کر پنکج بابو کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ پنکج بابو نمبر ڈائیل کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اسے چندر نگر کا ملٹری ایکسچینج مل گیا اور کیپٹن سانیال سے بھی رابطہ قائم ہو گیا پنکج بابو نے کیپٹن سانیال کے آگے ایسے عقیدت بھرے الفاظ میں میرا غائبانہ تعارف کرایا جیسے میں نے ان کے اجڑے ہوئے گھر کو پھر سے آباد کر دیا ہے۔ یہ تعارف میرے حق میں بڑا مفید تھا۔ پنکج بابو نے فون پر کیپٹن سانیال سے بات بھی کرا دی۔ وہ بڑی عقیدت اور عاجزی کے ساتھ بولا۔

”مہاراج جی! آپ جس وقت چاہیں آ جائیں۔ مجھے بڑی خوشی ہو گی۔“

جب یہ سارا معاملہ طے ہو گیا تو مجھے اب یہ معلوم کرنا تھا کہ اس علاقے میں پولیس کی ناکہ بندی اور چیکنگ کی کیا پوزیشن ہے۔ کیونکہ اب مجھے واپس بھی جانا تھا۔ میں نے

بڑے طریقے سے معلوم کیا کہ پولیس علاقے میں ضرور موجود ہے مگر چیکنگ نہیں ہو
رہی۔ میں سوچنے لگا کہ کیا دن کی روشنی میں میرا باہر نکلنا اور اپنے جاسوس شاہ دین کی
کمیں گاہ تک جانا مناسب رہے گا یا نہیں؟ آخر میں نے فیصلہ کر لیا کہ دن یہیں گزارا
جائے اور جب رات کا اندھیرا چھانے لگے تو اس وقت باہر نکلا جائے۔

میں نے اوما کماری کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"اوما جی! ہم آج تمہارے ہاتھ کی پکی ہوئی بھجیا کھائیں گے۔"

اوما کماری بولی۔

"مہاراج! یہ میرے دھن بھاگ ہیں"

سارے گھر والے میرے اس فیصلے سے بے حد خوش ہوئے کہ میں سارا دن ان کے
پاس گزاروں گا۔ اوما کماری نے بڑی عقیدت کے ساتھ مختلف سبزیوں کی بھجیا بنائی۔ دوپہر
کو کھانا کھانے کے بعد میں آرام کرنے کے لئے لیٹ گیا۔ ساری رات کا جاگا تھا۔ لیٹتے ہی
نیند آ گئی۔ آنکھ اس وقت کھلی جب سورج غروب ہو رہا تھا۔ میں نے جلدی سے اٹھ کر
دیوار پر لگے کلاک کو دیکھا۔ پھر کمرے کا جائزہ لیا۔ میں پنکج بابو کے گھر پر ہی تھا۔ اصل
میں کمانڈو اپنے مشن کے دوران کبھی غافل نہیں ہو سکتا۔ ایک لمحے کی غفلت اس کے
مشن کو ہی نہیں بلکہ اس کی زندگی کو بھی ختم کر سکتی ہے۔ اور میں اپنی کمیں گاہ میں
نہیں تھا۔ کلکتے کے ہندو بنگالی گھر میں تھا۔ باہر پولیس کی پکٹ لگی تھی۔ کچھ بھی ہو سکتا
تھا مگر میں غافل ہو کر سو گیا تھا۔

جب میں نے دیکھا کہ میں جس گھر میں سویا تھا اسی گھر میں ہوں تو خدا کا شکر ادا کیا۔
اوما کماری میرے لئے چائے لے کر آ گئی۔ جب شام ہو گئی تو میں نے ایک بار پھر چندر نگر
میں کیپٹن سانیال کا پورا ایڈریس پنکج بابو سے پوچھ کر کاغذ پر نوٹ کر لیا اور ان سے
اجازت لے کر گھر سے باہر نکل آیا۔ سڑک پر رات کا اندھیرا ہو رہا تھا۔ میں خاموشی سے
سر جھکائے ہوئے لیکن بڑی عیاری سے ماحول کا جائزہ لیتا سڑک پر سے گزرنے لگا۔
سڑک پر آتے ہی مجھے ایک موٹر رکشا مل گیا۔ میں اس میں بیٹھا اور ہوڑہ پل کی طرف

روانہ ہو گیا۔ میں نے دیکھ لیا تھا اور اطمینان کر لیا تھا کہ میرے پیچھے کوئی خفیہ پولیس والا
نہیں لگا تھا۔ دریا پار جاتے ہی میں نے رکشا چھوڑ دیا۔ کھیتوں اور اجاڑ جگہوں سے ہوتا ہوا
میں شاہ دین کی خفیہ کمیں گاہ جس کو وہ گودام کہتا تھا پہنچ گیا۔ میں نے اسے پنکج بابو کے گھر
سے ہی خفیہ کوڈ میں فون پر بتا دیا تھا کہ میں اندھیرا ہوتے ہی خفیہ کمیں گاہ میں پہنچ جاؤں
گا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ رات کے دس بجے آئے گا۔

میں اکیلا گودام کے کمرے میں چارپائی پر بیٹھا شاہ دین کا انتظار کرنے لگا۔ وہ کوئی
ڈیڑھ دو گھنٹوں کے بعد آیا۔ میں نے اسے بتایا کہ کشمیری مسلمانوں کے قاتل کو میں نے
ختم کر دیا ہے۔ وہ بولا۔

"مجھے شام کو ہی پتہ چل گیا تھا کہ فوجی فاؤنڈیشن کے دفتر کے باہر ایک ریٹائرڈ فوجی
اور اس کے باڈی گارڈ کو قتل کر دیا گیا ہے۔ ہم نے بے گناہ نہتے کشمیری مسلمانوں کے خون
کا بدلہ چکا دیا ہے۔ اب تمہارا کیا پروگرام ہے۔"

جب میں نے اسے بتایا کہ چندر نگر میں پاک فوج کا ایک زخمی سپاہی قید ہے اور اس
پر تشدد کر کے اس سے پاک آرٹلری کی رانی توپوں کے بارے میں پوچھ گچھ ہو رہی ہے تو
وہ کہنے لگا۔

"ستمبر کی جنگ میں تو بھارتی فوج کے بے شمار فوجی پاکستان نے قیدی بنا لئے تھے۔
پاکستان کا تو کوئی بھی فوجی انڈین آرمی کا قیدی نہیں بنا۔ یہاں کلکتے میں تو سبھی یہی کہتے
تھے۔"

میں نے کہا۔

"یہ جوان پاک فوج کی توپ خانے کا جوان ہے اور چونڈہ کے محاذ پر دونوں طرف کی
اندھا دھند گولہ باری میں زخمی ہو گیا تھا اور ہندوستانی فوج کے آدمی اسے اٹھا کر پیچھے لے
آئے تھے۔ یہ تو اس سے ملنے کے بعد ہی پتہ چل سکے گا کہ وہ زخمی ہونے کے بعد اپنی
پوزیشنوں میں واپس کیوں نہیں چلا گیا۔"

شاہ دین کہنے لگا۔

"اس جوان کو ہندو وحشیانہ ٹارچر سے بچانا ہمارا فرض ہے۔ جس طرح بھی ہو ا
چندر نگر سے اپنے ساتھ بھگا کر یہاں لے آؤ۔ کیا تم پہلے کبھی چندر نگر گئے ہو؟"
میں نے کہا۔
"میں چندر نگر پہلے کبھی نہیں گیا۔ مگر میں نے اس چھوٹے سے شہر کی تعریف ض
سن رکھی ہے۔"
شاہ دین بولا۔
"چندر نگر پر بھارت کے آزاد ہونے کے بعد بھی کچھ عرصہ فرانس کی حکومت کا ق
رہا تھا۔ یہ فرانس کی واحد نو آبادی تھی جو ہندوستان میں ابھی تک قائم تھی۔ پھر بھا
حکومت نے فرانس کی حکومت کے ساتھ گفت وشنید سے طے کیا کہ فرانس کو بھارت
شہر پر اپنا قبضہ ختم کر کے واپس چلے جانا چاہئے۔ فرانس کی حکومت نے اسے تسلیم کر لیا
چندر نگر سے اپنا جھنڈا اور بوریا بستر لپیٹ کر واپس چلی گئی۔ اب چندر نگر آزاد ہ
بھارت کا حصہ ہے۔ تم ہوڑہ سے نہیں بلکہ کلکتے کے سیالدہ سٹیشن سے چندر نگر کے ل
گاڑی پکڑو گے۔ یہاں سے زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔ ایک گھنٹے میں تم چندر نگر پہنچ
گے۔"
میں نے کہا۔
"میں صبح منہ اندھیرے چلے جانا چاہتا ہوں"
شاہ دین بولا۔
"مجھے معلوم نہیں کہ اس وقت کوئی گاڑی چندر نگر جاتی ہے یا نہیں۔"
میں نے کہا۔
"اگر تھوڑی دیر بعد جاتی ہو گی تو میں وہاں انتظار کر لوں گا۔"
شاہ دین نے بڑی عقل کی بات مجھے سمجھائی۔ اس طرف میرا خیال نہیں گیا تھا۔
لگا۔
"تم کلکتے میں دو آدمی قتل کر چکے ہو اور تمہارے بیان کے مطابق خفیہ پ

والے نے اور صوبیدار درگاداس کے باڈی گارڈز نے تمہاری شکل دیکھی ہوئی ہے اور
چندر نگر کلکتے سے کوئی دور پار کا علاقہ نہیں ہے وہاں بھی کلکتے کی ہی پولیس ہے۔ اگر تم
پہچانے گئے تو لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔ میرا خیال ہے تم حلیہ بدل کر وہاں جاؤ۔"
میں نے کہا۔
"لیکن میں ڈاڑھی مونچھیں نہیں منڈوا سکتا۔ پنکج بابو نے کیپٹن سانیال کو میرے
بارے میں بتایا ہے کہ"
شاہ دین نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔
"اس نے ٹیلی فون پر کیپٹن سانیال کو یہ تو نہیں بتایا کہ تمہاری لمبی ڈاڑھی بھی ہے۔
تم ڈاڑھی صاف کر ڈالو۔ اس طرح تمہاری شکل میں کافی فرق پڑ جائے گا"
شاہ دین کا مشورہ بڑا مناسب تھا۔ میں نے وہیں قینچی لے کر اپنی ڈاڑھی مونچھوں
کے بال کافی حد تک کاٹ دیئے شاہ دین نے میری طرف دیکھ کر کہا۔
"زیادہ فرق نہیں پڑا۔ اسے اور کاٹو"
میں نے ڈاڑھی مونچھوں کے بال کاٹ کر بڑے چھوٹے چھوٹے کر لئے اور سر کے
بال بھی پیچھے سے کافی کاٹ ڈالے۔ جیکٹ پتلون کی جگہ کھدر کا لمبا کرتہ اور پاجامہ پہن
لیا۔ گلے میں کھدر کا تھیلا لٹکا لیا۔ زہریلی سوئیوں والا بال پوائنٹ میں نے کرتے کی بغلی
جیب میں سنبھال کر رکھ لیا تھا۔ کھدر کے تھیلے میں رومال ٹوتھ پیسٹ برش وغیرہ ڈال لیا۔
شاہ دین کہنے لگا۔
"اب تم کو پہچاننا آسان نہیں رہا۔ ڈاڑھی والے حلیے کے ساتھ تو پولیس تمہیں
فوراً پہچان سکتی تھی۔"
شاہ دین اس رات خفیہ کمیں گاہ میں ہی رہا۔ صبح صبح ہم وہاں سے چل پڑے۔ شاہ
دین نے مجھے کلکتے کے دوسرے بڑے سٹیشن سیالدہ پر اتار دیا اور خود آگے چل دیا۔
سیالدہ سٹیشن بھی کلکتے کے ہوڑہ سٹیشن کی طرح ہی تھا۔ لمبے لمبے کشادہ پلیٹ فارم۔ اونچی
آہنی چھت۔ ہر پلیٹ فارم پر گول بڑی گھڑی لگی تھی۔ ایک دو گاڑیاں کھڑی تھیں۔

اگرچہ ابھی صبح نہیں ہوئی مگر سٹیشن پر کافی مسافر نظر آرہے تھے۔
گاڑی رات سات بجے جاتی ہے۔ یہ وقت میں نے وہیں پلیٹ فارم پر گزار دیا۔ میرا
بدل چکا تھا۔ اس لئے مجھے پولیس کی نظروں میں آنے کی زیادہ فکر نہیں تھی۔ اس
باوجود میں غافل نہیں تھا۔ انگریزی کا ایک اخبار میں نے خرید لیا تھا اور پلیٹ فارم پر بیٹھ
کر اس کو پڑھنے میں مصروف تھا اور دس دس سیکنڈ بعد نظریں گھما کر ارد گرد کا جائزہ
لیتا تھا۔

نو بجے گاڑی چلی۔ اس نے ایک گھنٹے سے بھی پہلے مجھے چندر نگر پہنچا دیا۔ میں سٹ
سے باہر نکلا تو مجھے انگریزی طرز کے کاٹج نما مکان اور چھتے ہوئے فٹ پاتھوں والی دکا
نظر پڑیں۔ کئی دکانوں کے باہر ابھی تک ہندی بنگلہ کے ساتھ فرانسیسی میں لکھے ہوئے ب
بھی لگے تھے۔ شہر پر فرانسیسی تہذیب و تمدن کا گہرا اثر نظر آرہا تھا۔ پنکج بابو نے مجھے کپ
سانیال کا جو ایڈریس دیا تھا وہ کاغذ پر لکھا ہوا میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے ایک ٹیکس
والے کو ایڈریس دکھا کر کہا۔

"تم انگریزی پڑھ لیتے ہو؟"

معلوم ہوا کہ ٹیکسی ڈرائیور صرف انگریزی ہی نہیں فرانسیسی زبان بھی لکھ پڑھ ا
بول لیتا ہے۔ میں ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ ٹیکسی بتائے ہوئے ایڈریس کے مطابق ایک طر
چل پڑی۔ بازاروں میں پیرس کی طرز کی چھوٹی چھوٹی پیلے رنگ کی ٹیکسیاں ابھی تک
نظر آ رہی تھیں۔ ڈرائیور بھی وردی پوش تھے۔ راستے میں دو تین وائین کی دکا
گزریں۔ شراب کی دکانیں تو بھارت کے ہر شہر میں تھیں مگر خاص طور پر وائین
دکانیں میں نے چندر نگر میں ہی دیکھیں۔ اس کی وجہ بھی فرانسیسی تہذیب و تمدن کا اثر
فرانس میں یورپ کے دوسرے ممالک کی طرح تقریبات میں وائین کو بڑی اہمیت دی
ہے۔

میرے پاس کیپٹن سانیال کے مکان کا ایڈریس تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ اپنے
میں جا چکا ہو گا مگر وہ مجھے گھر پر ہی مل گیا۔ نوجوان دبلا پتلا سمارٹ قسم کا بنگالی نوجوان

معلوم ہوا کہ چندر نگر دی پہن کر گھر سے نکلنے ہی والا تھا۔ اس کا مکان دریا کے کنارے ایک مختصر سا
بصورت کاٹج تھا۔ آگے پیچھے باغیچہ تھا جس میں ہر طرح کے پیڑ پودے لگے تھے۔
برآمدے میں بھی پھولدار گملے لٹک رہے تھے۔ میں نے اپنا تعارف کرایا تو اس نے جھک کر
میرے پاؤں چھوئے اور ہاتھ باندھ کر بولا۔

"مہاراج آپ کے آنے سے میرے بھاگ جاگ اٹھے ہیں۔ اس گھر کو اپنا ہی گھر
سمجھیں۔ میں ابھی آفس جا رہا ہوں۔ مگر میں جلدی آجاؤں گا۔ نوکر وغیرہ یہاں آپ کی
سیوا کے لئے موجود ہیں۔ جس چیز کی ضرورت ہو انہیں آرڈر کر دیجئے گا۔"

اس کی ملٹری سٹاف کار باہر کھڑی تھی۔ اردلی بھی اٹن شن کھڑا تھا۔ میں نے کہا۔

"شکریہ کیپٹن صاحب!"

کیپٹن سانیال میرے پاؤں چھو کر چلا گیا۔ میں نے ڈرائنگ روم کے باتھ روم میں
جا کر سب سے پہلے اپنا حلیہ دیکھا۔ کل جو میرا حلیہ تھا آج اس کے مقابلے میں کافی بدلا ہوا
تھا۔ میری کچھ تسلی ہو گئی۔ ایک نظر دیکھنے سے میں آسانی سے پہچانا نہیں جا سکتا تھا۔ میں
نے بالوں میں کنگھی پھیری اور ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گیا۔

بنگالی نوکر نے آ کر چائے کافی کا پوچھا۔ میں نے کافی منگوائی اور ڈرائنگ روم کی کھڑکی
کے سامنے صوفے پر بیٹھ کر کافی پینے اور سوچنے لگا کہ پاک فوج کا قیدی یہاں کس جگہ پر
ہو سکتا ہے۔ اتنے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ٹیلی فون میرے پاس ہی تپائی پر پڑا تھا۔ میں
نے اٹھا لیا۔ دوسری طرف سے کسی لڑکی کی شیریں آواز آئی۔ اس نے پوچھا۔

"کیپٹن صاحب ہیں؟"

یہ جملہ اس نے بنگلہ زبان میں بولا تھا۔ اتنی بنگلہ میں سمجھ لیتا تھا۔ میں نے انگریزی
میں کہا۔

"وہ ابھی آفس گئے ہیں"

لڑکی کو میری آواز اجنبی لگی اور انگریزی نے بھی اس پر اثر ڈالا۔ بڑے محتاط لہجے
میں انگریزی میں ہی اس نے پوچھا کہ میں کون ہوں؟ میں نے جواب دیا۔

"میں ان کا ایک دوست بول رہا ہوں"

لڑکی نے شکریہ کہا اور ٹیلی فون بند ہو گیا۔

ڈرائنگ روم میں ایک جگہ دیوار پر مہاتما گاندھی اور پنڈت نہرو کی تصویریں تھیں۔ میں ٹہلتے ٹہلتے کیپٹن کے بیڈ روم میں چلا گیا۔ بڑا عیش عشرت والا بیڈ روم ڈبل بیڈ بچھا تھا حالانکہ پنکج بابو کی زبانی مجھے معلوم ہوا تھا کہ کیپٹن سانیال کی ابھی نہیں ہوئی۔ دیوار پر آمنے سامنے نیم عریاں عورتوں کی پینٹ کی ہوئی تصویریں سجی تھ میں واپس آ کر ڈرائنگ روم میں بیٹھ گیا اور وہاں پڑے ہوئے اخبار دیکھنے لگا۔ انگریزی ایک اخبار کے آخری صفحے پر ملٹری فاؤنڈیشن کے باہر صوبیدار درگاداس اور اس کے گارڈ کی خبر چھپی ہوئی تھی۔ کسی کی تصویر ساتھ نہیں تھی۔ میں نے اس خبر کو غو پڑھا۔ خبر میں یہی لکھا تھا کہ فوج کے ریٹائرڈ صوبیدار درگاداس کو کشمیری کمانڈوز نے کیا ہے۔ ابھی تک کشمیری حریت پرستوں نے اس قتل کی ذمے داری قبول نہیں پولیس اور ملٹری پولیس سرگرمی سے قاتل کو تلاش کر رہی ہے۔ یہ اسی روز کا اخبار دوسرے اخبار بنگلہ زبان کے تھے۔ ظاہر تھا ان میں بھی یہ خبر ضرور چھپی ہو گی۔

گیارہ بجے کے بعد کیپٹن سانیال آ گیا۔ آتے ہی ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"مہاراج! کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟"

میں نے کہا۔

"ارے نہیں سانیال جی! میں تو بڑے مزے سے رہا ہوں یہاں۔ بس اب وقت کر مجھے چندر نگر کی سیر کرا دیں۔ اسی غرض سے میں یہاں آیا ہوں"

کیپٹن سانیال میرے سامنے ادب سے بیٹھ گیا۔ کہنے لگا۔

"مہاراج آپ نے اوما کماری کو اچھا کر کے ہماری فیملی پر جو احسان کیا ہے ہم کبھی نہیں بھول سکیں گے۔"

میں نے کہا۔

"وہ تو میرا فرض تھا کیپٹن صاحب۔"

پھر میں نے اسے بتایا کہ ایک لڑکی کا فون آیا تھا

"اس نے نام بتایا تھا مہاراج؟"

میں نے کہا۔

"نہیں نام نہیں بتایا تھا۔ تمہارا پوچھا تھا میں نے کہا کیپٹن صاحب آفس گئے ہوئے ہیں"

بنگالی کیپٹن کے چہرے پر خوشگوار سی مسکراہٹ پھیل گئی بولا۔

"کانتا ہو گی"

پھر یہ کہہ کر دوسرے کمرے کی طرف چلا گیا کہ مہاراج میں کپڑے بدل لوں۔ پھر شہر کی سیر کو چلتے ہیں۔ میں نے گاڑی اسی لئے واپس نہیں جانے دی۔

تھوڑی دیر بعد میں کیپٹن سانیال کے ساتھ سٹاف کار میں بیٹھا چندر نگر کے بیرونی علاقوں سے گزر رہا تھا۔ دریائے ہگلی چندر نگر شہر کے پہلو میں بہتا ہے۔ گھاٹ پر آ... نے ایک کشتی لی اور دریا کی سیر کرنے لگے۔ کیپٹن سانیال نے کہا۔

"مہاراج! پنکج بابو نے فون پر مجھے بتایا تھا کہ آپ وید بھی ہیں اور جوتش کا گیان رکھتے ہیں۔"

میں اس بنگالی کیپٹن کو کسی لالچ میں پھانسا چاہتا تھا۔ اس نے خود ہی مجھے اس کا م... مہیا کر دیا تھا۔ میں نے کہا۔

"سانیال جی! اصل میں تو میں جوتشی ہی ہوں۔ آئیور وید کا علم تو میں نے اپنے ... کے واسطے حاصل کیا تھا۔ ذرا ہاتھ دکھاؤ اپنا"

اس نے فوراً اپنا ہاتھ میرے آگے کر دیا۔ کسی بھی جوتشی کو ہاتھ دکھانا اور قسمت ... حال معلوم کرنا انسان کی بڑی کمزوری ہوتی ہے۔ میں اس کی ہتھیلی کی لکیروں کو یونہی ... سے دیکھنے لگا۔ حالانکہ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ ان آڑھی ترچھی لکیروں کا کوئی مط... بھی نکلتا ہے یا نہیں۔ میں نے اداکاری کرتے ہوئے اپنے چہرے پر حیرت اور تعجب ... تاثرات لاتے ہوئے کہا۔

"کیپٹن سانیال! تمہارا ہاتھ بہت کچھ بتا رہا ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ بہت ... تمہاری زندگی میں ایک ایسا حادثہ ہونے والا ہے جو تمہاری زندگی میں زبردست انق... لائے گا۔ فکر نہ کرو۔ یہ انقلاب بڑا خوشگوار ہو گا۔"

"اچھا مہاراج؟"

بنگالی کیپٹن بہت خوش ہوا۔

"مہاراج! یہ حادثہ کب ہو گا؟"

میں نے اس کی ہتھیلی کو ادھر ادھر سے دباتے ہوئے کہا۔

"مگر تمہاری راہ میں ایک بہت بڑی رکاوٹ بھی ہے۔ جب تک یہ رکاوٹ دور نہیں ہو گی تم زندگی کی بلندیوں تک نہیں پہنچ سکو گے۔"

بنگالی کیپٹن فکر مند ہو گیا۔ بولا۔

"مہاراج! یہ رکاوٹ کیسے دور ہو گی؟"

میں نے اس کی ہتھیلی کو بند کرتے ہوئے کہا۔

"اس کی تم چنتا نہ کرو۔ یہ رکاوٹ ہم دور کر دیں گے۔ مگر ابھی نہیں۔ آج چندر ماں کی کتنی تاریخ ہے؟"

اس نے کچھ سوچ کر کہا۔

"شاید چھٹی تاریخ ہے"

میں نے کہا۔

"ہمارے گورو جی نے ہمیں تاکید کی ہوئی ہے کہ چندر ماں کی پندرہ تاریخ تک ایسا زائچہ نہیں بنانا جیسا زائچہ تمہارا بنے گا۔"

کیپٹن سانیال نے عاجزی سے کہا۔

"مہاراج! پلیز آپ اتنے دن میرے پاس ہی ٹھہریں"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"فکر نہ کرو جب تک ہم تمہارا زائچہ بنا کر تمہاری جنم ریکھا کے آگے آئی ہوئی خطرناک رکاوٹ کو دور نہیں کر دیں گے واپس نہیں جائیں گے"

کیپٹن سانیال نے ہاتھ جوڑ دیئے۔

"مہاراج! آپ کی یہ مجھ پر بڑی کرپا ہو گی۔ جس طرح آپ نے اوما کماری کی بیماری

ختم کر دی ہے اسی طرح میری ترقی کی راہ میں جو رکاوٹ کھڑی ہے اسے بھی ہمیشہ کے لئے دور کر دیجئے گا"

میں نے کہا۔

"بھگوان نے چاہا تو ایسا ہی ہو گا۔"

کیپٹن سانیال میرے ہتھے چڑھ چکا تھا۔ اب مجھے اس سے یہ معلوم کرنا تھا کہ پاک فوج کا قیدی کس جگہ پر قیدی بنا کر رکھا گیا ہے۔ چنانچہ میں نے موضوع بدلتے ہوئے جنگ ستمبر کی باتیں شروع کر دیں۔ میں نے انڈین آرمی کی بڑی تعریف کی۔ کیپٹن سانیال بھی انڈین آرمی کی بہادری کی جھوٹی سچی باتیں سنانے لگا۔ میں نے کہا۔

"مگر پنجاب میں لوگ کہتے تھے کہ ہماری بھارتی فوج کی پلٹنوں کو پاکستانی فوج نے قیدی بنایا تھا مگر پاکستانی فوج کے سپاہیوں کو ہم قیدی نہیں بنا سکے"

میں نے بنگالی ہندو کیپٹن کی دکھتی ہوئی رگ پر انگلی رکھ دی تھی۔ اس نے فوراً کہا۔

"ایسی بات نہیں ہے۔ مہاراج! یہ ٹھیک ہے کہ ہمارے فوجی زیادہ تعداد میں پاکستان نے قید کئے لیکن ہم نے بھی پاکستانی فوجیوں کو قیدی بنایا تھا۔ ایک قیدی تو اس وقت بھی ہماری قید میں ہے"

میں نے کہا۔

"لیکن جنگ کے بعد جب دونوں فوجوں کے قیدیوں کا تبادلہ ہوا تھا تو سارے قیدی اپنے اپنے ملک میں واپس چلے گئے تھے۔ پھر یہ پاکستانی قیدی ابھی تک ہماری قید میں کیوں ہے؟"

کیپٹن سانیال کہنے لگا۔

"مہاراج! یہ پاک فوج کی ایک آرٹلری بٹالین کا سپاہی ہے۔ وہ بتاتا نہیں لیکن ہمیں یقین ہے کہ وہ پاکستانی آرٹلری کی مشہور رانی توپ کا گنر (توپچی) ہے ہم اس سے رانی توپوں کے بارے میں خاص معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ جنگی قیدیوں کے تبادلے کے وقت ہم نے اس پاکستانی فوجی قیدی کو جان بوجھ کر واپس نہیں کیا تھا اور پنجاب سے اٹھا

چندر نگر لے آئے تھے۔"

میں نے مصنوعی اشتیاق کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"کیپٹن سانیال جی! اس ملیچھ مسلمان فوجی کو جتنا ٹارچر کر سکتے ہو کرنا۔ میں تو پاکستانی کا جانی دشمن ہوں۔ کیا اس نے ابھی تک آپ کو کچھ نہیں بتایا؟"

کیپٹن سانیال نے نفی میں سر ہلا کر کہا۔

"مہاراج! یہ مسلمان بھگوان جانے کس مٹی سے بنے ہوئے ہوتے ہیں ان پر کوئی اثر نہیں کرتا۔ یہ پاکستانی قیدی بھی کچھ نہیں بتاتا۔ اس پر ہم نے بڑا ٹارچر کیا ہے مگر اپنے خدا کو یاد کرتا رہتا ہے اور اونچی اونچی آواز میں نعرے لگاتا ہے لیکن بتاتا کچھ نہیں۔"

میں نے کہا۔

"تم مجھے اس کے پاس لے چلو۔ میرے پاس میرے گورو جی کا دیا ہوا ایسا منتر ہے کہ میں اسے پانی پر پھونک کر اسے اپنے ہاتھ سے پلاؤں تو وہ سب کچھ اپنے آپ بتا دے"

کیپٹن سانیال میرے جال میں آ گیا۔ اسے آنا ہی تھا۔ اسے پنکج بابو اس کے ماموں نے بتایا تھا کہ میری دوائی سے اوما کماری کی لاعلاج بیماری جاتی رہی تھی۔ وہ ایک لمحے کے لئے چپ ہو گیا۔ کشتی اس وقت دریا کے کنارے کی طرف آ رہی تھی۔ کہنے لگا۔

"مہاراج! مجھے اس کی اجازت نہیں ہے مگر میں اپنے آفیسر کمانڈنگ سے بات کر کے آپ کو بتاؤں گا۔"

میں نے اپنی طرف سے لاپروائی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"یہ میں اپنی بھارتی فوج کی بھلائی کے لئے کروں گا ورنہ مجھے کسی پاکستانی قیدی سے ملنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ اگر تمہارا کمانڈنگ آفیسر نہ مانا تو اسے ہرگز مجبور نہ کرنا"

اس کے بعد کیپٹن سانیال نے اس موضوع پر کوئی بات نہ کی شام کو وہ مجھے چندر نگر ایک کلب میں لے گیا۔ جہاں شہر کی اعلیٰ سوسائٹی کے سول اور فوجی افسر اپنی بیگمات

کے ساتھ موجود تھے۔ کئی دوسری خوش لباس خوش ادا حسین لڑکیاں بھی تتلیوں کی منڈلاتی پھر رہی تھیں۔ کافی بھی پی جا رہی تھی اور شراب کے جام بھی لنڈھائے جا تھے۔ کلب کی نیم روشن فضا شراب' تمباکو اور طرح طرح کے پرفیومز کی خوشبوؤں بوجھل ہو رہی تھی۔ میں بہت محتاط ہو گیا۔ کیونکہ وہاں پولیس کے افسروں کی موجودگی یقینی تھی اور اس اعتبار سے انٹیلی جینس کے آدمیوں کا ہونا بھی لازمی تھا۔

کیپٹن سانیال نے میرا کچھ فوجی اور سول افسروں سے تعارف بھی کرایا۔ جب لوگوں کو پتہ چلا کہ میں جوتشی بھی ہوں تو ہر افسر مجھے ہاتھ دکھانے لگا۔ میں نے سب تھوڑا تھوڑا جو جی میں آیا بتا دیا اور کیپٹن سانیال سے کہا۔

"سانیال بابو! یہاں ہمارا جی گھبراتا ہے ہم سنیاسی لوگ ہیں۔ ہمیں تو گھر پہنچا دو۔"

دراصل میں نے محسوس کیا تھا کہ کچھ افسر قسم کے پرانے خرانٹ چہروں والے مجھے گہری نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ چنانچہ بہتر یہی تھا کہ میں وہاں سے نو دو گیارہ جاؤ۔ کیپٹن سانیال نے اپنے اردلی سے کہا کہ ڈرائیور سے کہو گورو جی کو گھر چھوڑ آ پھر میری طرف متوجہ ہو کر بڑے معذرت خواہ لہجے میں ہاتھ باندھ کر کہنے لگا۔

"مہاراج مجھے شما کر دیں۔ میں خود آپ کو لے کر جاتا لیکن یہاں کچھ دیر بیٹھنا سمجھ لیں کہ میری ڈیوٹی میں شامل ہے۔"

ڈرائیور مجھے کیپٹن کے مکان پر چھوڑ کر چلا گیا۔ رات کو کیپٹن سانیال دیر سے میرے لئے ایک کمرے میں بستر لگا دیا گیا تھا۔ میں اپنے بستر پر نیم دراز انگریزی کی کتاب پڑھ رہا تھا کہ کیپٹن سانیال اندر آ کر میرے قریب کرسی پر بیٹھ گیا۔ کہنے لگا۔

"آپ کے جانے کے بعد ہمارے اوسی صاحب کلب میں آ گئے۔ میں نے ان پاکستانی قیدی سے آپ کی ملاقات کی بات کی تو انہوں نے پہلے تو میری بات نہ سنی بھی تو کوئی توجہ نہ دی۔ جب میں نے کہا کہ گورو جی کے منتروں اور دوائی کا چمتکار فیملی کے لوگ دیکھ چکے ہیں تو انہوں نے اجازت دے دی۔ مگر یہ ملاقات تھوڑی د لئے ہو گی اس سے زیادہ کی مجھے اجازت نہیں مل سکی"

مجھے تو صرف وہ جگہ دیکھنی تھی جہاں پاک فوج کا غازی قید و بند کی اذیتیں برداشت کر رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"میں خود دشمن کے پاس زیادہ دیر نہیں بیٹھنا چاہتا۔ بس اپنے ہاتھ سے اسے پانی میں گھول کر سفوف پلاؤں گا۔ اس کے ساتھ ہی اس پر نیم بے ہوشی طاری ہو جائے گی۔ اور پھر مجھے یقین ہے کہ تم اس سے جو پوچھو گے وہ سب کچھ اپنے آپ بتانا شروع کر دے گا"

حالانکہ مجھے معلوم تھا کہ ایسا ہرگز نہیں ہو گا۔ کیپٹن سانیال بولا۔

"بس صبح آپ میرے ساتھ بٹالین ہیڈ کوارٹر چلیں گے۔ میں خود آپ کی ملاقات پاکستانی فوج کے توپچی سے کراؤں گا۔"

میں دل میں حیران بھی تھا کہ رانی توپ کا توپچی ان لوگوں کے ہاتھ کیسے آ گیا۔ رانی توپیں دور مار توپیں تھیں اور جنگ ستمبر میں انہیں محاذ سے بہت پیچھے رکھا گیا تھا۔ بہرحال میں اگلے دن کے انتظار میں تھا۔

دوسرے دن کیپٹن سانیال نے میرے ساتھ ہی ناشتہ کیا اور مجھے اپنے ساتھ فوجی گاڑی میں بٹھا کر اپنے بٹالین یا رجمنٹل ہیڈ کوارٹر لے گیا۔ یہاں اس کا آفس تھا۔ کچھ دیر میں اس کے آفس میں بیٹھا کافی پیتا رہا۔ اس دوران کیپٹن سانیال شاید پاک فوج کے جنگی قیدی سے میری ملاقات کے کچھ انتظامات میں لگا رہا۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد آیا اور مسکراتے ہوئے بولا۔

"چلئے مہاراج! آپ کو دشمن کے جنگی قیدی سے ملاتے ہیں۔ بھگوان کرے کہ آپ کے منتروں کا اس پر اثر ہو جائے اور وہ ہمیں وہ تمام معلومات حاصل ہو جائیں جو ہم اس سے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔"

میرا خیال تھا کہ قیدی کو وہیں ہیڈ کوارٹر کے کسی تہہ خانے میں رکھا گیا ہو گا۔ مگر وہ وہاں نہیں تھا۔ کیپٹن سانیال نے مجھے گاڑی میں بٹھایا اور گاڑی ہیڈ کوارٹر سے نکل کر دریا کے ساتھ ساتھ جانے والی سڑک پر چل پڑی۔ چندر نگر کوئی ایسا شہر نہیں ہے کہ جہاں کوئی جنگل وغیرہ یا پہاڑ ہوں۔ یہ میدانی علاقے کا ایک شہر ہے جو کلکتے سے شمال مغرب کی

جانب جہاں تک مجھے یاد ہے تیس بتیس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ دریائے ہگلی شہر کے بالکل ساتھ بہتا ہے۔ آس پاس کھیت بھی ہیں گھاس کے میدان بھی ہیں۔ آموں کے باغ بھی ہیں۔ چائے کے باغ تو نہیں مگر چائے پیک کرنے کے دو تین کارخانے ضرور تھے۔ وائین بنانے کی فیکٹری بھی تھی۔ چونکہ اس شہر کی کاروباری اعتبار سے کوئی اہمیت نہیں تھی اس لئے وہاں ماڈرن قسم کی اونچی عمارتیں اور شاپنگ سنٹر نہیں تھے۔ پرانی وضع کی کوٹھیاں اور مارکیٹیں تھیں۔ ہماری گاڑی شہر سے باہر نکل آئی تھی۔ کیپٹن سانیال گاڑی خود چلا رہا تھا۔ اردلی اور ڈرائیور ساتھ نہیں تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

”آپ لوگوں نے قیدی کو کسی دوسرے شہر میں رکھا ہوا ہے؟“

سانیال نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”نہیں سوامی جی! بس تھوڑی دور ہی جانا ہے۔ اصل میں جہاں ہم اس قسم کے جنگی قیدیوں سے پوچھ گچھ کرتے ہیں وہ جگہ ہم نے شہر سے باہر ایک پرانے محل کے کھنڈر میں بنائی ہوئی ہے۔“

میں خاموش رہا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے ایک اونچے ٹیلے پر ایک پرانی تاریخی عمارت دکھائی دی۔ قریب جا کر دیکھا تو یہ تاریخی عمارت کا کھنڈر ہی باقی رہ گیا تھا۔ احاطے میں بانس کا دروازہ بنا ہوا تھا۔ دریائے ہگلی عمارت کے ٹیلے کے پیچھے سے ہو کر گزر رہا تھا۔ یہ بنگال کے مسلمان نوابوں کے زمانے کی کوئی تاریخی عمارت تھی جو اب ویران پڑی تھی اور فوج نے اس پر قبضہ کر لیا ہوا تھا۔ پتھر کی سیڑھیاں اوپر عمارت کے دروازے تک جاتی تھیں۔ یہاں ایک فوجی سپاہی پہرے پر کھڑا تھا۔ کیپٹن سانیال مجھے ساتھ لے کر عمارت کے ویران برآمدے سے ہوتا ہوا ایک کمرے میں لے آیا۔ یہ فوجی دفتر تھا۔ یہاں کیپٹن نے ایک رجسٹر پر کچھ لکھ کر اپنے دستخط کئے۔ یہاں سے ایک فوجی ہمارے ساتھ ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں چابیوں کا گچھا تھا۔

اس جگہ آتے ہی میں نے ایک ایک چیز کا گہری نظر سے مشاہدہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ ہم تاریخی عمارت کے کھنڈر کے عقب کی طرف آ گئے تھے۔ یہاں سے نیچے دریا صاف نظر

آ رہا تھا۔ دوسرے کنارے کے درخت بھی دکھائی دے رہے تھے۔ دریا پر ایک بادبانی کشتی بہتی جا رہی تھی۔ اس جگہ بوسیدہ اور نیم روشن زینہ نیچے جاتا تھا۔ نیچے تہہ خانے کا دروازہ تھا۔ فوجی جو ساتھ آیا تھا اس نے چابی لگا کر دروازہ کھول دیا اور خود پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ تہہ خانے میں سے ہلکی ہلکی بیمار سی روشنی نکل رہی تھی۔ یہ بجلی کے کمزور بلب کی روشنی تھی۔ کیپٹن سانیال نے فوجی سے کہا کہ وہ پانی کا گلاس لے کر آئے۔ ہم تہہ خانے میں داخل ہو گئے۔ اس تہہ خانے میں فرش پر ٹاٹ بچھا تھا۔ ٹاٹ پر میں نے دیوار کا سہارا لئے ایک سانولے سے نوجوان کو دیکھا جس کی خاکی فوجی وردی میلی چکٹ ہو رہی تھی ڈاڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ چہرے پر خراشوں اور زخم کے نشان تھے۔ ہم اس کے قریب ہی ٹاٹ پر جا کر بیٹھ گئے۔ یہ پاک فوج کا غازی تھا جو بدقسمتی سے بھارتی فوج کی قید میں پھنس گیا تھا اور خدا جانے اس پر کس قدر وحشیانہ تشدد نہیں کیا گیا تھا۔ کیپٹن سانیال نے پاکستانی قیدی سے کہا۔

”یہ حکیم جی ہیں۔ تمہیں اپنے ہاتھ سے دوائی پلائیں گے۔ تم اچھے ہو جاؤ گے“

پاکستانی جوان نے سر دیوار سے ہٹا کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایمان کی وہ چمک تھی کہ مجھے یوں لگا جیسے میری آنکھوں کے سامنے بجلیاں چمک رہی ہوں۔ اس نے مجھے پنجابی میں گالی دی اور کہا۔

”میں کافر کی دوائی نہیں پیئوں گا۔ میں پاک فوج کا غازی ہوں۔ مر جاؤں گا پر کافر کے ہاتھ سے دوائی نہیں پیئوں گا۔“

اس دوران انڈین فوجی پانی کا گلاس لے کر آ گیا تھا۔ میں نے پانی کا گلاس اپنے سامنے رکھ لیا اور کیپٹن سانیال سے کہا۔

”سانیال بابو! آپ لوگ مجھے اور اس قیدی کو تھوڑی دیر کے لئے اکیلا چھوڑ دیں۔“

ساتھ ہی میں نے کیپٹن سانیال کو آنکھ ماری۔ مطلب یہ تھا کہ میں سارا معاملہ ٹھیک کر لوں گا۔ وہ فوجی سپاہی کو لے کر تہہ خانے سے باہر چلا گیا۔ میں نے اٹھ کر دروازہ بند کیا۔ اس خیال سے کہ وہ بند دروازے کے پیچھے کھڑا ہو کر ہماری گفتگو نہ سن لے۔ میں

نے یہ اطمینان ضرور کر لیا تھا کہ کیپٹن سانیال تہہ خانے کی سیڑھیوں میں بھی نہیں تھا۔ اوپر کسی جگہ کھڑا تھا۔ اس کے جاتے ہی میں نے جنگی قیدی سے کہا۔

"میں کوئی سوامی جی نہیں ہوں۔ میں مسلمان ہوں۔ پاکستانی ہوں اور تمہیں ی سے نکالنے کی کوشش کر رہا ہوں"

پاکستانی فوجی قیدی بڑی خاموشی سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر قسم کی مسرت یا خوشی کا تاثر نہیں تھا۔ کہنے لگا۔

"تم کافر ہو۔ بھیس بدل کر آئے ہو۔ تم چاہے کچھ کر لو۔ یاد رکھو۔ میں مر جاؤں گ اپنی فوج کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔"

مجھے فوراً احساس ہو گیا کہ اس شخص سے اس قسم کی باتیں میرے حق میں ا خطرناک ثابت ہو سکتی ہیں۔ اسے یہ بتانے کی بجائے کہ میں تمہیں یہاں سے نکا ہوں یہ زیادہ بہتر ہے کہ میں اسے نکال کر لے جاؤں۔ میں نے اسے پنجابی زبان میں ک

"مجھے اس کی پرواہ نہیں جوان کہ تم مجھے کیا سمجھ رہے ہو۔ بس ایک بات یا کیپٹن سانیال کو میں بلا رہا ہوں۔ جو کچھ میں نے تمہیں کہا ہے اس کا ایک لفظ بھی ہندو کپتان کو نہ بتانا۔"

میں فوراً اٹھا۔ دروازے کے پاس جا کر اوپر زینے کی طرف منہ کر کے کیپٹن کو آواز دے کر نیچے آنے کو کہا۔ کیپٹن سانیال فوراً نیچے آ گیا۔ میں نے اسے کہا۔

"سانیال بابو! یہ شخص پانی پینے پر رضامند نہیں ہو رہا"

اس نے کہا۔

"مہاراج! ہم اسے زبردستی پلا دیں گے۔ میں ابھی سپاہی کو بلاتا ہوں"

میں نے کہا۔

"نہیں۔ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ جب تک یہ ملیچھ قیدی اپنی مرضی ۔ نہیں پیئے گا اس پر دوائی کا اثر نہیں ہو گا میرے ساتھ آؤ۔"

میں نے اسے دروازے کے پاس زینے میں لے جا کر سمجھایا کہ میرے منتروں

کی پہلی شرط یہ ہے کہ اس کو آدمی اپنی مرضی سے پیئے۔ اگر اسے زبردستی پلایا گیا تو ئی اور منتروں کا اثر ضائع ہو جائے گا۔ میں نے اسے کہا۔

"میں کوئی اور طریقہ تلاش کروں گا۔ آؤ واپس چلتے ہیں۔"

کیپٹن سانیال خود بھی نہیں چاہتا تھا کہ میں وہاں زیادہ دیر ٹھہروں۔ اس کی ایک ہی تھی کہ یہ بات فوجی قوانین وضوابط کے خلاف تھی اور اس نے صرف اس خیال سے زت لے لی تھی کہ شاید اس طرح پاکستانی قیدی وہ سب کچھ بتا دے جس کی انہیں ورت تھی۔ جب اسے معلوم ہوا کہ ایسا نہیں ہو سکتا تو وہ مجھے ساتھ لے کر تہہ خانے ، نکل آیا۔ فوجی نے جو ہمارے ساتھ آیا تھا تہہ خانے کا دروازہ بند کر تالا لگا دیا۔ میں اس دوران دیکھ لیا تھا کہ دروازے کے اندر تالا نہیں ہے بلکہ دروازے کے باہر تالا ہے اور تالا کافی مضبوط تھا۔

میں جان بوجھ کر پرانی عمارت کے کھنڈر کے عقب میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ نیچے دریا بہہ تھا۔ میں کیپٹن سانیال کو بتا رہا تھا کہ میرے پاس قیدی سے فوجی راز اگلوانے کا ایک اور یقہ بھی ہے۔ میرے پاس ایسا کوئی طریقہ نہیں تھا۔ میں وہاں اس لئے کھڑا تھا کہ عقبی ے کا پوری طرح سے جائزہ لے سکوں کیونکہ مجھے اسی جگہ سے پاکستانی جنگی قیدی کو رات ے اندھیرے میں نکال کر لے جانا تھا۔ وہاں سے گھاٹی نیچے دریا کے کنارے تک جاتی ی۔ گھاٹی کی اترائی اتنی خطرناک نہیں تھی۔ کہیں کہیں ڈھلان پر جھاڑیاں اگی ہوئی یں۔ دن کی روشنی میں میں نے ایک ایک جھاڑی کو اپنے ذہن میں بٹھا لیا تھا۔ دریا کا ٹ یہاں زیادہ چوڑا نہیں تھا۔ دوسرے کنارے کے درخت صاف صاف نظر آ رہے ے۔ ہم تیر کر دریا پار کر سکتے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ پاک فوج کے جوان کو تیرنا ضرور آتا گا۔ یہ فوجی ٹریننگ کا حصہ ہوتا ہے۔ جب ہم وہاں سے چلنے لگے تو میں نے کیپٹن سانیال ے کہا۔

"آپ لوگوں کو یہاں رات کے وقت بھی پہرے کا کڑا بندوبست کرنا چاہئے تا کہ ستانی قیدی فرار نہ ہو سکے"

کیپٹن سانیال اور میں پتھر کی سیڑھیاں اتر رہے تھے۔ اس نے کہا۔

"مہاراج رات کو اوپر ہمارے سیکورٹی فورس کے دو جوان پہرے پر موجود ہوتے ہیں۔ ایک جوان تہہ خانے کی سیڑھیوں کے اوپر موجود ہوتا ہے۔ تہہ خانے کے دروازے کو تالا لگا ہوتا ہے۔ قیدی کے فرار ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

یہ ساری باتیں اور سیکورٹی کے سارے انتظامات میں نے ذہن نشین کر لئے۔ سے اپنے جوان کو نکالنا اتنا آسان نہیں تھا لیکن میں نے طے کر لیا تھا کہ چاہے مجھے جان کی بازی لگانی پڑے' میں اپنی بہادر فوج کے غیور فوجی کو دشمن کی قید سے نکال کر جاؤں گا۔ اس وقت اگرچہ آسمان پر بادل جھکے ہوئے لیکن دن کی روشنی چاروں پھیلی ہوئی تھی اور میں نے اس روشنی میں پرانی عمارت کے اردگرد کا سارا علاقہ طرح سے دیکھ لیا تھا۔ مجھے دریا کی طرف سے ادھر آنا تھا۔

وہ رات میں نے کیپٹن سانیال کے مکان پر ہی بسر کی۔ دوسرے دن میں نے ضروری کام کا بہانہ بنایا اور کیپٹن سانیال سے کہا کہ مجھے ایک جگہ اپنے دوست سے جانا ہے۔ میں آج شام واپس کلکتے چلا جاؤں گا۔ دو ایک دن بعد چندر نگر کی سیر دوبارہ آؤں گا۔ کیپٹن سانیال نے تھوڑا اصرار کیا۔ پھر میرے جانے پر راضی ہو گیا۔ کی روشنی میں میں وہاں سے نکلنا نہیں چاہتا تھا۔ جب دن ڈھل گیا تو میں چندر نگر واپس کلکتے روانہ ہو گیا۔ اس وقت کلکتہ شہر پر شام کا دھندلکا پھیل رہا تھا۔ عمارتوں کی بتیاں روشن ہو گئی تھیں۔ میں نے ریلوے سٹیشن کے باہر ایک پبلک بوتھ شاہ دین کو دکان پر فون کیا اور خفیہ کوڈ میں صرف اتنا ہی کہا کہ میں دریا کنارے والی گاہ میں پہنچ رہا ہوں وہ رات کو آ جائے۔

فون کرنے کے بعد میں نے ایک لوکل بس میں بیٹھ کر ہوڑہ برج پار کیا اور وہاں پیدل ہی کھیتوں اور تالابوں کے قریب سے گزرتا اپنے آدمی شاہ دین کے ہائیڈ آؤٹ پہنچ گیا۔ اس وقت ہلکی ہلکی رم جھم شروع ہو گئی تھی۔ رات کو شاہ دین بھی آ گیا۔ نے اسے تمام واقعات سے آگاہ کیا تو وہ بولا۔

"کیا تم پاکستانی جنگی قیدی کو وہاں سے نکال سکو گے؟ مجھے یہ کام مشکل لگتا ہے۔"

شاہ دین کو میرے بارے میں پورا علم نہیں تھا کہ میں کس قسم کا ٹرینڈ کمانڈو ہوں۔ میں نے کہا۔

"یہ کام تم مجھ پر چھوڑ دو۔ تم صرف ایسا کرو کہ میرے لئے ایک لمبے پھل والا چاقو لا دو۔"

شاہ دین بولا۔

"اس کا انتظام ہو جائے گا لیکن فرض کر لیا تم قیدی کو وہاں سے نکالنے میں کامیاب ہو جاتے ہو تو پھر اسے لے کر رات کے اندھیرے میں کس طرف جاؤ گے۔ میرے گودام سے تم دریا کے راستے کم از کم پچیس میل کے فاصلے پر ہو گے اور یہ فاصلہ تم دریا کے اوپر کی جانب کشتی چلاتے ہوئے بھی صبح تک طے نہیں کر سکو گے۔"

یہ ایک ایسا مسئلہ تھا جس نے مجھے بھی تھوڑی سی الجھن میں مبتلا کیا ہوا تھا۔ شاہ دین ٹھیک کہہ رہا تھا۔ قیدی جوان کو نکالنے کے بعد ہمارے سامنے فرار کا ایک ہی ذریعہ تھا جو محفوظ بھی تھا اور یہ ذریعہ دریا تھا۔ وہاں سے دریائے ہگلی آگے کی طرف بہتا تھا اور ہم دریا کے اوپر کے رخ زیادہ دور تک نہیں تیر سکتے تھے۔ میں نے شاہ دین سے پوچھا۔

"یہ بتاؤ کہ اگر ہم وہاں سے دریا پار کر کے دوسرے کنارے پر چلے جاتے ہیں تو وہاں سے تمہارے اس گودام تک کس طرف سے راستہ آتا ہے!؟"

شاہ دین نے کہا۔

"چندر نگر کے دریا پار کا علاقہ غیر آباد ہے۔ وہاں ناریل کے درختوں کے ذخیرے ہیں۔ ان ذخیروں سے نکلنے کے بعد تمہیں دائیں طرف کو ہو جانا ہو گا۔ آگے اگر تمہیں کوئی پگڈنڈی یا سڑک مل گئی تو اسی رخ پر دریا کے ساتھ ساتھ اوپر کی جانب چلتے آنا۔ ہو سکتا ہے راستے میں کسانوں' ملاحوں کی جھونپڑیوں کی بستیاں ملیں۔ ایک دو فیکٹریاں بھی آئیں گی۔ راستے میں کوئی بڑا شہر نہیں ہے۔ یہ پچیس میل کا فاصلہ ہو گا۔ تم لوگ پیدل چل کر یہ راستہ ایک رات میں طے نہیں کر سکو گے تمہیں راستے میں ہی صبح ہو جائے

گی۔ دن کے وقت تمہیں کسی جگہ چھپ جانا ہو گا۔ پھر جب رات کا اندھیرا ہونے
بعد سفر شروع کرنا ہو گا۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا۔ دریا کے ساتھ ساتھ چلنا۔ دریا
کنارے کو اپنے سے دور نہ ہونے دینا۔ پھر تم میرے اس گودام کے پاس پہنچ جاؤ گے
یہاں کی نشانی تمہیں معلوم ہی ہے۔ رات کے وقت یہاں سے کچھ فاصلے پر جو کھاد
فیکٹری ہے اس کی روشنیاں دور سے نظر آجاتی ہیں۔"

منصوبہ بندی کاغذی طور پر بالکل درست تھی۔ اس پر عمل کرتے ہوئے مشکلات
پیش آنے والی تھیں جن کے لئے میں پہلے ہی سے تیار تھا۔ دوسرا آدھا دن بھی گزر گیا
دوپہر کے بعد شاہ دین نے مجھے ایک لمبے پھل والا چاقو لا کر دیا۔ کمانڈو چاقو کی طرح اس
ایک جانب دندانے نہیں تھے۔ صرف پھل ہی تھا مگر یہ ضرورت کے وقت میرے
آسکتا تھا۔ میں نے اسی رات کمانڈو اٹیک کا پروگرام طے کر لیا تھا۔ ابھی سورج غروب
نہیں ہوا تھا کہ میں نے اپنی چیزوں کو چیک کیا۔ زہریلا بال پوائنٹ میرے پاس ہی تھا۔ میں
نے کھدر کے کپڑے اتار کر اپنی پرانی پتلون اور قمیص پہن لی۔ پاؤں میں بوٹ بھی پہن
لئے۔ زہریلا بال پوائنٹ پتلون کی عقبی جیب میں سنبھال کر رکھ لیا۔ چاقو میں نے پتلون
عام جیب میں بند کر کے رکھ لیا۔ میرے پاس انڈین کرنسی نوٹ تھے۔ انہیں میں
پلاسٹک کے لفافے میں تہہ کر کے رکھ لیا۔ شاہ دین کہنے لگا۔

"یہاں سے تھوڑی دور آگے دریا کنارے ایک گھاٹ ہے۔ وہاں سے دیہاتی
فیکٹری کے مزدور لوگ کشتی کے ذریعے دریا پار کر کے شہر جاتے ہیں۔ ابھی شام
ہوئی۔ تمہیں کشتی مل جائے گی۔ اندھیرا ہونے کے بعد گھاٹ بند ہو جاتی ہے۔"

میں نے شاہ دین سے ہاتھ ملا کر اسے خدا حافظ کہا۔ وہ اندر ہی بیٹھا رہا اور میں
سے نکل کر دریا کی طرف چل پڑا۔ بادل اسی طرح چھائے ہوئے تھے۔ رات کو بوندا باندی
ضرور ہوئی تھی مگر اب بوندا باندی رکی ہوئی تھی۔ میں کھیتوں میں سے ہو کر دریا
کنارے پر آگیا۔ پھر دریا کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ کوئی ایک فرلانگ کے فاصلے پر
گھاٹ دکھائی دیا۔ وہاں ایک بڑی کشتی کھڑی تھی۔ اس میں مسافر سوار تھے۔ عورتیں

نہیں جو گٹھڑیاں تھیلے لئے بیٹھی تھیں یہ سب بنگالی مزدور اور دیہاتی لوگ تھے۔ جو کلکتے
یہاں فیکٹریوں میں کام کرنے آتے تھے۔

معلوم ہوا کہ یہ کشتی صرف دریا پار جا رہی ہے۔ آگے چندر نگر کو جانے والی کشتی
تھوڑی دیر بعد آئے گی۔ میں گھاٹ پر ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ اپنی وضع قطع سے میں
کسی فیکٹری میں کام کرنے والا کلرک لگتا تھا۔ میرا رنگ کھلتا ہوا تھا اور بنگالیوں جیسا سانولا
اور کالا نہیں تھا۔ لیکن کلکتے میں کھلتے ہوئے رنگ والے بنگالی مرد اور عورتیں بھی دیکھنے
میں آئی تھیں۔ اس لئے وہاں میں اجنبی نہیں لگتا تھا۔ دریا پار کرانے والی کشتی میں جب
تمام مسافر بیٹھ گئے تو وہ دریا میں چل پڑی۔ اتنے میں اوپر سے ایک اور کشتی آکر گھاٹ پر
رکی۔ یہ پہلی کشتی سے زیادہ بڑی تھی۔ دونوں کناروں پر بنگالی ملاح لمبے لمبے بانس ہاتھوں
میں لئے کشتی کو کنارے کی طرف لا رہے تھے۔ یہ کشتی مسافروں سے بھری ہوئی تھی۔
معلوم ہوا کہ یہ کشتی چندر نگر کو جائے گی۔

پہلے مسافر اتر گئے۔ دوسرے مسافر بیٹھنے لگے۔ میں بھی بیٹھ گیا۔ ملاح نے مجھ سے دو
روپے کرایہ لیا۔ اندھیرا ہونے لگا تھا جب کشتی گھاٹ سے دریا کے بہاؤ کی جانب چل
پڑی۔ چونکہ یہ دریا کے بہاؤ کے ساتھ چل رہی تھی اس لئے اس کی رفتار قدرتی طور پر
زیادہ تھی۔ پھر بھی کشتی کے دونوں سروں پر کھڑے ملاح ڈانڈ چلا رہے تھے اور کشتی کے
توازن کو برقرار رکھے ہوئے تھے۔ کافی دیر تک کشتی دریا میں بہتی رہی۔ دونوں جانب کلکتہ
شہر کی روشنیاں کچھ دور تک نظر آتی رہیں۔ پھر درختوں کے پیچھے چھپ گئیں۔ کناروں پر
اندھیرا چھا گیا۔ میں نے ایک بنگالی سے پوچھا کہ چندر نگر ابھی کتنی دور ہے۔ اس نے بتایا
کہ ابھی دو گھنٹے لگیں گے۔ مجھے کوئی جلدی نہیں تھی۔ میں خود چاہتا تھا کہ رات گہری ہو
جائے تو چندر نگر پہنچوں۔ لیکن رات کے ساڑھے نو بج رہے تھے کہ کشتی چندر نگر کے
گھاٹ پر پہنچ کر رک گئی۔ دوسرے مسافروں کے ساتھ میں بھی کشتی سے اتر پڑا اور جس
طرف چندر نگر شہر کی روشنیاں نظر آرہی تھیں اس طرف چل پڑا۔ میں دریا کے کنارے
کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اسی رخ پر کوئی سات آٹھ میل کے فاصلے پر میرا ٹارگٹ تھا۔

یعنی وہ اونچا ٹبہ جس پر پرانی تاریخی عمارت کے تہ خانے میں پاک فوج کا جوان قید میں
تھا۔

راستہ سرکنڈوں اور جھاڑیوں کے درمیان ایک پگ ڈنڈی کی شکل میں تھا۔ یہا
اندھیرا تھا۔ شروع میں تھوڑی دقت محسوس ہوئی۔ پھر اندھیرے میں بھی پگ ڈنڈی
نظر آنے لگی کہ میں اس پر چل سکتا تھا۔ اس وقت مجھے صرف دو باتوں کا خطرہ محسوس
رہا تھا۔ پہلا خطرہ تو یہ تھا کہ کہیں ادھر ادھر کسی جھاڑی سے کوئی سانپ نہ نکل آئے
دوسرا خطرہ اس بات کا تھا کہ کہیں بارش نہ شروع ہو جائے۔ کلکتے میں یہ برسات کی
تھی لیکن ان دنوں بھی وہاں خوب بارشیں ہو جاتی تھیں۔ خدا کا شکر تھا کہ ابھی تک
بارش شروع نہیں ہوئی تھی۔ میری بائیں جانب چندر نگر شہر کی کچھ فاصلے پر روشنی
تھیں۔ چلتے چلتے میں چندر نگر شہر کی روشنیوں سے آگے نکل آیا۔ پگ ڈنڈی کہیں ختم
جاتی یا دوسری طرف مڑ جاتی تو میں اپنی سمت کو برقرار رکھتے ہوئے دریا کے ساتھ سا
جھاڑیوں اور سرکنڈوں میں سے گزرنے لگتا۔ کچھ دور چلنے کے بعد پھر کوئی پگ ڈنڈی
جاتی۔ جہاں جہاں سے لوگ دریا پار کرتے تھے وہاں وہاں پگ ڈنڈیاں بنی ہوئی تھیں۔

اندھیری رات تھی۔ میں آنکھیں کھول کر دور تک دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ا
اندازے کے مطابق میں چندر نگر سے چھ سات میل دریا کے کنارے کنارے آگے نک
آیا تھا۔ کیپٹن سانیال کی گاڑی میں میں تقریباً اتنا ہی فاصلہ طے کر کے پرانی عمارت کے ٹب
پہنچا تھا۔ آخر مجھے دریا کے کنارے دور ایک اونچی جگہ پر دور روشنیاں جھلملاتی دکھا
دیں۔ جیسے جیسے میں آگے بڑھتا گیا روشنیاں صاف ہوتی گئیں۔ میں نے ان روشنیوں
پرانی عمارت والے اونچے ٹیلے یا ٹبے کو پہچان لیا۔ اندھیرے میں ٹبے کے اوپر
عمارت کے کھنڈر کا خاکہ سا نظر آ رہا تھا۔ اس کی ایک جانب تھوڑے تھوڑے فاصلے پ
کے دو بلب روشن تھے جن کی کافی روشنی تھی۔ میں ایک طرف جھاڑیوں میں بیٹھ
اس روشنی میں مجھے دو انسانی سائے چلتے پھرتے دکھائی دیئے۔ یہ سیکورٹی فورس کے
فوجی ہی ہو سکتے تھے جو رات کی ڈیوٹی پر تھے۔ میں ٹبے کے مزید قریب چلا گیا۔ یہاں

ں نے صاف طور پر دو فوجیوں کو دیکھا جو کاندھوں پر پر رائفلیں لٹکائے آہستہ آہستہ ایک
رف سے دوسری جانب چل کر پہرہ دے رہے تھے۔ وہاں سے مجھے وہ سپاہی نظر نہیں
آرہا تھا جس کے بارے میں کیپٹن سانیال نے مجھے بتایا تھا کہ وہ تہ خانے کے زینے کے
باہر پہرے پر موجود ہوتا ہے اس سپاہی کے پاس تہ خانے کے آہنی دروازے کی چابی
ہوتی تھی۔

میں نے جس حساب سے کمانڈو آپریشن کی منصوبہ بندی کی تھی اس پر عمل کرتے
ہوئے میں وہاں سے ہٹ کر دائیں جانب جھک کر چلتے ہوئے دریا کے کنارے پر آکر بیٹھ
گیا۔ وہاں گہری خاموشی تھی۔ دریا کا پانی خاموشی سے بہہ رہا تھا۔ یہاں دریا کا پاٹ ہمارے
شہروں کی کسی بڑی نہر جتنا تھا۔ دوسرے کنارے کے درختوں کے ہیولے اندھیرے میں
بھوتوں کی طرح نظر آ رہے تھے۔ مجھے رات کا کچھ وقت یہاں گزارنا تھا۔ گھڑی میرے پاس
نہیں تھی۔ میں ساڑھے نو بجے چندر نگر کے گھاٹ پر اترا تھا۔ سات آٹھ میل کا فاصلہ
پیدل چل کر طے کیا تھا۔ اس وقت زیادہ سے زیادہ رات کے گیارہ بجے پونے گیارہ بجے کا
وقت ہو سکتا تھا۔ میں آدھی رات کے بعد اپنے ٹارگٹ کی طرف بڑھنا چاہتا تھا۔
اندھیرے میں آپ زیادہ دیر تک رہیں تو تھوڑا بہت ضرور نظر آنے لگتا ہے۔ مجھے بھی
اپنے ہاتھ پاؤں اور جھاڑیاں اندھیرے میں نظر آ رہی تھیں۔ میری نظریں پرانی عمارت
والے ٹبے کی دریا کی طرف والی گھاٹی پر لگی تھیں۔ مجھے اسی جانب سے اوپر ٹبے پر چڑھنا

اوپر ٹبے پر بھی خاموشی تھی۔ کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ یہ علاقہ ویسے بھی چندر
نگر شہر سے دور تھا۔ اردگرد کوئی آبادی بھی نہیں تھی۔ ساری باتیں میرے پلان کے حق
میں جاتی تھیں۔ میں دریا کنارے سرکنڈوں کے پاس بیٹھا تھا اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد
ٹبے پر جلتے دونوں بلب دیکھ لیتا تھا۔ سب سے پہلے مجھے ٹیلے کے اوپر چڑھنا تھا۔ اوپر پہنچنے
کے بعد مجھے تہ خانے کے زینے تک پہنچنے کی حکمت عملی طے کرنی تھی۔ جہاں میں بیٹھا
وہاں سے مجھے سیکورٹی فورس کے فوجی نظر نہیں آ رہے تھے۔ ان کی کسی قسم کی کوئی

آواز بھی نہیں آرہی تھی۔ آخر جب میں نے محسوس کیا کہ کمانڈو اٹیک کا وقت آگیا
تو میں نے اللہ کا نام لیا۔ اللہ سے مدد کی دعا مانگی اور اٹھ کر دریا سے ہٹ کر ٹبے کی گھا
کی طرف اندھیرے میں چلنے لگا۔ میں انتہائی چوکس ہو کر چل رہا تھا۔ یہاں بھی کسی سپا
کی موجودگی کا خطرہ تھا۔ لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ سارا علاقہ خالی تھا۔ ٹبے کی گھاٹی
دامن میں آکر میں نے اوپر نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ ڈھلان کی مشکل نہیں تھی۔ یہ گھاٹی میں د
کی روشنی میں بھی دیکھ چکا تھا۔ ڈھلان اوپر تک صاف تھی۔ کہیں کہیں کوئی جھاڑ
دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے بسم اللہ پڑھی اور جھک کر گھاٹی چڑھنے لگا۔ مجھے چڑھ
چڑھنے میں زیادہ مشکل پیش نہیں آرہی تھی۔ کیونکہ گھاٹی کی ڈھلان سیدھی نہیں تھ
میں دونوں ہاتھوں سے گیلی گھاس کو پکڑ کر اور نیچے پاؤں جما جما کر اوپر چڑھ رہا تھا۔ فا
کافی تھا۔ ایک جگہ جھاڑی سامنے آگئی۔ میں اس کی ٹہنیوں کو پکڑ کر وہیں بیٹھ گیا اور
دیکھنے لگا۔ اوپر پرانی عمارت کے کھنڈر کا پچھلا حصہ اندھیرے میں کسی قلعے کی دیوا
طرح نظر آرہا تھا۔ وہاں روشنی بالکل نہیں تھی۔ یہ بات میرے لئے مفید تھی۔ تھ
سانس لے کر میں دوبارہ اوپر چڑھنے لگا۔ آخر میں اوپر پہنچ گیا۔ میں نے سر ذرا سا اٹھ
بائیں طرف دیکھا۔ مجھے معلوم تھا کہ تہہ خانے کا راستہ اسی طرف ہے۔ اس طرف ک
کی دیوار کافی آگے کو آئی ہوئی تھی۔

کوئی انسان نہیں تھا۔ کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ میں اوپر ہو کر بیٹھ گیا۔ پھر جھک
آہستہ آہستہ چلتا پرانی عمارت کی دیوار کے پاس اس جگہ آکر بیٹھ گیا جہاں دیوار دو
طرف گھوم جاتی تھی۔ یہاں مجھے سارا منظر صاف نظر آگیا۔ مجھ سے کوئی دس
قدموں کے فاصلے پر دو فوجی سامنے والی دیوار کے آگے بے دلی سے سست قدمو
ساتھ چل کر پہرہ دے رہے تھے۔ تہہ خانے کے زینے والا حصہ یہاں سے دائیں
تھوڑا ہٹ کر تھا جو بلب کی روشنیوں میں بھی میری نگاہوں سے اوجھل تھا۔ دونوں
آرمی کی سیکورٹی فورس کے باوردی فوجی تھے۔ رائفلیں ان کے کاندھوں پر لگی تھیں
کوئی گبھرو جوان فوجی نہیں تھے۔ قد کاٹھ سے بنگالی یا مدراسی لگ رہے تھے۔ ٹہلتے

ں میں باتیں کرنے لگے۔ مجھے کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ بنگلہ میں بات کر رہے ہیں یا
سی زبان میں۔ میں صرف ان کی آواز ہی سن رہا تھا۔ پھر ان میں سے ایک فوجی وہیں
چبوترے پر بیٹھ گیا۔ اس نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر ایک سگریٹ سلگا
یہاں دو کھمبوں پر بجلی کے دو بلب جل رہے تھے جن کی کافی روشنی تھی۔ میں سانس
کے دیوار کی اوٹ میں بیٹھا بڑے غور سے ان فوجیوں کی ایک ایک حرکت کو نوٹ کر رہا
یہ کوئی عام سویلین آدمی نہیں تھے۔ فوج کے تربیت یافتہ فوجی تھے۔ ان کو قابو کرنا اتنا
ان کام نہیں تھا۔ لیکن میں بھی کوئی عام دکان دار یا مزدور ٹائپ کا آدمی نہیں تھا۔ میں
تربیت یافتہ کمانڈو تھا۔ بلکہ تربیت اور ٹریننگ میں میں ان سے دس قدم آگے تھا۔ جو
نگ ایک کمانڈو کو دی جاتی ہے وہ اس ٹریننگ سے بڑی مختلف ہوتی ہے جو ایک عام
ی کو فوج میں ملتی ہے۔ میں اس طرح اندھیرے میں بیٹھا ان فوجیوں کو گہری نظروں
ے دیکھ رہا تھا جس طرح کوئی عیار چیتا اپنے شکار کے بالکل قریب پہنچ کر اسے اپنی زد میں
لے کر اس انتظار میں ہوتا ہے کہ کب بجلی کی طرح لپک کر شکار کو اپنے قبضے میں کر لے۔
میں اور ایک چیتے میں اس وقت صرف یہی فرق تھا کہ مجھے اپنے شکار پر جھپٹنا بالکل
یں تھا بلکہ مجھے عیاری اور عقل سے کام لیتے ہوئے شکار کو اس جگہ بلانا تھا جہاں مجھے
ے آناً فاناً دبوچ لینا تھا۔

سارا پلان میں نے اپنے ذہن میں تیار کیا ہوا تھا۔ جب میں نے محسوس کیا کہ اب
زید انتظار خطرناک ہو سکتا ہے تو میں دیوار کے ساتھ بیٹھے بیٹھے اندھیرے میں تین چار
دم پیچھے ہٹ گیا۔ پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پتلون کی جیب سے زہریلا بال پوائنٹ نکال کر
پنے سیدھے ہاتھ میں اس طرح مضبوطی سے پکڑ لیا جس طرح پستول پکڑا جاتا ہے۔ میں
یہاں زہریلے بال پوائنٹ سے حملہ کرنا چاہتا تھا۔ ایک دم سے دشمن کو دبوچ کر اس کی
گردن توڑنے میں خطرہ تھا کہ کہیں تھوڑی بہت آواز پیدا نہ ہو جائے۔ اس طرح دوسرا
فوجی دوڑ کر وہاں آسکتا تھا۔

اس وقت خدا سے یہی دعا مانگ رہا تھا کہ بال پوائنٹ کہیں دھوکہ نہ دے جائے۔

اس میں سے زہریلی سوئی فائر ہو جائے۔ فائر نہ ہونے کی صورت میں بھی میں پکڑا نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ ایک تو مجھے اندھیرے میں لیٹ کر فائر کرنا تھا دوسرے فائر نہ ہونے صورت میں دوسرا اور تیسرا فائر بھی کر سکتا تھا۔ کیونکہ بال پوائنٹ پنسل سے جب زہر سوئی شوٹ ہوتی تھی تو معمولی سی آواز بھی پیدا نہیں ہوتی تھی۔ یہاں یہی ہتھیار کارگر سکتا تھا۔ کیونکہ دشمن دو بلکہ تین تھے۔ ایک ہوتا تو میں بڑی آسانی سے اسے دبوچ گردن توڑ سکتا تھا۔ جب میں نے زہریلا بال پوائنٹ خاص زاویے سے اپنے ہاتھ میں لیا تو وہیں اندھیرے میں لیٹ گیا اور کہنیوں کے بل رینگ کر تھوڑا آگے جھاڑیوں پاس ہو گیا۔ پھر میں نے وہی حربہ استعمال کیا کہ عام طور پر ایسے موقعوں پر کیا جاتا ہے میں نے ہاتھ سے زمین کو ٹٹول کو ایک چھوٹا سا پتھر اٹھایا اور ذرا آگے کر کے اچھال دیا۔ پتھر زمین پر گرا تو اس کی آواز پیدا ہوئی۔ مگر دونوں فوجیوں میں سے کسی نے اس آواز طرف توجہ نہ دی۔ میں نے دوسرا پتھر اچھالا۔ یہ ذرا بڑا پتھر تھا۔ اس کی زیادہ آواز پیدا ہوئی۔

دونوں میں سے کسی ایک فوجی نے بلند آواز میں کہا۔

"دیکھو ادھر کیا ہے"

یہ ہندوستانی زبان میں جملہ ادا کیا گیا تھا۔ دوسرے فوجی نے بنگلہ زبان میں کچھ کہا اور پھر مجھے اس کے بھاری جوتوں کی آواز اپنی طرف آتی سنائی دی۔ میں اندھیرے میں زمین کے بالکل ساتھ لگ گیا۔ میرا ایک رخسار زمین پر اگی ہوئی گیلی گھاس کے ساتھ لگا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک فوجی میری طرف بڑھا چلا آرہا ہے۔ اپنی فوجی ٹریننگ پر غیر شعوری طور پر عمل کرتے ہوئے رائفل اس نے کاندھے سے اتار کر ہاتھوں میں پکڑ لی تھی مگر الر ہو کر نہیں آرہا تھا۔ ڈھیلے ڈھالے انداز میں آرہا تھا۔ وہ جھک کر اندھیرے میں کچھ دیکھ کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے اونچی آواز میں اپنے دیوار کی اس جانب بیٹھ کر سگریٹ پی ہوئے ساتھی سے بنگلہ زبان میں کچھ کہا۔ میں نے بلے کا لفظ سنا۔ غالباً اس نے کہا تھا کوئی بلی وغیرہ تھی چلی گئی ہے۔ یہ بنگالی ہندو فوجی تھا۔ وہ جھک کر چلتا میرے بالکل قریب

آ کر سیدھا ہو کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنے آپ سے کوئی بات کی اور واپس جانے کے لئے مڑا۔ جیسے ہی وہ مڑا اس کی ایک ٹانگ کی پنڈلی میرے بالکل سامنے آ گئی۔ میں نے زہریلے بال پوائنٹ والا ہاتھ اٹھایا اور فائر کر دیا۔ بال پوائنٹ کی نوک اور فوجی کی پنڈلی کا فاصلہ اس وقت زیادہ سے زیادہ دو انچ کا ہو گا۔ میری ہتھیلی کو محسوس ہوا کہ خفیہ بٹن دبانے سے زہریلی سوئی بال پوائنٹ سے ہلکی سرسراہٹ کے ساتھ فائر ہو گئی تھی۔ اس کا ثبوت مجھے فوراً ہی مل گیا۔ یہ بھارتی فوجی میرے بالکل قریب کھڑا تھا۔ میں زمین پر منہ کے بل لیٹا ہوا تھا خدا کا شکر ہے کہ وہ میرے اوپر نہیں گرا۔ اسی لمحے وہ پہلو کی جانب اس طرح گرا جس طرح کوئی آدمی لکڑی کے لٹھ کو پکڑ کر کھڑا ہو۔ پھر وہ اسے چھوڑ دے اور لٹھ دھڑام سے زمین پر گر پڑے۔ اس فوجی کے گرنے سے کافی آواز پیدا ہوئی۔ میں چاہتا تھا کہ زیادہ آواز پیدا ہو۔ میں بجلی ایسی تیزی کے ساتھ اٹھ کر دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ آواز سن کر دوسرے فوجی نے اس کا نام لے کر پکارا اب میں بھول گیا ہوں کہ اس نے کیا نام لیا تھا۔ جب اسے کوئی جواب نہ ملا تو مجھے اس کے فوجی بوٹوں کی آواز آئی۔ وہ میری طرف آرہا تھا۔ میں دیوار کے ساتھ کھسک کر اس مقام پر اندھیرے میں آ کر کھڑا ہو گیا تھا جہاں سے دیوار دوسری طرف گھوم جاتی تھی۔

فوجی جوتوں کی آواز بالکل قریب آ گئی اور پھر میں نے دوسرے فوجی کو دیکھا۔ اس نے بھی رائفل کاندھے سے اتار کر ہاتھوں میں تھام لی تھی اور تشویش کے لہجے میں اپنے ساتھی کا نام لے کر اسے آوازیں دے رہا تھا۔ جیسے ہی وہ میرے قریب سے گزر کر آگے جانے لگا۔ میں نے بال پوائنٹ پنسل کی نوک اس کی گردن پر لگا کر فائر کر دیا۔ وہ کچھ بولا تھا۔ مجھے یاد ہے اس نے ایک ہاتھ اپنی گردن کی طرف بڑھایا تھا۔ شاید اس کا خیال تھا کہ کسی چیونٹی نے اس کی گردن پر کاٹا ہے اور وہ ہاتھ سے چیونٹی کو مسلنے لگا تھا مگر سائی نائیڈ زہر نے اسے اتنی مہلت ہی نہ دی۔ وہ منہ کے بل آگے کو گر پڑا۔ میں اندھیرے میں ساکت ہو کر کھڑا رہا۔ میں یقین کرنا چاہتا تھا کہ انڈین سیکورٹی فورس کے یہ دونوں فوجی مر چکے ہیں۔ دوسری طرف سے روشنی کا عکس ان پر پڑ رہا تھا۔ وہ بے حس و حرکت زمین پر

پڑے تھے۔ میں نے بال پوائنٹ جیب میں ڈالی اور جھک کر دونوں لاشوں کی گردنوں پر
ہاتھ رکھ کر دیکھا۔ دونوں کے دل بند ہو چکے تھے۔ گردن کے قریب دھڑکنے والی رگیں
ساکت ہو چکی تھیں۔ احتیاط کے طور پر میں نے دونوں کی رائفلیں اٹھا کر جھاڑیوں میں
چھپا دیں اور اپنے دوسرے اور اصلی ٹارگٹ کی طرف بڑھا۔ یہ ٹارگٹ پہلے سے ز
مشکل تھا۔ لیکن ایک آسانی ضرور تھی کہ ٹارگٹ تک پہنچنے کا راستہ صاف ہو گیا تھا۔ ا
مجھے کھمبوں پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر جلتے ہوئے بلبوں کی تیز روشنی میں سے ہو کر
خانے کے زینے کی طرف جانا تھا جہاں پہلے سے ایک فوجی پہرے پر موجود تھا اور جسے
ٹیبے کی گھاٹی کی طرف آتے ہوئے دور سے دیکھ چکا تھا۔ خطرہ صرف ایک ہی تھا کہ
غلط ہاتھ پڑ جانے سے فوجی رائفل کا فائر نہ کر دے۔ فائر کی آواز سے اردگرد کے وہ ف
جو یقیناً وہاں عمارت کے کسی نہ کسی کمرے میں موجود تھے الرٹ ہو کر وہاں آ سکتے تھے
ان کے آنے سے میرا سارا منصوبہ خاک میں مل سکتا تھا۔ اگرچہ مجھے یقین تھا کہ رات
پہرہ دیتے ہوئے گارڈوں نے اپنی رائفلوں کے سیفٹی کیچ آگے نہیں کئے ہوتے۔ کیو
عام طور پر ایسا ایمرجنسی کی حالت میں کیا جاتا ہے۔ لیکن کچھ پتہ نہیں تھا کہ رات کی ڈ
پر موجود سپاہیوں کو آرڈر ملا ہو کہ رائفلوں کے سیفٹی کیچ آگے کر کے پہرہ دو۔
ایمرجنسی کی حالت میں وہ فوراً فائر جھونک سکیں۔ رائفل کا سیفٹی کیچ آگے کر کے میگ
چیمبر میں ڈالنے سے دو تین سیکنڈ ضرور لگتے ہیں۔ لیکن اگر رائفل پہلے سے تیار
حالت میں ہو تو فائر کرنے کے لئے سپاہی کو صرف ٹریگر پر انگلی کا دباؤ ہی ڈالنا ہوتا ہے۔
تمام باتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے مجھے حملہ کرنا تھا۔

میں نے دیوار کی اوٹ سے سر آگے کر کے دیکھا۔ سامنے روشنی میں کھلی جگہ
صاف نظر آ رہی تھی۔ وہ چبوترہ خالی تھا جس پر تھوڑی دیر پہلے سیکورٹی فورس
سپاہی بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ مجھے اس چبوترے کے قریب سے گزر کر دوسری
طرف جانا تھا۔ کیونکہ تہہ خانے کا زینہ دوسری جانب تھا۔ اب وقت ضائع
کرنے کا وقت نہیں تھا۔ میں دیوار کی اوٹ سے نکلا اور جھک کر تیز تیز قدموں

سے دوڑتا ہوا چبوترے کی اوٹ میں ہو کر بیٹھ گیا۔ میں اس طرح دوڑ کر آیا تھا
کہ میرے قدموں کی آواز وہاں سے زیادہ دور تک نہیں جا سکتی تھی۔ ایک
لمحے کے لئے جیسے بیٹھا ویسے ہی بیٹھا رہا۔ میرے کان فضا پر چھائی ہوئی خاموشی
پر لگے تھے۔ میرے دوڑنے کی آواز پر وہاں جب کوئی نہ آیا تو میں کھسک کر
آگے ہو گیا۔ میں نے سر نکال کر چبوترے کی دوسری جانب دیکھا۔

میں نے اس فوجی کو پہچان لیا۔ یہ وہی فوجی تھا جو ایک دن پہلے میرے اور
کیپٹن سانیال کے ساتھ تہہ خانے کے دروازے تک آیا تھا اور اس نے تہہ
خانے کا آہنی دروازہ کھولا تھا۔ وہ اس جگہ دیوار کے پاس کسی چیز پر بیٹھا تھا
جہاں سے تہہ خانے کی سیڑھیاں نیچے جاتی تھیں اس کے سر کے اوپر دیوار میں
سے نکلی ہوئی سلاخ پر بجلی کا بلب روشن تھا۔ وہاں بڑی روشنی تھی اور مجھے
اس بھارتی فوجی کی ٹوپی پر لگا ہوا پر بھی نظر آ رہا تھا۔ مجھے اس سپاہی کو ختم کر
کے نیچے جانا تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ اس سپاہی نے مجھے کیپٹن سانیال کے
ساتھ وہاں آتے دیکھا ہوا ہے۔ وہ میری شکل پہچانتا ہے۔ اگرچہ اس میں خطرہ
بھی تھا لیکن ایسا خطرہ نہیں تھا کہ وہ مجھے سامنے دیکھتے ہی گولی چلا دے یا مدد کے
لئے شور مچا دے۔

اس خیال کے ساتھ ہی میں نے چبوترے کے پیچھے بیٹھے بیٹھے ہاتھ پھیر کر
اپنے بال درست کئے۔ قمیض کا کالر صحیح کیا اور اٹھ کر بڑے اطمینان سے فوجی
کی طرف چلا گیا۔ اس نے ایک آدمی کو اپنی طرف آتے دیکھا تو جلدی سے اٹھ
کھڑا ہوا اور رائفل کی نالی میری طرف کرتے ہوئے کہا۔

"ہالٹ! رک جاؤ نہیں تو ہم فائر کر دے گا۔"

اتنی دیر میں میں اس کے قریب آ چکا تھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے ہاتھ
باندھ کر ہندوؤں کی طرح نمسکار کیا اور کہا۔

"تم نے مجھے پہچانا نہیں؟ میں کل کیپٹن سانیال کے ساتھ یہاں آیا تھا۔

میں کیپٹن صاحب کا دوست ہوں۔ یاد نہیں؟ وہ مجھے ساتھ لے کر نیچے پاکستانی قیدی کے پاس گئے تھے اور میں نے تم سے پانی کا گلاس منگوایا تھا“

اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔ مگر فوجی آخر فوجی ہوتا ہے۔ وہ اتنی جلدی ہتھیار نہیں پھینکتا۔ بندوق کی نالی کا رخ اس نے میری طرف ہی کئے رکھا اور بولا۔

”ٹھیک ہے سرا! ہم تم کو پہچان گیا ہے۔ پر تم رات کو ادھر کیا کرنے آیا ہے؟“

میں نے کہا۔

”یار میں اکیلا نہیں آیا۔ کیپٹن صاحب بھی میرے ساتھ ہی آئے ہیں وہ بس آتے ہی ہوں گے۔ بھگوان کے لئے یہ بندوق تو نیچے کر لو۔“

میں نے آہستہ سے ہاتھ بڑھا کر اس کی رائفل کی نالی کو نیچے کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اتنی زور سے اس کی ٹانگوں کے درمیان اپنے بوٹ کا ٹھڈا مارا کہ رائفل اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور وہ دہرا ہو گیا اور اس نے حلق سے آواز نکالی ہی تھی کہ میرے سیدھے بازو کا شکنجہ اس کی گردن کے گرد فولاد کی طرح جکڑا ہوا تھا اور پھر صرف ایک جھٹکے کی ہی دیر تھی۔ اصل میں یہ دونوں حرکتیں ایک ساتھ ہوتی تھیں۔ دشمن کو جب مجھے ہلاک کرنا ہوتا تھا تو میں اس کی گردن اپنے فولادی بازو کے شکنجے میں لیتے ہی جھٹکے سے توڑ دیا کرتا تھا۔ مجھے خود پتہ نہیں چلتا تھا کہ میں نے دشمن کی گردن میں شکنجہ پہلے ڈالا تھا یا جھٹکے سے اس کی گردن پہلے توڑی تھی۔ میرا کام صرف اتنا تھا اور یہی میرا کمال فن تھا کہ دشمن کو اتنی مہلت نہ ملے کہ وہ اپنے بازو اوپر اٹھا سکے اور جوابی حملہ کر سکے۔ اس داؤ کو میں بڑی مہارت سے استعمال کرتا تھا اور میرے اس داؤ سے دشمن کا بچنا تقریباً ناممکن تھا۔ جب بھارتی فوجی نے اپنے جسم کا سارا بوجھ میرے بازو پر ڈال دیا اور اس کے دونوں بازو نیچے لٹک گئے تو

میں سمجھ گیا کہ اس کا کام تمام ہو گیا ہے۔ میں اسے اسی طرح گردن اپنے بازو کے شکنجے میں لئے گھسیٹ کر دیوار کے پیچھے اندھیرے میں لے گیا۔ وہاں اسے زمین پر ڈال کر اس کی بیلٹ سے لگا ہوا چابیوں کا چھلا نکال لیا۔ اس میں تین چار ہی چابیاں تھیں۔ اس کی رائفل میں نے دور پھینکنے کی بجائے اپنے کاندھے پر ڈال لی تھی۔ میں دوڑ کر سیڑھیوں میں آیا اور جلدی جلدی سیڑھیاں اترنے لگا۔

اوپر جو بلب لگا تھا اس کی روشنی نیچے تک آرہی تھی۔

میں چھلے میں سے ایک ایک کر کے چابی آہنی دروازے کے تالے کو لگانے لگا۔ چابی لگ گئی۔ تالا کھل گیا۔ میں نے دروازے کے ایک پٹ کو الگ کیا اور اندر گھس اندر وہی کمزور روشنی والا بلب جل رہا تھا۔ ٹاٹ پر ہمارا غازی جوان دیوار کی طرف م کے کسمپرسی کے عالم میں پڑا شاید سو رہا تھا۔ میں نے جاتے ہی اس کا کندھا ہلایا تو وہ پڑا۔ وہ ایک ایسے شیر کی طرح لگ رہا تھا جسے پنجرے میں بند کر کے بھوکا پیاسا رکھا گ میں نے اسے اٹھاتے ہوئے کہا۔

"جلدی سے میرے ساتھ نکل چلو۔"

وہ اپنے اسی اکھڑے لہجے میں بولا۔

"آخر تم ہو کون؟"

اس نے مجھے پہچان لیا تھا کہ میں وہی ہوں جو ایک دن پہلے کیپٹن سانیال کے اس کے پاس آیا تھا اور اسے کوئی دوائی پینے کے لئے کہا تھا۔ میں نے بھی خالص فو میں جواب دیا۔

"بکو مت جانگلی۔ اٹھو۔ میرے ساتھ بھاگ چلو۔ میں اپنی جان خطرے میں ڈ تمہاری جان بچانے آیا ہوں۔ اٹھو۔ ڈبل سے چلو"

میں نے اسے پکڑ کر کھڑا کر دیا۔ اب معاملہ کچھ کچھ اس کی سمجھ میں آگیا تھ سیڑھیوں کی طرف بھاگا۔ وہ بھی میرے پیچھے آگیا۔ میں نے اسے سیڑھیوں

شارے سے روک دیا۔ خود سیڑھیاں چڑھ کر اوپر گیا اور گردن اٹھا کر باہر دیکھا۔ باہر کوئی ہیں تھا۔ ایک جانب دیوار کے پاس بھارتی فوجی کی لاش پڑی تھی۔ اس کی رائفل میرے کاندھے سے لٹکی ہوئی تھی۔ میں نے اپنے فوجی کو اشارہ کیا اور میں باہر نکل آیا۔ اپنا فوجی جوان بھی باہر آگیا۔ وہ میرے پیچھے پیچھے تھا۔ اس کی وردی چیتھڑوں کی طرح لگ رہی تھی۔ میں گھاٹی والی دیوار کی طرف بھاگا۔ وہ بھی میرے پیچھے دوڑا۔ میں نے محسوس کیا کہ دوڑتے وقت وہ کمزوری محسوس کر رہا ہے۔ یہ مسلسل فاقوں اور وحشیانہ اذیت کی وجہ سے تھا۔ جہاں پرانی عمارت کی دیوار کے پاس گھاٹی کی ڈھلان نیچے جاتی تھی میں وہاں بیٹھ گیا اور اپنے فوجی جوان کو بھی بازو سے پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا۔ میں نے نیچے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ہمیں نیچے اترنا ہے۔ ڈھلان زیادہ نہیں ہے۔ مگر سنبھل کر اترنا ہو گا اور منہ گھاٹی کی طرف کر کے اترنا ہو گا۔ جلدی کرو۔ گو۔"

میں نے گو کہا تو اندھیرے میں اس کی آنکھیں مجھے اپنی طرف دیکھتی نظر آئیں۔ وہ گھاٹی کی دیوار پر ہاتھ جمائے ہوئے پاؤں نیچے کر کے اترتے ہوئے بولا۔

"کیا تم فوجی ہو؟"

میں نے کہا۔

"چپ رہو جوان۔ بولو گے تو ہم دونوں رگڑے جائیں گے"

ہم گھاٹی کی ڈھلان پر اوندھے پڑ کر آہستہ آہستہ نیچے اتر رہے تھے۔ سیدھے ہو کر گھاٹی اترنے میں منہ کے بل گرنے اور نیچے تک لڑھکنے کا ڈر تھا۔ سیدھی اترائی نیچے کوئی پچاس ساٹھ فٹ تک تھی۔ اس کے بعد ہم نے اپنے جسم سیدھے کر لئے اور گھاس کو اور جھاڑیوں کو پکڑ کر بیٹھ کر اترتے چلے گئے۔ ہم جتنی جلدی اتر سکتے تھے اتر رہے تھے۔ میں نے اندھیرے میں پاک فوج کے جوان کو دیکھا کہ اس میں بھی جیسے ایک نئی طاقت آگئی تھی۔

نیچے آتے ہی میں نے اسے کہا۔

"سامنے دریا ہے۔ ہمیں دریا پر تیر کے دوسرے کنارے پر جانا ہے۔ تمہیں تیرنا
ہے؟"

وہ بولا۔

"آتا ہے۔ تم آگے چلو"

میں اسے ساتھ لے کر دریا کی طرف چلا۔ ہم تیز تیز چل رہے تھے۔ یہاں درخ
بھی تھے اور اونچی اونچی جھاڑیاں اور سرکنڈوں کے جھنڈ بھی تھے۔ اندھیرا ہونے کی
سے میں تھوڑی دور چل کر پیچھے دیکھ لیتا۔ پاک فوج کا جوان برابر چلا آرہا تھا۔ میرے پا
آکر اس نے کہا۔

"میں تمہیں دیکھ رہا ہوں۔ رکو مت۔ چلتے جاؤ"

ہم دریا پر پہنچ گئے۔ آسمان پر کوئی ستارہ نہیں تھا۔ تمام ستارے بادلوں میں چھ
چکے تھے۔ بارش بھی رکی ہوئی تھی۔ دریا کا پاٹ اندھیرے میں دھندلا دھندلا دکھائی د
رہا تھا۔ ہوا بھی نہیں چل رہی تھی۔ فضا حبس آلود تھی۔ فوجی جوان میرے قریب
جھک کر دریا کو دیکھنے لگا۔ میں نے اسے دریا میں اپنے پیچھے کودنے کا اشارہ کیا اور دریا
چھلانگ لگا دی۔ مجھے اپنے پیچھے اس کے چھلانگ لگانے کی بھی آواز آئی۔ پانی ٹھنڈا تھا
اس کا بہاؤ زیادہ تیز نہیں تھا۔ میں نے سامنے والے کنارے کی جانب تیرنا شروع کر
کچھ دور جا کر پیچھے گردن گھما کر دیکھا۔ اپنا فوجی جوان بھی مجھے اندھیرے کے دھندلکے
تیرتا نظر آیا۔ وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر تھا اور بڑی مہارت سے تیر رہا تھا۔ دریا کے وسط
پانی کا بہاؤ تیز تھا۔ مگر ہم اس کو پار کر گئے اور دوسرے کنارے پر پہنچ گئے۔ دریا سے
نکلتے ہی میں نے اور فوجی جوان نے اپنی قمیضیں اتار کر نچوڑیں اور وہیں بیٹھ کر س
درست کرنے لگے۔ دریا کا پاٹ اگرچہ زیادہ چوڑا نہیں تھا مگر وسط میں آکر ہمیں دریا کی
لہروں سے نکلنے کے لئے کافی جدوجہد کرنی پڑی تھی۔ دریا آخر دریا ہوتا ہے۔ نہر خواہ
چوڑی کیوں نہ ہو دریا کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ہم نے فوراً گیلی قمیضیں دوبارہ پہن لی
فوجی جوان نے کہا۔

"ہمیں اب کس طرف جانا ہو گا؟"

ں نے کہا۔

"یہاں سے ہم دریا کے ساتھ ساتھ اوپر کی جانب جائیں گے۔ لیکن دریا سے ہٹ کر
گے۔ یہاں سے کوئی چالیس میل کے فاصلے پر ایک خفیہ جگہ ہے۔ ہمیں وہاں پہنچنا
"

فوجی جوان بولا۔

"اتنی دور تک پیدل چلنے سے ہمیں صبح ہو جائے گی۔ میں اپنی فوجی وردی سے پہچان
ں گا۔ اتنی دیر میں میرے فرار کا بھی پتہ چل چکا ہو گا۔ فوج سارے علاقے کو
ے میں لے لے گی۔ کسی اور طرف نکل چلتے ہیں"

میں نے کہا۔

"ہم جس طرف بھی گئے جب صبح ہو گی تو ہم یہاں سے بیس بائیس میل آگے نہیں
ہوں گے۔ بہتر ہے کہ جس طرح میں کہتا ہوں اسی طرح کرو۔ یہاں سے نکلو۔ صبح
والی ہو گی تو چھپنے کے لئے کوئی جگہ تلاش کرلیں گے۔"

وہ کہنے لگا۔

"فکر نہیں۔ چلو"

اور ہم دریا سے ہٹ کر درختوں میں چلنے لگے۔ میں نے اس سے اس کا نام اور عہدہ
۔ اس نے کہا۔

"میں تمہیں اپنا صرف نام اور عہدہ ہی بتاؤں گا۔ اپنی رجمنٹ کا نام نہیں بتاؤں گا۔
ابھی تک پورا یقین نہیں ہے کہ تم پاکستانی ہو"

ہم اندھیرے میں جلدی جلدی چلے جا رہے تھے۔ میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے تم نام اور رینک بتا دو۔ مجھے کچھ اور معلوم کرنے کی ضرورت نہیں
تمہارا نام اور عہدہ بھی اس لئے پوچھ رہا ہوں کہ تمہیں بلانے میں مجھے آسانی ہو۔"

اس نے اپنا نام محمد شریف اور عہدہ نائیک بتایا۔ میں نے اس کے بعد اس سے کوئی

سوال نہ کیا۔ میری ساری توجہ اس علاقے پر مرکوز تھی جس میں سے ہم گزر رہے
شاہ دین نے کہا تھا کہ چندر نگر سے دریا پار کرو گے تو ناریل کے درختوں کا ذخیرہ شرو
جائے گا۔ اس کے آگے کھیت اور میدان آئیں گے۔ ہم اس وقت ناریل کے در
کے ذخیرے میں سے گزر رہے تھے۔ ذخیرہ ختم ہوا تو سامنے کھیتوں اور کہیں کہیں در
کے سیاہ جھنڈوں کا سلسلہ دکھائی دیا۔ ان کے پیچھے دور آبادی کی روشنی نظر آرہی
نائیک شریف نے پوچھا۔

"ہم ٹھیک راستے پر جا رہے ہیں کیا؟"

میں نے کہا۔

"ہاں۔ فکر نہ کرو۔ آجاؤ"

اس طرح ہم نے باقی رات چلتے چلتے گزار دی۔ میں دریا کے ساتھ ساتھ
اگرچہ اس سے کچھ فاصلے پر چل رہا تھا۔ کیونکہ اسی دریا نے ہمیں شاہ دین کی کمیں گاہ
پہنچانا تھا۔ اب وہ جگہ آگئی تھی جس کے بارے میں شاہ دین نے کہا تھا کہ وہاں تمہیں
راستہ تلاش کر کے آگے چلنا ہو گا۔ راستے میں صبح ہو جائے تو کوئی مناسب جگہ دیکھ
چھپ جانا۔ اور جب تک دوبارہ رات کا اندھیرا نہ پھیلے اسی جگہ چھپے رہنا۔ چنانچہ میں
اپنی عقل سے کام لے کر چل رہا تھا اور راستہ دیکھتا جا رہا تھا۔ آسمان پر چھائے ہو
بادلوں میں سے صبح کا نور جھلکنے لگا تو میں نے نائیک شریف سے کہا۔

"جوان! اب ہمیں کوئی ایسی جگہ ڈھونڈنی ہے جہاں ہم چھپ کر دن گزار دیں۔"

اس وقت ہم دریا سے کافی ہٹ کر ایک جگہ کھیتوں کے پاس بیٹھے تھے۔ نا
شریف بولا۔

"تم لگتا ہے اس علاقے سے واقف ہو میں تو پہلی بار یہاں آیا ہوں۔ تم کوئی
تلاش کر لو۔ میرا خیال ہے اب تک میرے فرار کا علم ہو چکا ہو گا اور انڈین فوجیو
لاشیں بھی ان لوگوں نے دیکھ لی ہوں گی۔"

میں نے کہا۔

"تم پیچھے کی بات نہ کرو۔ یہاں بیٹھے رہو۔ میں کوئی جگہ دیکھ کر آتا ہوں۔"

میں نے پاک فوج کے جوان نائیک شریف کو وہیں بٹھایا اور خود کھیتوں میں سے ہو کر
ے نکل گیا۔ دن کا اجالا پھیل رہا تھا۔ کھیت' کھیتوں میں بنے ہوئے مچان' درخت اور
یا کے ساتھ اگے ہوئے درختوں کا سلسلہ صاف دکھائی دینے لگا تھا۔ بنگال اور جنوبی
دوستان میں ناریل کے درخت بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ ان علاقوں میں ناریل کی چھال
ے بنی ہوئی مصنوعات کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ناریل کی چھال کو بٹ کر ان کی چٹائیاں
یاں اور رسے رسیاں بنائی جاتی ہیں۔ ناریل کے ذخیروں میں اکثر جگہوں پر لوہے کے
ے بڑے چرخے لگے ہوئے ہیں جہاں مزدور عورتیں اور مرد دن بھر ناریل کے ریشوں
و بٹ کر ان کی چھوٹی بڑی رسیاں اور باریک دھاگے بناتے ہیں۔ ان جگہوں پر انہوں نے
اپنے لئے دو ایک جھونپڑیاں ڈالی ہوتی ہیں جہاں وہ اپنی روزمرہ استعمال کی چیزیں بھی رکھتے
ں اور بعض مزدور رات کو ان جھونپڑیوں میں ہی سو جاتے ہیں۔ جب رسیاں بٹنے کا
ن کچھ دنوں کے لئے ختم ہو جاتا ہے تو یہ جھونپڑیاں خالی پڑی رہتی ہیں۔

تھوڑی دور چلنے کے بعد مجھے ایسی ہی ایک جھونپڑی نظر آئی۔ جھونپڑی بالکل خالی
ں۔ وہاں ناریل کے کافی درخت تھے اور دریا کی جانب اونچے سرکنڈوں نے ایک دیوار
بنا رکھی تھی۔ دن کو چھپنے کے لئے یہ جگہ بڑی مناسب تھی۔ آس پاس کوئی ذی روح
ھائی نہیں دیتا تھا۔ میں نائیک شریف کو جھونپڑی میں لے آیا۔ ہم نے جھونپڑی کے
روازے کے آگے جھاڑیوں کی شاخیں کاٹ کر اس طرح لگا دیں کہ آڑ بن گئی اور باہر
ے ہم دکھائی نہیں دیتے تھے۔ دن کافی نکل آیا تھا۔ میں نے نائیک شریف سے کہا۔

"تم یہاں بیٹھو جوان۔ میں کہیں سے کچھ کھانے پینے کو لاتا ہوں۔ خبردار جھونپڑی
ے باہر مت نکلنا۔"

میں دریا کی طرف جانے کی بجائے اس کی سامنے کی جانب جہاں دھان کے ہرے
ھرے کھیت ابر آلود صبح کی ٹھنڈی ہوا میں لہرا رہے تھے نکل گیا۔ مجھے یقین تھا کہ یہاں
کوئی نہ کوئی گاؤں ضرور ہو گا۔ ایک جگہ کھیتوں میں اونچی مچان کے قریب جھونپڑی کے

باہر مجھے دھواں اٹھتا نظر پڑا۔ میں قریب چلا گیا۔ وہاں ایک بوڑھی عورت چولہے میں
جلائے اس پر سلور کی کالی سیاہ دیگچی رکھے بیٹھی چولہے میں سوکھی شاخیں ڈال دی
میں نے پاس جا کر اسے نمسکار کیا اور وہاں کی عام بول چال والی ہندوستانی میں کہا کہ
بیوی بیمار ہے۔ ہم دریا پار جانے کے لئے ناؤ کا انتظار کر رہے ہیں۔ کیا ہمیں کچھ کھا
مل جائے گا؟ بوڑھی بنگالی عورت پر میری فرضی بیوی کی بیماری کا سن کر بڑا اثر
جلدی سے جھونپڑی میں گئی۔ اندر سے کیلے کا بڑا سا پتہ لے آئی۔ پھر دیگچی میں جو
گرم کر رہی تھی وہ نکال کر پتے پر ڈالی اور مجھے دے کر بولی۔

"یہ لو بیٹا۔ میرے پاس یہی کچھ ہے۔"

میں نے جیب سے دس روپے کا نوٹ نکال کر اسے دیا اس نے پیسے لینے سے انکا
دیا۔ مگر میں نے زبردستی نوٹ اس کے پاؤں کے پاس رکھ دیا اور کھچڑی کیلے کے پ
لپیٹ کر دوسری طرف کھیتوں سے ہوتا ہوا نائیک شریف کے پاس آگیا۔ ہم نے
کھچڑی کھائی اور خدا کا شکر ادا کیا۔ میں نے نائیک شریف سے کہا وہ اگر زخمی ہو گیا
دشمن کے ہاتھ کیسے لگ گیا۔ اسے چاہیے تھا کہ وہ واپس اپنی پوزیشنوں میں چلا جاتا یا
وہیں پڑا رہتا تو اپنی میڈیکل کور کے آدمی اسے اٹھا کر واپس لے جا سکتے تھے۔ نائیک بولا

"چونڈہ کے محاذ پر بھارت نے بہت بڑی طاقت سے حملہ کیا تھا۔ لیکن ہمارے جوا
نے اس کے ہر حملے کو ناکام بنایا۔ اپنے توپ خانے نے بھی بڑی آگے آ کر گولہ باری
میرا تعلق انفنٹری رجمنٹ سے تھا۔ دشمن کی توپیں اور ٹینک اور مارٹر گنیں اندھا
گولہ باری کر رہی تھیں مگر ہم اپنی پوزیشنوں میں ڈٹے رہے۔ جب گولہ باری رکی
نے ایڈوانس کیا۔ دشمن نے دوبارہ گولہ باری شروع کر دی۔ تین طرف سے اس
ٹینک ہماری طرف بڑھے۔ وہاں گردوغبار اور بارود کا دھواں اس قدر زیادہ تھا کہ
نہیں چل رہا تھا کہ ہم کہاں ہیں اور دشمن کہاں پر ہے میں اپنی کمپنی سے بچھڑ گیا تھا
مجھے علم نہیں تھا۔ راکٹ لانچر میرے پاس تھا۔ میں نے دشمن کے ایک ٹینک کو
دیکھا تو راکٹ فائر کر دیا۔ ٹینک کو آگ لگ گئی اور دھماکے سے پھٹ گیا لیکن کسی

مشین گن کا برسٹ آیا اور اس کی ایک گولی میری ٹانگ کے پیچھے کو چیرتی ہوئی نکل
گئی۔ یہ کوئی ایسا زخم نہیں تھا۔ میں اپنے مورچوں کی طرف ہٹنے لگا لیکن میں دشمن کے
مورچے کے پاس جا نکلا۔ ایسی صورت بن گئی کہ میری ٹانگ نے آگے بڑھنے سے انکار کر
دیا۔ میں وہیں بیٹھ کر زخم پر فیلڈ پٹی باندھ رہا تھا کہ دشمن کے تین سپاہی سٹین گنیں تان کر
میرے سر پر آن کھڑے ہوئے۔ یوں میں دشمن کی قید میں آگیا۔ ان لوگوں نے کئی روز
تک مجھے امرتسر کی جیل میں رکھا اور مجھ پر وحشیانہ تشدد کیا۔ دشمن یہ سمجھ رہا تھا کہ میں
رانی توپ کا توپچی ہوں۔ وہ مجھ سے رانی توپوں کے بارے میں اور ان کی پوزیشنوں کے
بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ اپنی رانی توپیں کہاں کہاں
ڈپلائے ہیں۔ لیکن دشمن کو اس بارے میں ایک لفظ بھی بتانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا
تھا۔ امرتسر سے مجھے دلی لایا گیا۔ وہاں بھی مجھے ٹارچر کیا گیا۔ میں نے اپنی زبان بند رکھی
دشمن کو سوائے اپنے نام اور نمبر کے کچھ نہ بتایا۔ جب دشمن مایوس ہو گیا تو وہ مجھے کلکتے
کے اس ٹارچر سیل میں لے آئے جہاں تم نے پہلی بار مجھے دیکھا تھا۔"

میں بڑے غور سے نائیک شریف کی بات سن رہا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں
کون ہوں۔ کیا میرا تعلق کمانڈو فورس سے ہے یا میں کشمیری مجاہد ہوں۔ میں نے
مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں کشمیری مجاہد ہوں"

وہ بولا۔

"مگر تم پنجابی جس طرح بولتے ہو بالکل پنجابی لگتے ہو۔"

میں نے کہا۔

"میں پنجابی ہی ہوں لیکن کشمیر کے محاذ پر کشمیری حریت پرستوں کے ساتھ مل کر کام
کر رہا ہوں۔"

مجھے باہر جھاڑیوں میں ایسی آواز سنائی دی جیسے کوئی گزر رہا ہے۔ میں نے جھونپڑی
کی عقبی دیوار کے سوراخ میں سے دیکھا۔ ایک بنگالی دیہاتی سر پر سوکھی شاخوں کا گٹھا

رکھے جھاڑیوں میں سے دریا کی طرف جا رہا تھا۔ وہ جھونپڑی کے قریب سے گزرا تو
نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر نائیک شریف کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا جب دیہاتی کافی آ
نکل گیا تو ہم پھر باتیں کرنے لگے۔ مجھے اندر سے ایک دھڑکا ضرور لگا ہوا تھا کہ آرمی کی
سے کسی پاکستانی فوجی قیدی کا فرار ہو جانا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ اور فرار ہوتے وا
ہم تین بھارتی فوجیوں کو ہلاک بھی کر آئے تھے۔ یقینی بات تھی کہ دریا پار کے سار
علاقے کا آرمی کی انٹیلی جینس نے محاصرہ کر لیا ہو گا۔ دن کی روشنی میں ہم سفر کرنے
خطرہ بھی مول نہیں لے سکتے تھے۔ کسی بھی جگہ ملٹری انٹیلی جینس یا فوجیوں سے آمنا سا
ہو سکتا تھا۔ نائیک شریف کی وردی کا رنگ پاکستانی تھا۔ اگرچہ وہ کافی پھٹ چکی تھی لیکن
خاکی قمیض پتلون اور بوٹوں سے وہ صاف پہچانا جاتا تھا کہ یہ پاکستانی فوج کا جوان ہے۔ ا
دوران انٹیلی جینس والوں کو موقع مل رہا تھا کہ وہ علاقے میں چاروں طرف پھیل
پورے پلان کے مطابق ہماری تلاش جاری رکھ سکیں۔ وہ اس جھونپڑی میں بھی آ سکتے
جہاں ہم چھپ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم جو بھارتی فوجی کی رائفل اپنے ساتھ لے کر
ہوئے تھے میں نے صبح ہوتے ہی وہ رائفل بھی جھاڑیوں میں ایک جگہ پھینک دی تھی
یہ رائفل اب ہمیں گرفتار کروا سکتی تھی۔ میں بڑی سخت بے چینی کے ساتھ دن
گزرنے اور شام کا اندھیرا پھیلنے کا انتظار کر رہا تھا۔ یہ لمحات آج بھی مجھے یاد آتے ہیں
میں بے چین سا ہو جاتا ہوں۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح دن گزر گیا۔ جیسے ہی شام ہوئی
درختوں کے نیچے اندھیرا پھیلنے لگا ہم جھونپڑی سے نکل آئے اور کلکتے کی طرف رخ
لیا۔

ابھی کلکتہ بہت دور تھا اور ہم ساری رات پیدل چلتے رہنے کے باوجود صبح ہونے
پہلے کلکتے نہیں پہنچ سکتے تھے۔ ایک تو مجھے اندازے سے سمت کا تعین کرنا پڑتا
دوسرے ہم کسی سڑک پر نہیں چل رہے تھے۔ ہمیں جھاڑیاں سرکنڈوں میں راستہ
پڑتا تھا۔ اور بعض جگہ جہاں کوئی گاؤں آ جاتا تھا تو ہمیں اس گاؤں کے اوپر سے ہو
چکر کاٹ کر آگے نکلنا پڑتا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ ہمیں اگر کہیں سے کوئی بیل گاڑی

جائے تو سفر جلدی کٹ سکتا ہے۔ مگر وہاں اندھیرے میں ہم کہاں بیل گاڑی تلاش کرتے
پھرتے۔ بس یوں سمجھ لیں کہ رات کے اندھیرے میں اندازے سے کبھی چلتے اور کبھی
تھوڑی دیر رک کر سستاتے' رات گزر گئی مگر کلکتہ اب بھی نہیں آیا تھا۔ لیکن ہم چندر
نگر کے خطرے والے علاقے سے کافی دور نکل آئے تھے۔ چنانچہ ہم دن کے وقت بھی
آبادی سے دور دور رہ کر دریا کے کنارے سے ہٹ کر چلتے رہے۔

وہ دن بھی اسی طرح چھپ چھپ کر پیدل سفر کرتے گزر گیا۔ جب سورج غروب ہو
گیا اور ہر طرف ہلکا ہلکا نیم تاریک دھندلکا چھانے لگا تو دور سے جھلملاتی روشنیاں نظر آنے
لگیں۔ یہ کلکتہ شہر کے مضافات کے کارخانوں اور فیکٹریوں کی روشنیاں تھیں۔ دریا کی
جانب بھی ہمیں دو بادبانی کشتیاں بہتی دکھائی دیں۔ میں نے نائیک شریف سے کہا۔

"جوان! ہم کلکتے پہنچ گئے ہیں"

ایک فیکٹری کی روشنیاں ہماری بائیں جانب کچھ فاصلے پر تھیں۔ اس کے قریب سے
گزرتے ہوئے میں نے اس فیکٹری کی ایک چھوٹی اور ایک بڑی چمنی کو پہچان لیا۔ اپنے
شاہ دین کا گودام اب زیادہ دور نہیں تھا۔ میں دریا کے کنارے کی جانب آ گیا۔ نائیک
شریف میرے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ ہم نے سارا دن کیلے کے پتے میں بچی ہوئی کھچڑی
ہی کھائی تھی۔ اور جہاں کہیں کوئی تالاب وغیرہ نظر آیا وہاں سے پانی پی لیا تھا۔ آخر ہم
منزل پر پہنچ گئے۔

شاہ دین کی جھونپڑی یا کوارٹر یا خفیہ ہائیڈ آؤٹ آپ جو بھی اسے کہہ لیں خالی تھی۔
جیسا کہ اس نے طے کیا تھا اس نے کوٹھڑی کو تالا نہیں لگایا تھا۔ کوٹھڑی میں آ کر میں نے
دروازہ بند کر کے اندازے سے ٹٹول کر ایک جگہ سے موم بتی اور ماچس نکال لی۔ موم بتی
کو روشن کر کے ایک جگہ لگا دیا۔ اور ٹانگیں پھیلا کر لیٹ گئے۔ شاہ دین کو چونکہ کوئی
اطلاع نہیں تھی اس لئے رات کے وقت اس کے وہاں آنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ میں
نے نائیک شریف کو بتایا کہ میں صبح دن نکلنے کے بعد اپنے آدمی شاہ دین کے سٹوڈیو میں
جاؤں گا اور اسے اپنے کامیاب فرار کی خبر دوں گا اور واپسی پر کچھ کھانے کو بھی لیتا آؤں

جائے تو سفر جلدی کٹ سکتا ہے۔ مگر وہاں اندھیرے میں ہم کہاں بیل گاڑی تلاش کر
پھرتے۔ بس یوں سمجھ لیں کہ رات کے اندھیرے میں اندازے سے کبھی چلتے اور کبھ
تھوڑی دیر رک کر سستاتے' رات گزر گئی مگر کلکتہ اب بھی نہیں آیا تھا۔ لیکن ہم چھ
نگر کے خطرے والے علاقے سے کافی دور نکل آئے تھے۔ چنانچہ ہم دن کے وقت ب
آبادی سے دور دور رہ کر دریا کے کنارے سے ہٹ کر چلتے رہے۔

وہ دن بھی اسی طرح چھپ چھپ کر پیدل سفر کرتے گزر گیا۔ جب سورج غروب
گیا اور ہر طرف ہلکا ہلکا نیم تاریک دھندلکا چھانے لگا تو دور سے جھلملاتی روشنیاں نظر آ
لگیں۔ یہ کلکتہ شہر کے مضافات کے کارخانوں اور فیکٹریوں کی روشنیاں تھیں۔ دریا
جانب بھی ہمیں دو بادبانی کشتیاں بہتی دکھائی دیں۔ میں نے نائیک شریف سے کہا۔

"جوان! ہم کلکتے پہنچ گئے ہیں"

ایک فیکٹری کی روشنیاں ہماری بائیں جانب کچھ فاصلے پر تھیں۔ اس کے قریب
گزرتے ہوئے میں نے اس فیکٹری کی ایک چھوٹی اور ایک بڑی چمنی کو پہچان لیا۔ ا
شاہ دین کا گودام اب زیادہ دور نہیں تھا۔ میں دریا کے کنارے کی جانب آگیا۔ نائ
شریف میرے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ ہم نے سارا دن کیلے کے پتے میں بچی ہوئی کچھ
ہی کھائی تھی۔ اور جہاں کہیں کوئی تالاب وغیرہ نظر آیا وہاں سے پانی پی لیا تھا۔ آخر
منزل پر پہنچ گئے۔

شاہ دین کی جھونپڑی یا کوارٹر یا خفیہ ہائیڈ آؤٹ آپ جو بھی اسے کہہ لیں خالی تھ
جیسا کہ اس نے طے کیا تھا اس نے کوٹھڑی کو تالا نہیں لگایا تھا۔ کوٹھڑی میں آکر میں
دروازہ بند کر کے اندازے سے ٹٹول کر ایک جگہ سے موم بتی اور ماچس نکال لی۔ موم
کو روشن کر کے ایک جگہ لگا دیا۔ اور ٹانگیں پھیلا کر لیٹ گئے۔ شاہ دین کو چونکہ
اطلاع نہیں تھی اس لئے رات کے وقت اس کے وہاں آنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔
نے نائیک شریف کو بتایا کہ میں صبح دن نکلنے کے بعد اپنے آدمی شاہ دین کے سٹوڈیو
جاؤں گا اور اسے اپنے کامیاب فرار کی خبر دوں گا اور واپسی پر کچھ کھانے کو بھی لیتا آ

رات ہم نے کبھی سو کر اور کبھی سن پینسٹھ کی جنگ پر باتیں کرتے گزار دی جب دن
یں نے نائیک شریف کو وہیں چھپے رہنے کی ہدایت کی اور خود کھیتوں اور ویران
ے سے گزرتا فیکٹری ایریا میں آکر اس مارکیٹ کی طرف چل پڑا جہاں سے میں پبلک
ے شاہ دین کو فون کر سکتا تھا۔ مارکیٹ کی دکانیں ابھی نہیں کھلی تھیں۔ صرف
ے کی ایک دکان کھلی تھی جہاں فیکٹریوں کے مزدور لوگ بیٹھے ناشتہ وغیرہ کر رہے تھے۔
فون بوتھ کھلا تھا۔ میں نے سکہ ڈال کر شاہ دین کے سٹوڈیو کا نمبر گھمایا مجھے معلوم تھا
وہ ٹیلی فون رات کو اپنے سرہانے رکھ کر سوتا ہے کیونکہ کسی بھی وقت میرا فون آسکتا

گھنٹی بجتے ہی دوسری طرف سے شاہ دین کی آواز آئی۔ اس نے اپنے سٹوڈیو کی دکان
م لیا اور پوچھا کہ میں کون بول رہا ہوں۔ میں نے خفیہ کوڈ میں اسے بتایا کہ میں جو شے
گیا تھا وہ لے کر مکان پر پہنچ چکا ہوں۔ شاہ دین نے بھی خفیہ زبان میں جواب دیا کہ
وہ چیز لینے آرہا ہوں۔ فون بند کر کے میں نے چائے کی دکان سے دو تین مکھن والے
لئے۔ مٹی کے کٹورے میں گرم گرم چائے کی پوری چینک ڈلوائی۔ سگریٹ کا پیکٹ
یدا اور بڑے سکون سے شاہ دین کے ہائیڈ آؤٹ کی طرف چل پڑا۔ جاتے ہی نائیک
یف کو بتایا کہ اپنا کشمیری مجاہد جاسوس ابھی پہنچ جائے گا۔

"دیکھو۔ میں چائے اور بند مکھن لایا ہوں۔"

ہمیں سخت بھوک لگی ہوئی تھی۔ ہم سارے بند مکھن کھا گئے۔ وہاں سے دو گلاس
ا گئے۔ گلاسوں میں چائے ڈال کر ہم ساری چائے پی گئے۔ نائیک شریف نے سگریٹ کا
ش لگاتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں اور بولا۔

"بڑی مدت بعد سگریٹ کا سوٹا لگایا ہے۔ مگر یہاں کے سگریٹ بڑے پھیکے ہیں۔ ان
ں پاکستانی سگریٹوں والا زور اور طاقت نہیں ہے۔"

میں بھی بڑے سکون سے سگریٹ پی رہا تھا۔ نائیک شریف نے مجھ سے کہا۔

"میں ہر حالت میں پاکستان اپنی رجمنٹ میں واپس پہنچنا چاہتا ہوں۔ اس سلسلے میں تم

میری کیا مدد کر سکتے ہو؟"

میں نے کہا۔

"شاہ دین آجائے تو اس سے بھی مشورہ کرتے ہیں"

نائیک شریف کہنے لگا۔

"اگرچہ دونوں ملکوں میں جنگ بندی ہو چکی ہے مگر بارڈر پر دونوں طرف فو
بیٹھی ہوں گی۔ بارڈر کراس کرنے کی صورت میں مجھے بھارتی پوزیشنوں کے درمیان
ہو کر گزرنا پڑے گا۔ اگر بارڈر پر عام بارڈر فورس ہوتی تو یہ کام اتنا مشکل نہیں تھا
باقاعدہ فوج کے مورچوں کی موجودگی میں بارڈر کراس کرنا آسان نہیں ہو گا۔"

میں نے کہا۔

"دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ تمہیں بمبئی سے دوبئی جانے والے کسی جہاز
سوار کرانے کی کوشش کی جائے۔ اس طرح دوبئی سے پاکستان تم بڑی آسانی سے پہنچ
گے۔"

"اگر ایسا ہو سکے تو یہ زیادہ بہتر ہو گا۔"

میں نے کہا۔

"دونوں ملکوں کے سفارت خانے بھی بند ہو چکے ہیں۔ ورنہ ہم تمہیں کلکتے
پاکستانی سفارت خانے کے حوالے کر سکتے تھے۔"

ہم اسی قسم کی باتیں کرتے رہے۔ اتنے میں شاہ دین بھی آگیا۔ میں نے نا
شریف سے اس کا تعارف کرایا۔ شاہ دین نے شریف کو گلے لگا لیا اور بولا۔

"پاک فوج کے شیر جوان کو دیکھ کر روح تازہ ہو گئی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ت
دشمن کی قید سے نجات ملی۔"

وہ بھی اپنے ساتھ کچھ کھانے کو لایا تھا اور تھرمس میں چائے بھر کر لے آیا تھا
نے اس کا لایا ہوا ناشتہ بھی کیا اور ایک بار پھر چائے گلاسوں میں ڈال کر پینے لگے۔ میں
شاہ دین سے کہا۔

"سب سے پہلے تو نائیک شریف کے لئے دوسرے کپڑوں کی ضرورت ہے"

شاہ دین بولا۔

"وہ میں لے آؤں گا۔"

میں نے کہا۔

"اس کے بعد ہمیں پاک فوج کے جوان کو واپس پاکستان پہنچانا ہے۔ تم اس سلسلے میں
کیا مشورہ دیتے ہو کہ ہمیں نائیک شریف کو کس طرف سے انڈیا کا بارڈر کراس کرانا
چاہئے۔"

شاہ دین عقل رکھنے والا آدمی تھا۔ اس نے بھی وہی بات کی جس کا اظہار میں نے
اور نائیک شریف نے کیا تھا۔ وہ کہنے لگا۔

"میں اپنے جوان کو مشرقی پنجاب سے انڈیا کا بارڈر کراس کرنے کا ہرگز مشورہ نہیں
دوں گا۔ اس میں اس کے دوبارہ پکڑے جانے کا سو فیصد خطرہ ہے۔"

میں نے کہا۔

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا ہے کہ ہم بمبئی کی بندرگاہ سے یا انڈیا کی دوسری بندرگاہ سے
اپنے جوان کو دوبئی یا عرب امارات کی طرف جانے والے کسی مسافر بردار بحری جہاز میں
سوار کرا دیں؟"

شاہ دین سوچ میں پڑ گیا۔ پھر بولا۔

"یہ کام مشکل ضرور ہے مگر اس پر غور کیا جا سکتا ہے۔"

میں نے شاہ دین سے کہا۔

"کلکتے سے سمندری جہاز رنگون بھی جاتے ہیں کیا ایسا بندوبست ہو سکتا ہے کہ ہم
نائیک شریف کو رنگون جانے والے جہاز میں بٹھا دیں۔ رنگون میں پاکستانی سفارت خانہ
موجود ہے۔ شریف اپنے سفارت خانے پہنچ گیا تو وہاں سے وہ لوگ اسے پاکستان بھجوا دیں
گے"

شاہ دین نے کہا۔

"آج کل انڈیا میں ایمرجنسی لگی ہوئی ہے اور چندر نگر کے ملٹری سنٹر سے پاک فو
کا قیدی تین بھارتی فوجیوں کو قتل کر کے فرار ہو چکا ہے۔ آج کے اخباروں میں اس کی خ
چھپ گئی ہے رات کو کلکتے کا ریڈیو بھی یہ خبر نشر کر رہا تھا۔ ایسی صورت حال میں
بندرگاہوں پر نہ صرف یہ کہ خفیہ پولیس پھیلی ہوئی ہو گی بلکہ مسافروں کے کاغذات او
پاسپورٹ وغیرہ کی چیکنگ بھی بہت سخت ہوتی ہو گی۔ نقلی پاسپورٹ وغیرہ بنوایا جائ
ہے۔ لیکن اس میں شدید خطرہ ہے کہ نائیک شریف بندرگاہ پر پکڑا جائے گا۔ ایک تو
بنگلہ زبان نہیں جانتا۔ دوسرے شکل اور رنگ روپ سے ہی پنجابی لگتا ہے۔"

میں نے شاہ دین سے کہا۔

"چیکنگ وغیرہ کی سختی کلکتے کی بندرگاہ اور ریلوے سٹیشنوں پر ضرور ہو گی مگر بمب
یہاں سے بہت دور ہے۔ میرا خیال ہے وہاں حالات معمول کے مطابق ہوں گے۔ کیا بمبئی
میں اپنا کوئی ایسا آدمی ہے جو ہمارے جوان کو بصرہ یا دوبئی یا کسی بھی دوسرے ملک کو جا
والے سمندری جہاز میں سوار کرانے کا انتظام کر سکے؟"

شاہ دین کچھ سوچ کر بولا۔

"تمہارا یہ مشورہ مناسب لگتا ہے۔ بمبئی میں اپنا ایک آدمی ہے۔ وہ نائیک شریف کی
اس سلسلے میں مدد کر سکتا ہے۔ مگر اس مشن پر تمہیں نائیک شریف کے ساتھ بمبئی جانا ہو
گا۔"

میں نے کہا۔

"میں تیار ہوں۔"

شاہ دین کہنے لگا۔

"میں آج شام فون پر اس سے بات کرتا ہوں۔"

شاہ دین کچھ دیر ہمارے پاس بیٹھنے کے بعد چلا گیا۔ جاتے ہوئے وہ تاکید کر گیا کہ ہم
میں سے کوئی بھی اشد ضرورت کے بغیر مکان سے باہر نہ نکلے۔ ہم نے سارا دن اس
چھوٹے سے کاٹھ کباڑ والے کمرے میں گزار دیا۔ شام ہو چکی تھی کہ شاہ دین آ گیا۔

ہمارے لئے کھانے پینے کا سامان اور چائے سے بھری ہوئی تھرمس بھی ساتھ لایا تھا۔ میں
نے اس کے آتے ہی پوچھا۔

"کیا تمہاری بمبئی میں اپنے آدمی سے بات ہو گئی ہے؟"

شاہ دین بولا۔

"دوست! پہلے کچھ کھا پی لو۔ پھر بات کر لیں گے۔ یوں سمجھ لو کہ بات ہو گئی ہے۔"

ہم نے کھانا کھایا۔ پھر گلاسوں میں چائے ڈالی اور اپنا اپنا گلاس لے کر بیٹھ گئے۔
کمرے کے اندر موم بتی روشن تھی اس کی روشنی بہت مدھم تھی۔ شاہ دین نے گفتگو کا
سلسلہ شروع کرتے ہوئے کہا۔

"میں نے اپنے آدمی کو خفیہ کوڈ میں ساری بات بتا دی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ میں
فوج کے جوان کو اپنے کسی خاص اعتباری آدمی کے ساتھ بمبئی بھیج دوں۔ میں نے اسے
تمہارا بتا دیا ہے۔ تمہیں ایک خفیہ کوڈ جملہ جا کر اسے بتانا ہو گا۔ بمبئی والے آدمی کی میں
تمہیں تصویر دکھا دیتا ہوں"

اس نے واسکٹ کی جیب میں سے بمبئی والے آدمی کی تصویر نکال کر مجھے دکھائی۔
تصویر مجھے دکھا کر اس نے واپس اپنی جیب میں رکھ لی۔ شاہ دین کہنے لگا۔

"میں کل کسی بھی وقت نائیک شریف اور تمہارے واسطے دوسرے کپڑے لاؤں گا۔
تم وہی کپڑے پہن کر یہاں سے روانہ ہو گے بمبئی میں اگر مجھ سے کوئی مشورہ کرنے کی
تمہیں ضرورت محسوس ہوئی تو میرے آدمی کے پاس میرا خفیہ فون نمبر موجود ہے۔ تم اس
نمبر پر مجھ سے رابطہ پیدا کر سکتے ہو۔"

دوسرے دن شاہ دین دوپہر کے بعد ہمارے لئے کھانا اور کچھ کپڑے لے کر آ گیا۔
نائیک شریف کی ایک مٹیالے رنگ کی پتلون اور اسی کلر کی پرانی سی بش شرٹ تھی۔ اسی
طرح میرے لئے بھی پتلون قمیض کا ایک جوڑا تھا۔ جیکٹ پہلے سے میرے پاس ہی تھی جو
گرم نہیں تھی اور اسے برسات کے موسم میں بھی پہنا جا سکتا تھا۔ اس نے ہمیں کلکتے
سے بمبئی سنٹرل تک کے ریل کے دو ٹکٹ بھی دیئے جو تھرڈ کلاس کے تھے۔ کہنے لگا۔

"میں تمہارے لئے نئے کپڑے اس لئے نہیں لایا کہ نئے کپڑوں پر خوامخواہ دوسر
کی نظر پڑ جاتی ہے۔ تھرڈ کلاس کے ٹکٹ بھی اسی لئے خریدے ہیں کہ تھرڈ کلاس پ
رش ہوتا ہے اور تم لوگوں کے ہجوم میں اپنے آپ کو چھپا سکو گے۔ گاڑی رات آٹھ
کر چالیس منٹ پر ہوڑہ ریلوے سٹیشن سے چھوٹے گی۔ تم لوگوں کو وقت پر وہاں پہنچ
ہو گا۔"

اس کے بعد اس نے مجھ سے علیحدگی میں کچھ ضروری باتیں کیں جو آپ کو بتانے
ضرورت مجھے محسوس نہیں ہو رہی۔ پھر وہ چلا گیا۔ ہم نے منہ ہاتھ دھو کر کپڑے ب
لئے۔ نائیک شریف کی ڈاڑھی بڑھ آئی تھی اس نے شیو کر لی تا کہ آسانی سے پہچانا
سکے۔ ہم وقت سے پہلے شاہ دین کے خفیہ ٹھکانے سے نکل کر کلکتے کے ہوڑہ سٹیشن
پہنچ گئے۔

کلکتے میں ہمیں خطرہ تھا۔ ہوڑہ سٹیشن پر اگرچہ ریلوے پولیس کے دو چار سپاہ
نظر آ رہے تھے مگر مجھے یقین تھا کہ خفیہ پولیس کے آدمی سفید کپڑوں میں ضرور موجود
گے اور وہ مسافروں کا بغور جائزہ لے رہے ہوں گے۔ چنانچہ میں نے پلیٹ فارم پ
سے پہلے نائیک شریف کو ہدایت کر دی کہ وہ مجھ سے الگ ہو کر چلے اور پلیٹ فار
آخری سرے پر جا کر کسی ایسی جگہ بیٹھ جائے جہاں اس پر عام لوگوں کی زیادہ نظر نہ پ
ہو۔ میں خود بھی اس سے کچھ فاصلے پر اخباروں رسالوں کے سٹال پر کونے میں کھڑا
سگریٹ پینے اور عقابی نگاہوں سے اردگرد کے ماحول کا جائزہ لینے لگا۔ ہم ٹھیک وا
سٹیشن پہنچے تھے۔ پھر بھی ٹرین نے وہیں سے تیار ہونا تھا۔ اس نے پندرہ بیس منٹ
دیئے۔ جیسے ہی ٹرین پلیٹ فارم پر لگی میں نے آنکھوں سے نائیک شریف کو اشارہ
ہم کونے والی بوگی کے ایک تھرڈ کلاس کے ڈبے میں گھس کر بیٹھ گئے۔ منصو
مطابق ہم ڈبے میں بھی ایک دوسرے سے دور ہو کر بیٹھے تھے لیکن ایک دوسرے
رہے تھے۔ میں نے اپنے خفیہ ہتھیار زہریلے بال پوائنٹ کے بارے میں نائیک ش
بالکل نہیں بتایا تھا۔ اسے بتانے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

یاد رکھیں۔ ایک اچھا کمانڈو اپنے راز اپنے ساتھیوں پر بھی ضرورت کے بغیر کبھی
ہر نہیں کرتا۔

ٹرین ہوڑہ سٹیشن سے روانہ ہو گئی۔ یہ بڑا لمبا سفر تھا۔ ہندوستان کے ایک سرے
ے دوسرے سرے تک جاتا تھا۔ یہ دو راتوں اور ڈیڑھ دن کا سفر تھا۔ جب تک ٹرین
لتے سے کافی دور نہیں نکل گئی مجھے اپنے اور خاص طور پر پاک فوج کے جوان نائیک
ریف کے بارے میں بڑی فکر لگی رہی۔ خدا کا شکر تھا کہ یہ خطرناک زون یعنی علاقہ
یت سے نکل گیا اور ٹرین جمشید پور کی طرف تیزی سے دوڑتی چلی جا رہی تھی۔ اگر
پ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ کلکتے سے بمبئی کی طرف سفر کرتے ہوئے راستے میں کون کون
ے بڑے شہر آئے تو سن لیجئے۔ ویسے تو کلکتے سے بمبئی تک ریلوے کا ایک دوسرا روٹ
ا ہے۔ مگر جس روٹ پر ہماری ٹرین جا رہی تھی اس ریلوے لائن پر جو بڑے بڑے اور
م شہر آئے ان کے نام یہ ہیں۔ کلکتے سے نکلنے کے بعد پہلے کھڑگ پور آیا اس کے بعد بڑا
ر جمشید پور آیا جہاں بنگال کی مشہور لوہے کی کانیں ہیں۔ جمشید پور کے بعد جو بڑے شہر
استے میں آئے وہ اس ترتیب سے تھے۔ سندر گڑھ' بلاس پور' رائے پور' ناگ پور'
ردھا' اکولا' بھوساول' جل گاؤں' ناسک' دیولالی' کلیان اور بمبئی۔ یہ دو راتوں اور ڈیڑھ
ن کا سفر تھا۔ ہم بمبئی دن کے ایک بجے پہنچے اس وقت بمبئی میں بارش ہو رہی تھی۔ یہ
ئی کی برسات کی آخری بارشیں تھیں۔ پنجاب میں اس وقت سردی شروع ہو چکی تھی۔
ئی کے سٹیشن پر اترتے ہی مجھے بمبئی میں گزارے ہوئے دن اور احمد آباد میں میناکشی
ہاں سوامی جی کے بھیس میں بسر کئے ہوئے دلچسپ رومانوی مگر انتہائی خطرناک دن یاد
نے لگے۔ پھر یاد آ گیا کہ کس طرح میں نے احمد آباد میں مقیم اپنے آدمی کی مدد سے احمد
باد سے کچھ فاصلے پر انڈین آرمی کا دوارکا کا ایمونیشن اور فوجی ساز و سامان سے بھرا ہوا
لو تباہ کیا تھا۔ مگر میں احمد آباد سے کافی دور تھا اور میرا حلیہ بھی کافی بدل چکا تھا۔ نائیک
ریف کو میں نے اپنے ساتھ کر لیا تھا۔

اس نے پوچھا۔

"یہاں ہمیں رات گزارنے کا ابھی سے بندوبست کر لینا چاہئیے۔"
اس کا خیال تھا کہ ہم سٹیشن کے پاس ہی کسی چھوٹے سے ہوٹل میں کمرہ لے
ہیں۔ مگر میں اس کے خلاف تھا۔ ایسی جگہوں پر سی آئی ڈی کے لوگ اکثر منڈلاتے ر
ہیں۔ میں نے اسے کہا۔
"ابھی اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں سب سے پہلے یہاں اپنے جاسوس سے
ہے۔ کسی جگہ کا انتظام ہم اس سے مشورہ کر کے کریں گے۔"
بمبئی شہر کے علاقوں سے میں واقف تھا۔ اگرچہ اس شہر کے سارے بازار اور عا
میرے دیکھے ہوئے نہیں تھے۔ بمبئی بھی بہت بڑا شہر ہے اور اسے کئی علاقوں میں تق
گیا ہے۔ کسی کا نام دادر ہے۔ کسی کا نام پریل ہے تو کسی کا موتنگا اور اندھیری ہے
کل بھارت کے زی چینل پر ایک پروگرام ہوتا ہے جس میں حصہ لینے کے لئے بھا
کے لوگوں کو اس کا ایڈریس بتایا جاتا ہے۔ اس ایڈریس میں اندھیری کا علاقہ بتایا جاتا
میں یہ نام سنتا ہوں تو مجھے اپنی کمانڈو لائف کا ہنگامہ خیز اور ایمان کے جذبے سے بھ
زمانہ یاد آجاتا ہے جب میں اپنے طور پر محض پاکستان سے محبت یا پاکستان کی سلامتی
کشمیری مسلمانوں کی جنگ آزادی میں اپنے کشمیری مسلمان بھائیوں کے شانہ بشانہ
کرنے کے جذبے میں سرشار ہو کر ہندوستان کا بارڈر کراس کر گیا تھا۔ بہرحال م
یادیں میری زندگی کا بڑا قیمتی سرمایہ ہیں اور میں اس سرمائے اور وراثت کو اپنی دا
سناتے ہوئے پاکستان کی نئی نسل کے سینے میں منتقل کرنا چاہتا ہوں تا کہ پاکستان کی نئ
پاکستان کی خاطر ان کے آباؤ اجداد نے جو خون کی قربانیاں دی تھیں ان سے آگاہ
اور اسے پاکستان کی قدر و قیمت کا اندازہ ہو۔
بمبئی میں اپنا جو خاص آدمی خفیہ طور پر کام کر رہا تھا میں اس کا اصلی نام اور
پیشہ نہیں بتاؤں گا اور وہ جگہ بھی نہیں بتاؤں گا جہاں وہ رہتا تھا اور کام کرتا تھا۔ آ
کا کوئی بھی فرضی نام رکھ لیں۔ چلئے نادر خان رکھ لیں اور یہ سمجھ لیں کہ وہ بمب
محلے میں پراپرٹی ڈیلر کے طور پر کام کرتا تھا۔ مجھے شاہ دین نے اس کا پورا پتہ بتا دیا

ر نائیک شریف نے بمبئی کے سنٹرل سٹیشن سے نکلتے ہی بارش میں بھیگتی ہوئی ایک ٹیکسی
پکڑی اور اپنے آدمی نادر خان کے پاس پہنچ گئے۔ وہ ایک گنجان بازار کی چھوٹی سی گلی میں
یک تنگ سی دکان کے اندر بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ میں نے نائیک شریف کو باہر ہی کھڑے
ہنے دیا اور نادر خان کے پاس جا کر سلام کیا اور کہا کہ مجھے بمبئی میں کرائے کی کوئی کوٹھی
ہیئے۔ وہ کرائے پر عمارتیں' فلیٹ اور کوٹھیاں بھی دلوانے کا کام بھی کرتا تھا۔ اس نے
خبار پر سے نظریں اٹھائے بغیر آہستہ سے کہا۔
"کتنا کرایہ دے سکتے ہیں آپ؟"
میں نے اس کے جواب میں خفیہ کوڈ کا وہ جملہ بول دیا جو شاہ دین نے مجھے بتایا تھا۔
در خان نے خفیہ کوڈ کا جملہ سنتے ہی نگاہیں اخبار سے ہٹا کر میری طرف گھور کر دیکھا۔ وہ
دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ شاہ دین نے فون پر اسے میرا جو حلیہ بتایا تھا کیا میرا وہی
لیہ ہے؟ جب اسے یقین ہو گیا تو اس نے مزید تصدیق کے لئے خفیہ کوڈ کا ایک لفظ بولا۔
شاہ دین نے مجھے اس کے جواب میں بولنے والا لفظ بھی بتا دیا تھا۔ میں نے تو نادر خان کو
کان میں داخل ہوتے ہی پہچان لیا تھا۔ اس کی تصویر میں نے شاہ دین کے پاس اچھی طرح
یکھی ہوئی تھی۔ جب میں اس کے کوڈ کے جواب میں خفیہ کوڈ کا لفظ بولا تو اس نے اخبار
کو پھر سے پڑھنا شروع کر دیا اور میری طرف دیکھے بغیر آہستہ سے پوچھا۔
"نائیک شریف تمہارے ساتھ ہی ہے؟"
میں نے کہا۔
"ہاں۔ وہ دکان کے باہر کھڑا ہے"
نادر خان نے اخبار میز پر رکھا۔ میز کا دراز کھول کر کاپی باہر نکالی۔ اس کے ایک صفحے
پر کچھ لکھا اور کاغذ کاپی سے الگ کر کے مجھے دیتے ہوئے کہا۔
"اس جگہ پہنچ کر میرا انتظار کرو۔ مجھے دیر ہو جائے تو تم لوگ نے وہاں سے کہیں
نکل جانا۔ اب جاؤ"
میں نے کاغذ کو پڑھا بھی نہیں تھا اور اسے تہہ کر جیب میں رکھا اور دکان سے اتر کر

گلی میں آگیا۔ نائیک شریف ایک طرف بلڈنگ کی دیوار کے ساتھ کھڑا میرا انتظار کر
تھا۔ میں نے اسے اشارہ کیا۔ وہ میرے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ گلی سے نکل کر ہم بازار
سے گزرنے لگے۔ نائیک شریف مجھ سے ایک قدم پیچھے چل رہا تھا۔ بازار جہاں ختم
تھا وہاں سے جو سڑکیں دائیں بائیں نکلتی تھیں۔ یہاں ایک طرف جانوروں کے پانی پ
حوض بنا ہوا تھا۔ ایک وکٹوریہ یعنی بمبئی شہر کی بگھی کھڑی تھی جس کا گھوڑا حوض میں
ڈالے پانی پی رہا تھا۔ اس وقت بارش رکی ہوئی تھی اور فضا میں تھوڑا تھوڑا حبس
تھا۔ ایک ٹیکسی قریب سے گزری ٹیکسی خالی تھی۔ میں نے اسے ہاتھ دے کر روکا۔
دونوں ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا۔

"گیٹ وے آف انڈیا چلو"

نادر خان نے مجھے اسی جگہ جانے کو کہا تھا۔ کاغذ کے پرزے کو میں نے ٹیکسی
بیٹھنے سے پہلے ہی جیب سے نکال کر پڑھ لیا تھا۔ گیٹ وے آف انڈیا کی میں اس سے
بھی سیریں کر چکا تھا۔ یہ ایک چار دروازوں والی بارہ دری سی ہے جو انگریزوں کے
میں سمندر کے کنارے بمبئی کے شمال مغرب میں بنائی گئی تھی۔ یہ بمبئی کی بندرگ
قریب ہی واقع ہے۔ شام کو بمبئی کے لوگ یہاں تفریح کرنے کو آتے ہیں اور کش
بیٹھ کر سمندر کی سیر بھی کرتے ہیں۔ گیٹ وے آف انڈیا کی عمارت کے عقب
سیڑھیاں نیچے سمندر میں جاتی ہیں جہاں کشتیاں کھڑی ہوتی ہیں۔ اس زمانے میں ملا
سواری کا ایک روپیہ کرایہ لیتے تھے۔ کشتی سمندر میں تھوڑی دور تک لوگوں کو س
سیر کراتی ہے اور پھر واپس آجاتی ہے۔ چونکہ ابھی شام نہیں ہوئی تھی اس لئے گیٹ
آف انڈیا پر سیر و تفریح کرنے والے موجود نہیں تھے۔ دو تین کشتیاں عقب میں
کھڑی تھیں۔

ہم گیٹ وے آف انڈیا کی چار دیواری کے اندر ہو کر پتھر کے بنچ پر دیوار او
کی اوٹ میں بیٹھے تھے۔ سامنے بہت کشادہ چوک تھا۔ جس کی ایک جانب بمبئی
ہوٹل تاج محل کی مشرقی طرز کی برجیوں والی عمارت نظر آرہی تھی۔ اس کے پاس

ہائی رائز عمارتیں زیر تعمیر تھیں۔ تھوڑی دیر بعد کچھ فاصلے پر ایک ٹیکسی آکر رکی۔
ں میں سے نادر خان باہر نکل کر آہستہ آہستہ چلتا ہماری طرف آنے لگا۔ میں نے اسے
ن لیا تھا۔ مگر میں اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ میں نے نائیک شریف کو دکھا دیا کہ یہ نادر خان
۔ نادر خان گیٹ وے آف انڈیا کی محراب کے نیچے سے ہو کر چار دیواری کے اندر
یا۔ اس نے بھی ہمیں دیکھ لیا تھا۔ وہ ہمارے پاس ہی بنچ پر بیٹھ گیا اور بولا۔

"ہم کشتی کی سیر کریں گے"

میں نے کہا۔

"کشتی کا ملاح ہماری باتیں سن لے گا۔"

نادر خان بولا۔

"کشتی میں ہم کوئی بات نہیں کریں گے۔ تم چپ رہنا"

ہم نے سیڑھیاں اتر کر ایک کشتی لی۔ نادر خان نے اسے سمندر میں کسی جگہ چلنے کو
ا۔ اس جگہ کا نام میں بھول گیا ہوں۔ کشتی میں چھوٹا سا انجن لگا ہوا تھا۔ انجن شور مچاتا
رٹ ہوا اور کشتی آہستہ آہستہ سمندر میں چل پڑی۔ دور ایک جانب بڑے بڑے
ندری جہاز کھڑے تھے۔ سٹیمر بھی چل رہے تھے۔ جہازوں کے اوپر آبی پرندے منڈلا
ہے تھے۔ ہماری کشتی سمندر میں ایک طرف چلی جا رہی تھی۔ کچھ دور جانے کے بعد
نے ایک چھوٹا سا ٹیلہ دکھائی دینے لگا۔ یہ ایک چھوٹا سا جزیرہ تھا جہاں پبلک کے لئے سیر
ائی ہوئی تھی۔ ریستوران بھی تھے۔ لوگ یہاں بھی اپنی فیملی کے ساتھ سیر کے لئے
ئے تھے۔ میں اس جگہ پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔ ہم اس جزیرے میں اتر گئے۔ نادر خان
ں ایک اوپن ایئر ریستوران میں لے آیا۔ ریستوران کے پیچھے چھوٹے سے باغیچے میں
ں کی کرسیاں میز لگے تھے۔ اس وقت صرف ایک فیملی دور بیٹھی تھی۔ ہم ایک الگ
ر دیکھ کر بیٹھ گئے۔ نادر خان نے بیرے کو چائے لانے کے لئے کہا۔ لڑکا چلا گیا تو میں نے
ر خان سے نائیک شریف کا تعارف کرایا۔ نادر خان نے ایک نظر نائیک شریف پر ڈالی
ی قسم کے رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ اس نے نہرو کٹ واسکٹ کی جیب سے بیڑی نکال

کر سلگائی اور ماچس کی تیلی دور پھینکتے ہوئے بولا۔

میں نے کچھ ابتدائی معلومات حاصل کی ہیں ان کے مطابق بمبئی کی بندر گاہ سے ہر
میں تین مسافر بردار جہاز عرب امارات کو جاتے ہیں۔ لیکن پاک بھارت جنگ کی وجہ
مسافروں کی چیکنگ بہت سخت ہو گئی ہے۔ ہمیں سارے کاغذات جعلی بنوانے پڑیں گے
عام حالات میں کسٹم کا عملہ ان کی طرف زیادہ توجہ نہیں دیتا تھا مگر اب ایک ایک کاغذ
پاسپورٹ کی پوری پوری جانچ پڑتال کی جاتی ہے۔"

میں نے اپنے تجربے کی بنا پر اس سے پوچھا۔

"کیا ہم اپنے آدمی کو کسی مال بردار یا تیل بردار جہاز پر نہیں بٹھا سکتے؟ وہاں
پاسپورٹ وغیرہ کی بھی ضرورت نہیں پڑے گی"

نادر خان بولا۔

"ستمبر 65ء کی جنگ سے پہلے ایسا بڑی آسانی سے ہو جایا کرتا تھا مگر اب ایسا نہ
ہے۔ دوسرے ملکوں کے آئل ٹینکر یا مال بردار جہاز جیسے ہی بمبئی کی بندرگاہ میں د
ہوتے ہیں ان کے گرد انڈین نیوی کے جوانوں کا پہرہ لگ جاتا ہے۔ جہاز کے عملے کو
پرمٹ ایشو کئے جاتے ہیں۔ وہ یہ پرمٹ دکھا کر بندرگاہ کی گودی سے باہر جاتے ہیں
پرمٹ دکھا کر اپنے جہاز پر واپس آتے ہیں۔ کوئی فالتو آدمی نہ جہاز سے نکل سکتا ہے
نہ جہاز میں داخل ہی ہو سکتا ہے۔"

میں چپ ہو گیا۔ نائیک شریف بھی خاموش تھا۔ چائے آ گئی۔ نادر خان کہنے لگا۔

"مجھے تھوڑی مہلت دو۔ میں کوئی نہ کوئی راستہ ڈھونڈ نکالوں گا۔"

میں نے کہا۔

"تمہارے خیال میں ہمیں کہاں رہائش اختیار کرنی چاہیے؟"

وہ کچھ سوچنے کے بعد بولا۔

"پچھلے دنوں یہاں بندرگاہ کے ایک گودام میں کچھ دھماکے ہوئے تھے۔
گورنمنٹ کا خیال ہے کہ یہ دھماکے کشمیری کمانڈو نے کئے تھے۔ اس کی وجہ سے

گاہ کے اردگرد اور شہر میں بھی خفیہ پولیس کی سرگرمیاں بڑھ گئی ہیں۔ میں تمہیں کسی
میں ٹھہرنے کا مشورہ نہیں دوں گا۔ ہوٹل میں آنے جانے والوں پر خفیہ پولیس کے
کڑی نگاہ رکھتے ہیں۔ میں تمہارے ٹھہرنے کا ایک جگہ بندوبست کر دیتا ہوں۔"

اس نے بیڑی کا کش لگا کر اسے دور پھینک دیا اور چائے کا گھونٹ بھرنے کے بعد

"گیٹ وے آف انڈیا کے سامنے تاج محل ہوٹل کی جہازی عمارت ہے۔"

میں نے کہا۔

"ہاں۔ میں نے دیکھی ہوئی ہے۔"

پھر میں نے نادر خان کو بتایا کہ میں پہلے بھی دو ایک بار بمبئی آ چکا ہوں اور اس شہر کی
اور بازاروں سے تھوڑا بہت واقف ہوں۔ وہ کہنے لگا۔

"یہ اچھی بات ہے۔ تاج محل ہوٹل کے پیچھے ایک بازار ہے۔ اس بازار میں لکشمی
کے نام سے ایک سینما ہاؤس ہے۔ اس سینما ہاؤس میں اپنا ایک آدمی اسسٹنٹ فلم
ہے یہاں اس نے اپنا نام جعفر بھائی رکھا ہوا ہے۔ وہ سینما ہاؤس کی بلڈنگ کے ایک
میں ہی رہتا ہے۔ میں یہاں سے سیدھا اس کے پاس جاؤں گا اور تم دونوں کے
میں اس سے بات کر کے واپس اپنی دکان پر چلا جاؤں گا۔ تم میرے جانے کے ایک
بعد لکشمی سینما پہنچ کر جعفر بھائی سے مل لینا۔ وہ تمہارے ٹھہرنے کا انتظام کر دے
"

میں نے کہا۔

"اگر جعفر بھائی تمہیں اس وقت وہاں نہ ملا تو پھر ہمیں کہاں جانا ہو گا؟"

نادر خان بولا۔

"ہمارے آپس میں دن کے کچھ اوقات طے ہیں۔ ان اوقات میں جعفر بھائی ہر
سینما ہاؤس میں ہی رہتا ہے۔ مجھے معلوم ہے اس وقت وہ سینما ہاؤس میں ہی ہو
"

اس نے گھڑی دیکھی اور جیب سے دو اڑھائی سو روپے کے انڈین کرنسی کے نو
نکال کر آہستہ سے میری طرف بڑھائے۔

"یہ تم اپنے پاس رکھو اور یہاں سے اکٹھے مت نکلنا۔ آگے پیچھے ہو کر جانا۔ میر
تمہاری ملاقات اگر ضروری ہوئی تو میں تمہیں جعفر بھائی کے ہاں ہی ملوں گا۔ اب میں جا
ہوں۔ تم میرے جانے کے بعد الگ الگ ہو کر موٹر بوٹوں میں آنا۔"

وہ چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد نائیک شریف کہنے لگا۔

"لگتا ہے اس طرف سے نکلنا مشکل ہے۔ اس سے اچھا تھا کہ میں آزاد کشمیر
طرف سے نکلنے کی کوشش کرتا"

میں نے کہا۔

"تم مجھ سے بہتر جانتے ہو کہ وہاں دونوں طرف فوجیں پوزیشنوں میں بیٹھی ہیں
ایک ایک گھاٹی میں دن رات پٹرول پارٹیاں گشت لگاتی ہیں۔ بارڈر پوری طرح سیل
دیئے گئے ہیں۔"

نائیک شریف نے آگے سے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"جوان! فکر نہیں۔ ہم تمہیں پاکستان ضرور پہنچائیں گے۔ پاکستان کو اگر یہاں ہمار
ضرورت ہے تو پاکستان کی سلامتی کے لئے وہاں تمہاری ضرورت ہے۔ یہاں جو لوگ ا
زندگیاں خطرے میں ڈال کر پاکستان اور کشمیر کی آزادی کی کاز کے لئے کام کر رہے ہ
ان کے رابطے ایسی ایسی جگہوں پر ہیں کہ جن کا ہم تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ میں نے ا
کے کارنامے دیکھے ہوئے ہیں۔ تمہارا ادھر ہی سے پاکستان جانے کا انتظام ہو جائے گا۔ ا
پہلے میں جاتا ہوں۔ میرے جانے کے بعد تم دوسری کشتی یا موٹر بوٹ میں روانہ ہو جا
میں گیٹ وے آف انڈیا میں اسی جگہ بنچ پر بیٹھا تمہارا انتظار کروں گا۔ جب تم آؤ گے
میں وہاں سے تاج محل ہوٹل کی طرف چل پڑوں گا۔ تم تھوڑا وقفہ ڈال کر میرے
پیچھے آجانا۔ اللہ مالک ہے۔"

یہ کہہ کر میں نے چائے کے بل کی رقم وہیں میز پر رکھ دی اور اٹھ کر سمندر

طرف چلنے لگا۔ چھوٹی کشتیاں اور موٹر بوٹیں وہاں سے چلتی ہی رہتی تھیں۔ ایک موٹر
بوٹ مجھے لے کر روانہ ہو گئی۔ گیٹ وے آف انڈیا کی سیڑھیوں کے پاس ہی میں کشتی
سے اترا اور اوپر چار دیواری کے اندر بینچ پر بیٹھ گیا۔ مجھے وہاں سے سمندر صاف نظر آرہا
تھا۔ کچھ دیر بعد ایک دوسری موٹر بوٹ آکر وہاں ٹھہر گئی۔ اس میں تین چار سواریاں
تھیں۔ ان میں ہمارا جوان نائیک شریف بھی تھا۔ جب وہ اوپر آیا اور اس نے مجھے دیکھ لیا
تو میں اٹھ کر گیٹ وے آف انڈیا کی عمارت سے نکل کر تاج محل ہوٹل کی طرف چل
پڑا۔ چوک بہت بڑا تھا۔ اس میں کئی سڑکیں چلتی تھیں جن پر ٹریفک جاری تھا۔ ایک جگہ
سگنل کی بتی پر میں رک گیا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ نائیک شریف آہستہ آہستہ چلا آرہا
تھا۔ میں سڑک کراس کر گیا۔ سامنے تاج محل ہوٹل کی عظیم الشان مغل طرز تعمیر کی
عمارت تھی۔

تاج محل ہوٹل کے پیچھے ایک لمبا بازار تھا۔

اسی بازار میں آگے جا کر لکشمی سینما ہاؤس تھا۔ نائیک شریف بڑا عقل مند جوان تھا۔ سینما کی لابی میں داخل ہونے کے بعد اس نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی اور دیوار پر لگی ہوئی فلم کی تصویریں دیکھنے میں مصروف ہو گیا تھا۔ میں نے سینما کے ایک ملازم سے جعفر بھائی کے بارے میں پوچھا۔ اس نے ایک طرف اشارہ کر کے کہا۔

"اس باجو میں آگے گلی میں اس کا چالی ہے۔"

یعنی بغل میں ایک گلی ہے جہاں جعفر بھائی کا کمرہ تھا۔ میں نے ایک نگاہ نائیک شریف پر ڈالی اور سینما ہاؤس کی بغلی گلی میں مڑ گیا۔ یہاں سینما کے کسی پرانی فلم کے بڑے بڑے بورڈ دیوار کے ساتھ کھڑے تھے۔ ایک طرف دو تین کوٹھڑیوں کے دروازے تھے جو بند تھے۔ ایک کوٹھڑی کے باہر ایک آدمی سگریٹ پی رہا تھا۔ اس کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ مگر نوجوان بھی نہیں تھا۔ پرانی سی پتلون اور میلی سی قمیض پہنی ہوئی تھی۔ ماتھے کے آگے سے سر کے بال اڑنے شروع ہو گئے تھے۔ رنگ کھلتا ہوا تھا۔ وہ میری طرف اور مجھ سے تین قدم پیچھے آتے ہوئے نائیک شریف کی طرف بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔

میں نے اس کے پاس جا کر کہا۔

"جعفر بھائی کہاں ملے گا؟"

وہ خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا۔ پھر سگریٹ نالی میں پھینکا اور بولا۔

"اندر آجاؤ"

اس نے کوٹھڑی کا دروازہ کھول دیا۔ میں اور میرے پیچھے پیچھے نائیک شریف کوٹھڑی میں داخل ہو گیا اندر ایک طرف چارپائی پر میلا سا بستر بچھا ہوا تھا۔ آدھے فرش کو پتلی چٹائی نے ڈھانپ رکھا تھا۔ خدا جانے کیا کیا الا بلا وہاں پڑی تھی۔ میں نے کہا۔

"ہمیں جعفر بھائی سے ملنا ہے۔ ہم دلی سے آئے ہیں۔"

اس نے ہمیں چارپائی پر بیٹھ جانے کا اشارہ کیا اور خود سامنے پڑی بینت کی کرسی پہ بیٹھ گیا۔

"میں ہی جعفر بھائی ہوں"

وہاں کے لئے ایک خاص کوڈ ورڈ تھا۔ جو مجھے نادر خان نے کشتی میں بیٹھتے ہوئے اپنا منہ میرے کان کے قریب کرتے ہوئے بتایا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ یہ کوڈ ورڈ ہمارے ساتھی نائیک شریف کو بھی معلوم ہو۔ میں نے جعفر بھائی سے کہا۔

"پنسل کاغذ مل جائے گا؟"

جعفر بھائی خاموش نظروں سے ہم دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ ابھی تک اس نے اصل موضوع پر کوئی بات نہیں کی تھی۔ یقیناً وہ تصدیق چاہتا تھا کہ میں ہی وہ آدمی ہوں جس کے بارے میں نادر خان اسے بہت کچھ بتا گیا ہوا تھا۔ جب میں نے پنسل کاغذ مانگا تو جعفر بھائی نے ایک صندوق کے اوپر سے پرانی سی کاپی اور جیب سے پنسل نکال کر مجھے دی۔ میں نے نائیک شریف کی نظریں بچاتے ہوئے کاپی پر خاص کوڈ ورڈ لکھ کر کاپی جعفر بھائی کے آگے کر دی۔ اس نے غور سے کوڈ لفظ پڑھا۔ پھر اپنی طرف سے اس کے نیچے ایک اور خفیہ لفظ لکھ دیا۔ جب ہم دونوں کو یقین ہو گیا کہ ہم اصلی آدمی ہیں تو وہ کہنے لگا۔

"نادر خان ابھی ابھی یہاں سے گیا ہے۔ اس نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ آپ لوگوں کو اس کوٹھڑی میں ہی رات گزارنی ہو گی مجھے افسوس ہے کہ اس سے زیادہ بہتر جگہ میرے پاس نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔

"کوئی بات نہیں جعفر بھائی! ہم بڑے سخت جان ہیں۔ ہم یہاں بڑے آرام سے رہ

لیں گے۔"

نادر خان نے اشارہ دیا تھا کہ یہی شخص جعفر بھائی نائیک شریف کو کسی سمندری جہ
کے ذریعے ہندوستان سے فرار ہونے میں مدد دے گا اور اس کے فرار کا انتظام کرے گا
مگر اس نے ابھی تک اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی تھی۔ میں نے اس سلسلے میں جع
اس سے کچھ پوچھنا چاہا تو اس نے بے نیازی سے کہا۔

"دیکھا جائے گا۔ ابھی تم لوگ آرام کرو"

دوپہر کا کھانا ہم نے وہیں جعفر بھائی کے چھوٹے سے کمرے میں بیٹھ کر کھایا۔ جع
بھائی کی شخصیت نے ہمیں کوئی زیادہ متاثر نہ کیا۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ شخ
نائیک شریف کے فرار کا کوئی بندوبست کر سکے گا جو بہت مشکل کام تھا۔ نائیک شریف۔
بھی اس شخص کی طرف سے کس قدر مایوسی کا اظہار کیا۔ مگر میں نے اسے کہا کہ یہ لو
بظاہر ایسے ہی نظر آتے ہیں مگر ان کے رابطے بڑی دور دور تک اور زود اثر ہوتے ہیں
لیکن میرا دل نہیں مانتا تھا۔

رات کو ہم وہیں کوٹھڑی میں پڑ کر سو گئے۔ وہ آدمی رات کے بعد جب شو ختم ہوا
کسی وقت آکر وہیں ایک طرف سو گیا۔ صبح ہم اٹھے تو وہ ابھی تک سو رہا تھا۔ پھر وہ
جاگ پڑا۔ ہم ناشتہ کرنے لگے۔ اس نے یعنی جعفر بھائی نے کہا۔

"میں تم لوگوں کے کام کے لئے جا رہا ہوں تم لوگ اس کمرے میں ہی رہنا بغیر
ضرورت کے باہر نہ نکلنا"

وہ چلا گیا۔ کوٹھڑی کو اس نے باہر سے تالا نہیں لگایا تھا۔ ہم نے اندر سے کنڈی
نہیں لگائی تھی۔ بس دروازہ بند کر لیا تھا۔ وہ شاید اپنی ڈیوٹی سے چھٹی لے کر گیا تھا۔ دن
کا شو شروع ہو گیا تھا مگر جعفر بھائی ابھی تک نہیں آیا تھا۔ دوپہر کا شو بھی ختم ہو گیا
کوٹھڑی میں بیٹھے بیٹھے تنگ آ گئے تھے۔ مگر جعفر نے ہمیں اشد ضرورت کے بغیر باہر جا
سے منع کر رکھا تھا۔ اتنے میں کسی نے دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔

میں نے نائیک شریف کی طرف اور اس نے میری طرف دیکھا۔ ہم میں سے

بھی دروازہ کھولنا نہیں چاہتا تھا۔ جب تیسری چوتھی بار دستک ہوئی تو میں نے نائیک
شریف کو چارپائی پر چادر میں منہ سر لپیٹ کر لیٹ جانے کے لئے کہا۔ وہ جلدی سے
چارپائی پر لیٹ گیا اور اس نے سارے جسم کو چادر میں لپیٹ لیا۔ اس نے اپنا چہرہ بھی چادر
میں چھپا لیا تھا۔ میں اٹھ کر دروازے کے پاس گیا اور اسے کھولے بغیر پوچھا۔

"کون ہے؟"

دوسری طرف سے کسی مرد کی بھاری آواز آئی۔

"جعفر بھائی اندر ہے کیا؟"

میں نے کہا۔

"وہ نہیں ہے۔"

باہر سے آواز آئی۔

"یہ لڈو رکھ لیں۔ نیاز کے ہیں قاسم بھائی نے بھیجے ہیں۔"

میں نے دروازے کا ایک پٹ کھول کر دیکھا۔ گلی میں ایک دبلا پتلا زرد چہرے والا
آدمی ہاتھ میں پلیٹ لئے کھڑا تھا۔ پلیٹ میں تین لڈو تھے۔ میں نے اس کے ہاتھ سے
پلیٹ پکڑ لی اور کہا۔

"نہیں ٹھہریں۔ میں پلیٹ واپس لاتا ہوں"

اس شخص کی عمر پچاس کے قریب ہو گی۔ کنپٹیوں کے بال سفید ہو رہے تھے۔ سر
درمیان سے گنجا تھا۔ وہ بڑی دیدہ دلیری سے میرے پیچھے پیچھے کمرے میں آگیا۔ میں اسے
روک نہ سکا کہ شاید جعفر بھائی کا کوئی بے تکلف دوست ہے۔

"یہ جعفر بھائی سو رہا ہے کیا؟"

اس نے چارپائی پر چادر تان کر لیٹے ہوئے نائیک شریف کی طرف دیکھتے ہوئے
پوچھا۔

میں نے جلدی سے لڈو وہیں ایک تھالی میں رکھے اور خالی پلیٹ اس کی طرف
بڑھاتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ جعفر بھائی باہر گیا ہوا ہے۔"

اور میں اسے دروازے کے پاس لے آیا۔ اس نے میری طرف غور سے دیکھ
پوچھا۔

"تم جعفر بھائی کے کون لگتے ہو؟ میں تمہیں پہلی بار دیکھ رہا ہوں"

میں نے کہا۔

"میں اس کا دوست ہوں۔ شکریہ"

وہ دروازے سے باہر نکلا تو میں نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔ نائیک شریف
اپنے منہ پر سے چادر ہٹادی اور کہا۔

"یہ آدمی مجھے مشکوک لگتا ہے"

میں نے کہا۔

"ہم کیا کر سکتے ہیں۔ یہاں سے باہر بھی نہیں جا سکتے۔ خدا پر بھروسہ رکھو۔ جعفر
ہی ہو گا۔ ممکن ہے اس کا دوست ہو اور نیاز کے لڈو دینے ہی آیا ہو"

میں حیران ہوں کہ نائیک شریف کو اس پر کیسے شک پڑ گیا تھا جب کہ مجھے اس آ
میں کوئی شک شبہے والی بات نظر نہیں آئی تھی۔ اس وقت شروع رات کے سا
ساڑھے سات بجے کا ٹائم ہو گا۔ نائیک شریف کے شک کرنے کی وجہ سے مجھے اس آد
کے بارے میں کچھ بے چینی سی لگ گئی۔ میں پتہ کرنا چاہتا تھا کہ یہ آدمی کون تھا۔ مج
یونہی وہم ہونے لگا کہ یہ کوئی خفیہ پولیس کا آدمی تھا۔ میں نے نائیک شریف سے کہا۔

"تم یہیں بیٹھو۔ میں اس آدمی کا پتہ کر کے آتا ہوں کہ یہ کہاں گیا ہے"

میں تیزی سے کوٹھڑی سے نکل کر سینما ہاؤس کی لابی میں آگیا۔ دوسرا شو شروع ہو
ہوا تھا اور لابی تقریباً خالی پڑی تھی۔ وہ آدمی لابی میں نہیں تھا۔ میں لابی سے نکل کر ف
پاتھ پر آکر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ وہ آدمی کہیں نہیں تھا۔ میں واپس آگیا اور نائیک شریف
بتایا کہ وہ آدمی باہر کہیں نہیں تھا۔ شریف کہنے لگا۔

"میرا خیال ہے ہمیں یہاں نہیں ٹھہرنا چاہئے۔ مجھے کچھ خطرہ لگ رہا ہے"

میں نے کہا۔

"لیکن ہم جائیں گے کہاں؟ جعفر بھائی ہمارے ہی کام گیا ہوا ہے۔ آتا ہی ہو گا ہمیں
یہاں نہ پا کر وہ پریشان ہو گا ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

میں نے جانتے بوجھتے ہوئے خطرے کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں تھوڑی دیر میں
جعفر بھائی بھی آگیا۔ میں نے اسے بتایا کہ ایک آدمی آیا تھا۔ یہ لڈو دے گیا ہے۔ کہہ رہا
تھا کہ قاسم بھائی نے بھجوائے ہیں۔ جعفر جیسا کھڑا تھا ویسے ہی کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ بولا۔

"اس کا حلیہ کیا تھا؟"

میں نے اسے حلیہ بتایا تو وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے پوچھا۔

"قاسم بھائی کون ہے جس نے لڈو بھجوائے ہیں"

جعفر بولا۔

"میں کسی قاسم بھائی کو نہیں جانتا"

اس کے ساتھ ہی وہ کرسی سے اٹھا اور بولا۔

"جلدی سے میرے ساتھ آجاؤ۔ جلدی کرو"

میں سمجھ گیا کہ معاملہ گڑ بڑ ہے۔ ہمارے پاس تھا ہی کیا جو وہاں سے اٹھاتے۔ تین
کپڑوں میں تھے۔ جیسے ہی وہ دروازے سے نکلا۔ ہم بھی اس کے پیچھے پیچھے نکل پڑے وہ
سینما کی لابی کی طرف آنے کی بجائے سینما کی اس چھوٹی سی گلی میں آگے کی طرف چلنے
لگا۔ آگے دیوار کی وجہ سے گلی بند ہو جاتی تھی۔ مگر دیوار کے کونے میں ایک چھوٹا سا
دروازہ بنا ہوا تھا جس میں سے جھک کر ہم دوسری طرف نکل گئے۔ دوسری طرف کوئی
ایک اور تنگ گلی آگئی جہاں اندھیرا تھا۔ اوپر کسی جگہ سے ہلکی روشنی گلی میں پڑ رہی تھی۔
یہاں آتے ہی جعفر بھائی تیز تیز چلنے اور ہمیں بھی تیز تیز چلانے لگا۔ اس گلی میں سے ایک
اور تنگ سی بغلی گلی تھی۔ اس تنگ گلی میں جعفر بھائی ایک مکان کی ڈیوڑھی میں داخل ہو
گیا۔ کہنے لگا۔

"اوپر آجاؤ"

اس نے ڈیوڑھی کا دروازہ اندر سے بند کر کے کنڈی لگا دی اور ہمیں لے کر والے چھوٹے سے بوسیدہ کمرے میں آگیا۔ یہاں زمین پر صرف ایک چٹائی بچھی تھی کونے میں فلموں کے پرانے گول گول ڈبوں کا ڈھیر لگا تھا۔ دیوار کے ساتھ بجلی کا کمزور بلب جل رہا تھا۔ گلی کی طرف جو کھڑکی کھلتی تھی وہ بند تھی۔ کہنے لگا۔

"ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ وہ سی آئی ڈی کا آدمی تھا۔ اسی لئے میں تم لوگوں کو وہاں سے نکال کر یہاں لے آیا ہوں۔ تم لوگ یہاں نیچے بالکل نہ آنا۔ میرے جانے کے کمرے کی بتی بند کر کے چٹخنی اندر سے لگا لینا۔ کوئی لاکھ دروازہ کھٹکھٹائے۔ دروازہ بالکل نہ کھولنا۔ میں باہر حالات کا جائزہ لینے جا رہا ہوں۔"

وہ چلا گیا اور کافی دیر بعد واپس آیا۔ کہنے لگا۔

"اس آدمی کا مجھے کوئی سراغ نہیں مل سکا جو میری کوٹھڑی میں لڈو لے کر آیا تھا۔ اس کا صاف مطلب یہی نکلتا ہے کہ وہ خفیہ پولیس کا آدمی تھا۔ اب تمہیں جتنے دن شہر میں لگیں گے تمہیں اسی جگہ رہنا ہو گا۔ اور تم ایک منٹ کے لئے بھی یہاں سے باہر نہیں جاؤ گے۔ میں تمہیں کھانا پہنچا دیا کروں گا۔"

میں نے پوچھا۔

"نائیک شریف کا کوئی انتظام ہوا ہے کیا؟"

اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ دروازے کو اندر سے کنڈی لگا لینا۔ میں نیچے ڈیوڑھی میں تالا لگاتا جاؤں گا۔"

میں نے ہندوستان کے بڑے بڑے خوفناک جنگلوں میں کئی کئی دن اور راتیں گزاری ہیں مگر جو تین راتیں مجھے بمبئی کی اس اندھیری گلی کے تنگ کمرے میں قید کی حالت میں رہ کر گزارنی پڑیں وہ میں کبھی نہیں بھول سکوں گا۔ چوتھے دن جعفر بھائی نے آکر نائیک شریف سے کہا

"تمہارا بندوبست ہو گیا ہے۔"

ہمیں بڑی خوشی ہوئی۔ وہ ہمارے پاس بیٹھ گیا اور بولا۔

"آج رات کو تم دونوں کو یہاں سے میرے ساتھ ایک اور جگہ چلنا ہو گا۔"

میں نے پوچھا۔

"کیا کسی مسافر بردار جہاز میں انتظام ہوا ہے؟"

جعفر نے کہا۔

"اس کو تم چھوڑو۔ ایک سمندری مال بردار جہاز آج رات تین بجے بمبئی کی بندرگاہ سے بصرے کی جانب روانہ ہونے والا ہے۔ اپنے جوان کو اس جہاز میں سوار کرا دیا جائے گا"

یہ ہمارے لئے واقعی بہت بڑی خوش خبری تھی۔ نائیک شریف کے چہرے پر بھی پہلی بار رونق دیکھ رہا تھا۔ وہ دن بھی گزر گیا۔ جعفر بھائی دوسرا شو ختم ہونے کے بعد کوئی بارہ سوا بارہ بجے ہمارے پاس آیا اور آتے ہی بولا۔

"نکل چلو"

ہم پہلے سے تیار بیٹھے تھے۔ اس قید خانے سے نکل کر ہم اندھیری گلی میں سے گزر کر ایک بازار میں آگئے۔ یہاں ایک ٹیکسی پہلے سے کھڑی ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ ٹیکسی کی ہیڈ لائیٹس بجھی ہوئی تھیں۔ ٹیکسی والا بھی کوئی اپنا آدمی لگتا تھا۔ ہم ٹیکسی میں بیٹھ گئے تو جعفر بھائی نے اسے کہا۔

"چلو بابو"

ٹیکسی چل پڑی۔ ہم بمبئی کی روشن اور ماڈرن سڑکوں سے ہٹ کر ویران اور خالی خالی سڑکوں پر جا رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد سمندر کی نم دار ہوا مجھے محسوس ہوئی۔ پھر دور سمندر میں سمندری جہازوں کی روشنیاں اور پانی میں ان روشنیوں کے عکس نظر آنے لگے۔ ٹیکسی ایک بہت بڑے اور اونچی اونچی دیواروں والے مال گودام کے پیچھے دیوار کے پاس آکر رک گئی۔ ٹیکسی ڈرائیور جس کو جعفر بھائی نے بابو کہہ کر بلایا تھا ہمارے ساتھ ہی ٹیکسی سے نکل آیا۔ مال گودام کے آس پاس گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ مال

گودام کا بڑا دروازہ بند تھا۔ ہم ایک چھوٹے دروازے سے اندر داخل ہو گئے۔ اند
لکڑی اور لوہے کے بڑے بڑے کریٹ ایک دوسرے کے اوپر دیوار کے ساتھ چھت تک
لگے ہوئے تھے۔ یہ بندرگاہ کا مال گودام تھا۔ وہاں روشنی ہو رہی تھی۔ سوائے ہمارے او
کوئی شخص وہاں موجود نہ تھا۔

اندر جاتے ہی جعفر بھائی اور ٹیکسی ڈرائیور بابو نے مل کر ایک جگہ سے لکڑی کا خا
بکس اٹھایا اور کونے میں دیوار کے ساتھ رکھ دیا۔ اس بکس کی شکل تابوت ایسی تھی جس
میں مردے کو لٹا کر قبر میں دفن کیا جاتا ہے۔ تابوت کے اندر گدا بچھا ہوا تھا۔ پہلو کی
دیواروں کے ساتھ گدیاں لگی تھیں۔ دیواروں میں جگہ جگہ اندر ہوا کے آنے جانے کے
واسطے سوراخ بنائے گئے تھے۔ میں نے جعفر بھائی سے پوچھا۔

"یہ کس لئے ہے؟"

اس نے نائیک شریف کی طرف اشارہ کیا اور کہا۔

"یہ اپنے جوان کے لئے ہے"

جو ڈرامہ بمبئی کی مال بردار گودی سے اس تابوت کو جہاز پر پہنچانے کے لئے تیار کیا
گیا تھا وہ یہ تھا کہ پرتگال کا ایک جہاز مال لے کر براستہ بمبئی بصرے جا رہا تھا۔ اس کے
کپتان سے اپنے آدمی جعفر بھائی کے پہلے ہی سے تعلقات تھے۔ ایک خاص رقم کے عوض
مال بردار جہاز کا کپتان نائیک شریف کو بمبئی سے اٹھا کر بصرے لے جانے کے لئے راضی
ہو گیا تھا۔ کپتان نے بندرگاہ کے عملے کے ایک کسٹم افسر کو ایک خاص رقم دے کر راضی
کر لیا تھا کہ وہ بمبئی سے ولائتی شراب کی دو سو بوتلیں سمگل کر کے بصرے اور دوبئی لے
جا رہا ہے جو ایک تابوت میں بند ہوں گی اور مشہور یہ کیا جائے گا کہ جہاز کے عملے کا ایک
آدمی متعدی بیماری کا شکار ہو کر مر گیا ہے۔ اس خیال سے کہ بمبئی کی بندرگاہ بیماری کے
جراثیم سے محفوظ رہے مردے کو تابوت میں بند کر دیا گیا ہے اور اسے اسی حالت میں
جہاز پر لوڈ کر دیا جائے گا اور خلیج کے سمندر میں تابوت سمیت پھینک دیا جائے گا۔ کسٹم
افسر چونکہ ساتھ ملا ہوا تھا اس لئے اس بارے میں زیادہ چھان بین نہ کی گئی اور کپتان کو

عملے کے فرد کی تابوت میں بند لاش جہاز پر لوڈ کرنے کی اجازت مل گئی۔ اب تابوت
شراب کی بوتلوں کی جگہ نائیک شریف کو لٹایا جانا تھا۔ اور مجھے، جعفر بھائی اور ٹیکسی
ائیور کو جو اپنا ہی آدمی تھا پادریوں کا لباس پہن کر تابوت کے ساتھ ہی جہاز پر جانا تھا اور
بت وہاں رکھوا کر واپس آ جانا تھا۔

نائیک شریف نے جھک کر تابوت کے سوراخوں کو دیکھا۔ جعفر بولا۔

"فکر نہ کرو۔ اس میں سے تمہیں تازہ ہوا آتی رہے گی اور تمہیں تابوت میں زیادہ
ے زیادہ آدھے گھنٹے کے لئے لیٹنا ہو گا۔ جہاز کے کیبن میں پہنچتے ہی تمہیں تابوت سے
ال لیا جائے گا۔"

ڈرائیور بابو نے کلائی پر بندھی گھڑی دیکھ کر کہا۔

"جعفر بھائی! وقت بہت کم رہ گیا ہے۔ ہمیں آدھے گھنٹے میں گودی پر پہنچ جانا چاہئے۔
ہتان کو ہم وہاں زیادہ دیر انتظار نہیں کرا سکتے۔"

جعفر نے ایک دوسرا بکس کھلوایا۔ اس میں سے ہم تین آدمیوں کے لئے پادریوں کا
ں تھا۔ سیاہ لمبے چغے۔ سیاہ بوٹ، گلے میں ڈالنے والے سیاہ مفلر اور چاندی کی چھوٹی
لیبیں، ہم نے فوراً اپنے اتار کر بکس میں رکھے اور پادریوں کا لباس پہن لیا۔
اور ہاتھوں میں چاندی کی چھوٹی صلیبیں تھام لیں۔
جعفر بھائی نے مجھے کہا۔

"تم بالکل خاموش رہ کر ہمارے ساتھ چلو گے"

نائیک شریف تابوت میں لیٹ گیا۔ تابوت کو بند کر کے چھوٹے چھ سات کیل لگا
یئے گئے۔ ہم نے تابوت اٹھایا اور اسے ٹیکسی کے اوپر رکھ کر رسیوں سے باندھ دیا اور
ری گاڑی رات کی تاریکی میں اس ویران گودام سے نکل کر بندرگاہ کی اس گودی کی
رف چل پڑی جہاں دوسرے ملکوں کے مال بردار جہاز لنگر انداز ہوتے تھے۔ یہ فاصلہ
ڑی نے پندرہ بیس منٹ میں طے کر لیا۔ ٹیکسی ایک گیٹ میں سے گزر کر دوسرے گیٹ
پاس آئی تو اسے روک دیا گیا۔ گارڈ نے ٹیکسی کے اوپر تابوت کو اور اندر تین پادریوں

کو بیٹھے ہوئے دیکھا تو اس نے اندر جانے کی اجازت دے دی۔ جعفر بھائی نے میرے
میں کہا۔

"پرتگالی کپتان نے ان لوگوں کو بتا دیا ہوگا"

ہماری گاڑی کافی بڑے پلیٹ فارم سے گزرتی ہوئی ایک گودی میں داخل ہوئی تو
نے ایک بہت بڑے جہاز کو دیکھا جو گودی کے ساتھ لگا ہوا تھا اور ایک جانب سے اس
کچھ مال اوپر چڑھایا جا رہا تھا۔ ایک سرخ ڈاڑھی والا وردی پوش مضبوط ڈیل ڈول
آدمی جو کپتان ہی تھا اپنے عملے کے چار پانچ آدمیوں کے ساتھ ہماری طرف آگیا۔ ک
کے عملے کا ایک افسر بھی وہاں موجود تھا۔ تابوت ٹیکسی کے اوپر سے اتارا گیا۔ کسٹم
انڈین افسر نے کپتان کی طرف ایک کاغذ جو تختی پر لگا ہوا تھا بڑھایا۔ کپتان نے اس
دستخط کر دیئے۔ ہم تینوں پادریوں کے بھیس میں چہرے سوگوار بنائے ہاتھ باندھے خامو
کھڑے تھے۔ تابوت اوپر لے جایا جانے لگا۔ ہم بھی تابوت کے پیچھے پیچھے جہاز پر چ
گئے۔ تابوت کو جہاز کے ایک کیبن میں رکھوا دیا گیا۔ کیپٹن نے عملے کے آدمیوں کو وہا
سے چلے جانے کا حکم دیا۔

جب کیبن میں ہم لوگ ہی رہ گئے تو جعفر بھائی نے ڈرائیور بابو سے کہا۔

"اسے کھول دو"

کپتان بھی ڈرائیور بابو کے ساتھ لگ گیا۔ انہوں نے چند لمحوں میں تابوت کا ڈھک
اٹھایا تو اندر نائیک شریف بالکل سیدھا لیٹا ہوا تھا۔ وہ فوراً اٹھ کر بیٹھ گیا اور میری طرف
دیکھ کر بولا۔

"مرنے سے پہلے قبر میں بند ہونے کا تجربہ ہو گیا ہے۔ کیا ہم جہاز پر آگئے ہیں؟"
میں نے کہا۔

"ہاں جوان! اب سمجھو کہ تم پاکستان پہنچ گئے"
کپتان سگار سلگاتے ہوئے بولا۔
"تم لوگوں کو تین منٹ میں جہاز سے اتر جانا ہوگا۔"

یہ کہہ کر وہ کیبن سے نکل گیا۔
میں نے نائیک شریف سے کہا۔

"جوان! یہ جہاز سب سے پہلے بصرے جا رہا ہے۔ بصرے کی بندرگاہ سے باہر تک
نہیں کپتان کا آدمی خود لے جائے گا۔ بصرے پہنچتے ہی تمہیں وہاں پاکستانی سفارت خانے
پہنچنا ہوگا اور انہیں بتا دینا کہ تم پاکستان کے جنگی قیدی ہو اور انڈیا کی قید سے فرار ہو کر
ئے ہو۔ ہمارے بارے میں وہاں کسی کو کچھ نہ بتانا۔ زیادہ سے زیادہ یہی کہنا کہ بمبئی کے
ب پاکستان سے محبت کرنے والے تاجر نے تمہیں ایک مال بردار جہاز پر سوار کرا دیا
ا"

جعفر بھائی نے جیب سے ایک لفافہ نکال کر نائیک شریف کو دیا اور کہا۔

"اس میں بصرے کی کرنسی کے کچھ نوٹ ہیں۔ پاکستانی سفارت خانے تک پہنچنے میں
تمہارے کام آئیں گے۔ خدا حافظ!"

اس وقت نائیک شریف تابوت سے نکل کر کیبن کے برتھ پر بیٹھا تھا۔ وہ اٹھ کر ہم
ں سے باری باری گلے لگ کر ملا۔ میں نے اس سے کہا۔

"پاکستان کی فضاؤں میں پہنچ کر وہاں کی ہواؤں کو وہاں کے شہروں کو وہاں کے پیارے
وں کو میرا سلام کہنا۔ پاکستان زندہ باد!"

نائیک شریف کی آنکھوں میں بھی شدت جذبات سے آنسو آگئے۔ جعفر بھائی بولا۔

"اب چلو بھائی۔"

ہم کیبن سے نکلے اور جہاز کی تنگ راہ داری سے گزرتے ہوئے جہاز پر لگی ہوئی
ی پر سے نیچے اتر گئے۔ اس وقت جہاز کے چلنے کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں اور
ے کی طرف جو تختہ جہاز پر لگایا گیا تھا وہ اٹھایا جا رہا تھا۔ ہم پادریوں کے بھیس میں
ار چہرے بنائے آہستہ آہستہ چلتے ٹیکسی میں جا کر بیٹھ گئے۔ بابو نے ٹیکسی وہاں سے باہر
اور جب ہم بندرگاہ کے علاقے سے نکل کر بمبئی کی کھلی اور ویران سڑک پر آئے تو
نے جعفر سے کہا۔

"جعفر بھائی! تم نے یہ بڑا کام کیا ہے میں تمہارا شکریہ کیسے ادا کروں؟"

جعفر بھائی بولا۔

"ہم تو یہاں اپنی ڈیوٹیاں ادا کر رہے ہیں۔ اور جہاد کشمیر اور پاکستان کے فوجی جوانوں کے لئے تو ہماری ایک جان کیا ہزار جان حاضر ہے۔ پاک فوج کے جوان اور افسر اسلام کے شیر ہیں۔"

گودام میں واپس آکر ہم نے پادریوں والا لباس اتار کر اپنے اپنے کپڑے پہنے اور ایک بار پھر ٹیکسی میں سوار ہو کر رات کے اندھیرے میں بمبئی کی سڑکوں پر روانہ ہو گئے۔ ٹیکسی ڈرائیور بابو ہمیں جعفر بھائی کے گھر والی تنگ و تاریک گلی کے باہر چھوڑ کر چلا گیا۔ اس وقت رات کا آخری پہر گزر رہا تھا۔ جعفر کہنے لگا۔

"اب تمہارا کیا پروگرام ہے؟"

میں نے کہا۔

"میں اب واپس سری نگر اپنے کمانڈر شیرواں کے پاس جاؤں گا انہیں میری ضرورت ہو گی۔"

"ٹھیک ہے۔ بمبئی سنٹرل سے دلی کی طرف ایک گاڑی دن کے سوا نو بجے چھوٹتی ہے۔ ایک گاڑی رات کے نو بجے بمبئی سنٹرل ہی سے دلی کی طرف روانہ ہوتی ہے۔ میں تمہیں رات کی گاڑی پکڑنے کا مشورہ دوں گا۔"

میں نے کہا۔

"جیسے تم کہتے ہو میں ویسے ہی کروں گا۔"

جعفر بولا۔

"پھر تم آج رات کی گاڑی سے چلے جانا میں تمہارے لئے بمبئی سنٹرل سے دلی تک کا ٹکٹ شام کو لیتا آؤں گا۔ میں دن کے وقت نہیں آسکوں گا۔ تمہارا کھانا یہاں پڑا ہے اسے گرم کر کے کھا لینا۔ تھرمس میں چائے بھی پڑی ہے خدا حافظ!"

جعفر بھائی چلا گیا۔ میں چٹائی پر لیٹ گیا اور سوچنے لگا کہ میں نادر بھائی کو اپنے مشن

کامیابی کی رپورٹ کیسے دوں۔ پھر خیال آیا کہ جعفر بھائی اسے خود ہی بتا دے گا۔ میرا جانا ٹھیک نہیں۔ اور پھر مجھے جعفر نے مکان سے باہر نکلنے سے منع کیا تھا۔

دن کسی نہ کسی طرح اس چھوٹے سے کمرے کے قید خانے میں گزر گیا۔ حیرانی کی بات تھی کہ گلی میں دو تین اور مکان بھی تھے مگر کبھی کوئی آواز سنائی نہیں دی تھی۔ لگتا تھا کہ سارے مکان خالی ہیں۔ شام کے وقت جعفر بھائی آیا۔ وہ میرے لئے ریل کا ٹکٹ اور کھانے پینے کو لایا تھا۔ یہ بمبئی سے دلی تک کا تھرڈ کلاس کا ٹکٹ تھا۔ کہنے لگا۔

"مزید پیسوں کی ضرورت ہو تو مجھ سے لے سکتے ہو"

میں نے کہا۔

"نادر خان نے مجھے جو پیسے دیئے تھے وہ سری نگر پہنچنے کے لئے کافی ہوں گے۔"

جب میں نے اسے کہا کہ وہ ہمارے کامیاب مشن کی خبر نادر خان کو پہنچا دے تو جعفر بھائی بولا۔

"یہ خبر میں نے کل رات ہی اسے پہنچا دی تھی۔"

جعفر بھائی نے جیب سے بیڑی نکال کر سلگائی اور کش لگا کر کہنے لگا۔

"تم یہاں سے ساڑھے آٹھ بجے کے قریب نکل جانا۔ تم اکیلے ہی جاؤ گے میں تمہارے ساتھ نہیں ہوں گا۔ راستے میں کسی جگہ مت رکنا۔ ٹیکسی موٹر رکشا جو بھی ملے لے کر نکل جانا۔ بس میں نہ بیٹھنا۔ باقی تم خود جانتے ہو کہ تمہیں کیا کیا احتیاط کرنی ہے۔ جاتی دفعہ ڈیوڑھی کا دروازہ بند کر جانا۔ اچھا۔ خدا حافظ!"

میں جعفر بھائی کو گلے ملنا چاہتا تھا مگر اس آدمی نے صرف مجھ سے ہاتھ ملایا اور چلا گیا۔ ٹھیک ہے۔ باعمل آدمی تکلفات سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

ساڑھے آٹھ بجنے میں ابھی دو گھنٹے باقی تھے۔ میں نے بڑی مشکل سے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ اس قید تنہائی میں گزارا اور باہر جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ سب سے پہلے میں نے پتلون کی سیدھے ہاتھ کی جیب میں رکھی ہوئی زہریلی بال پوائنٹ پنسل کو نکال کر چیک کیا۔ بال پوائنٹ کا رخ دیوار کی طرف کر کے اس کا خشخاش کے برابر خفیہ بٹن [illegible]

دبایا۔ سن کی معمولی سی آواز آئی اور بال پوائنٹ میں سے زہریلی سوئی فائر ہو کر دیوار میں جا گھسی۔ مجھے بال پوائنٹ کی نوک میں سے زہریلی سوئی نکلتی نظر نہیں آئی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر جھک کر دیوار کو دیکھا۔ دیوار کی سفیدی ایک جگہ سے نقطے کے برابر اکھڑی ہوئی تھی۔ میں نے مزید غور سے دیکھا۔ وہاں دیوار میں بلب کی روشنی میں نقطہ چمکتا نظر آیا۔ یہ زہریلی سوئی ہی تھی۔ میں نے بال پوائنٹ جیب میں اچھی طرح سے سنبھال کر رکھ لیا۔ دوسری جیب میں سگریٹ کا پیکٹ اور ماچس تھی۔ پچھلی جیب میں کچھ نقدی کرنسی نوٹوں اور سکوں کی شکل میں موجود تھی۔ یہ آپ کو بتا ہی چکا ہوں کہ میں نے اپنی لمبی ڈاڑھی مونچھیں کاٹ کر بڑی چھوٹی چھوٹی کر لی تھیں۔ سر کے بال بھی گردن سے نیچے کاٹ دیے تھے تاکہ پہچانا نہ جا سکوں۔

مجھے بمبئے جھانسی بھوپال لائن سے دلی پہنچنا تھا۔ اس لائن پر کلکتے والا تازہ خطرہ نہیں تھا۔ لیکن راستے میں گوالیار کا سٹیشن پڑتا تھا۔ یہاں کے فوجی ٹارچر سینٹر سے بھی میں دشمن کے دو ایک فوجیوں کا خون کر کے بھاگا تھا۔ اگرچہ اس بات کو مہینہ گزر گیا تھا لیکن ملٹری اور سول پولیس میری تلاش میں ضرور ہو گی۔ چنانچہ میں نے سوچ لیا تھا کہ جب گوالیار کا سٹیشن قریب آ رہا ہو گا تو میں ریل کے ڈبے کے ٹائیلٹ میں گھس جاؤں گا اور کوشش کروں گا کہ جب تک گاڑی وہاں کھڑی رہے اندر ہی چھپا رہوں۔ میرا لباس اس وقت یہ تھا کہ پتلون کے اوپر قمیض تھی۔ قمیض کے اوپر ٹھنڈی جیکٹ تھی جس کے سارے بٹن کھلے تھے۔ زہریلی بال پوائنٹ میں پتلون کی جیب میں اس لئے رکھتا تھا کہ جیکٹ کی نسبت پتلون سے بال پوائنٹ نکال کر فائر کرنے میں آسانی ہوتی تھی۔ اور پھر خطرے کے علاقے میں آدمی پتلون میں ہاتھ ڈال کر بھی چل پھر سکتا تھا۔ جیکٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈال کر نہیں چل پھر سکتا تھا۔

جب میں نے محسوس کیا کہ میں چلنے کے لئے بالکل تیار ہوں تو اللہ کا نام لیا اور کمرے کی سیڑھیاں اتر کر نیچے ڈیوڑھی میں آیا۔ ڈیوڑھی کا دروازہ کھول کر باہر جھانک کر دیکھا۔ نیم اندھیرے میں گلی خالی پڑی تھی۔ میں نے باہر آ کر ڈیوڑھی کا دروازہ بند کر دیا

اور سر جھکا کر خاموشی سے پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر گلی میں سے گزرتا ہوا اس گلی میں آ گیا جو سینما ہاؤس والی گلی تھی۔ یہاں سے سینما ہاؤس کی لابی میں آ گیا لابی میں سے بھی بڑی بے نیازی سے ٹہلتا ہوا نکل کر فٹ پاتھ پر چلنے لگا۔ سوا چھ بجے والا شام کا شو ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ چوک میں شو ٹوٹنے پر سواریاں لینے کے لئے دو چار خالی ٹیکسیاں اور موٹر رکشا کھڑے تھے۔ مجھے سب سے پہلے ایک رکشا ہی ملا۔ میں اس میں بیٹھ گیا اور ڈرائیور سے کہا۔

"بمبئے سنٹرل چلو"

رکشا ڈرائیور نے کہا۔

"بابو ہم اپنی سواری کے لئے کھڑا ہے۔ تم دوسرا رکشا لے لو"

میں چپکے سے رکشے میں سے نکل آیا۔ ساتھ ہی دوسرا رکشا کھڑا تھا۔ اس کا ڈرائیور میری طرف بڑھا۔

"کہاں جائے گا بابو؟"

میں اسے وہاں کچھ نہیں بتانا چاہتا تھا لیکن پہلے رکشے والے نے اسے کہا۔

"بابو بمبئے سنٹرل جائے گا"

دوسرے رکشے والے نے بیڑی کا کش لگا کر اسے سڑک پر پھینکتے ہوئے کہا۔

"بیٹھے گا بابو۔"

اب ضروری ہو گیا تھا کہ میں رکشے میں بیٹھنے سے پہلے نگاہ ڈال کر ارد گرد کا جائزہ لے لوں۔ کیونکہ وہاں کچھ لوگ موجود تھے۔ میں نے جیسے ہی نظر ڈالی تو مجھے وہی گنجا آدمی نظر آیا جو جعفر بھائی کی کوٹھڑی میں نیاز کے لڈو لے کر آیا تھا اور جس کے بارے میں جعفر بھائی نے کہا تھا کہ وہ یقیناً خفیہ پولیس کا آدمی ہے۔ میں ایک دم محتاط ہو گیا۔ میں رکشے میں بیٹھ چکا تھا۔ اور میرے بیٹھتے ہی رکشا بھی چل پڑا تھا۔

جیسے ہی رکشا گھوم کر سڑک پر آیا میں نے رکشے کی عقبی کھڑکی میں سے پیچھے دیکھا۔ خفیہ پولیس والا ایک ٹیکسی میں بیٹھ رہا تھا۔ یہ مصیبت میرے پیچھے لگ گئی تھی۔ اب مجھے

بے حد محتاط ہو کر رہنا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ اس آدمی کو مجھ پر شک ضرور پڑا ہے کہ
کے پاس میرے کسی کمانڈو ایکشن سے ہونے والی تباہی کی کوئی اطلاع نہیں ہے۔ یعنی
یہ نہیں معلوم کہ میں کس قدر خطرناک کشمیری حریت پسند کمانڈو ہوں اور میں دشمن
کیسا کیسا ناقابل تلافی نقصان پہنچا چکا ہوں۔ اس کو میں وہاں ایک بالکل اجنبی شخص نظر
ہوں اور وہ محض اپنی ڈیوٹی پوری کرنے اور روزنامچہ بھرنے کی خاطر میرے پیچھے لگا
ہے۔ جب میں ریل گاڑی میں بیٹھ کر بمبئی شہر سے نکل جاؤں گا تو وہ بھی میرا پیچھا
دے گا۔

رکشا بمبئی کے روشن اور بارونق بازاروں میں سے گزر رہا تھا۔ میں نے
ہوشیاری سے پیچھے سڑک پر نگاہ ڈالی۔ ایک ٹیکسی تھوڑے فاصلے پر رکشے کے پیچھے
آرہی تھی۔ دوسری ٹیکسیاں اور گاڑیاں میرے رکشے کو اوورٹیک کر کے آگے نکل
تھیں مگر یہ ٹیکسی میرے آگے نہیں نکل رہی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ ٹیکسی میں خفیہ پولیس
والا گنجا آدمی بیٹھا ہے اور برابر میرا تعاقب کر رہا ہے۔ میں نے اسے زیادہ اہمیت نہ
یہ میری غلطی تھی۔ میں اس لئے مطمئن تھا کہ ایک تو میں نے بمبئی کے علاقے میں
کمانڈو ایکشن والی واردات نہیں کی ہے۔ دوسرے یہ خفیہ پولیس والا محض خانہ پری
لئے میرا پیچھا کر رہا ہے اور مجھے بمبئی شہر سے باہر جاتا دیکھ کر یہ اپنے آپ واپس چلا
گا۔ چنانچہ میں نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگا لیا اور خاموشی سے کش لگانے لگا۔
چوک سے گھوم کر دوسری سڑک پر آیا تو میں بڑی احتیاط سے پیچھے نگاہ ڈال لیتا۔ کم
خفیہ پولیس والے کی ٹیکسی برابر میرا پیچھا کر رہی تھی۔ کسی وقت مجھے کچھ بے چینی سی
لگ جاتی کہ یہ آدمی میرے لئے کوئی مصیبت کھڑی نہ کر دے۔ پھر یہ سوچ کر مطمئن
ہو جاتا کہ اگر ایسی صورت حال پیدا ہو گئی تو میں اسے آسانی سے ہلاک کر سکتا ہوں۔
نے رکشے والے سے کہا۔

"تیز تیز چلو بھائی"

بمبئی کا بوری بندر کے بعد دوسرا بڑا ریلوے سٹیشن بمبئے سنٹرل آ گیا۔ میں

ے اترا اور یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ میں ایک عام شہری ہوں جیبوں میں ہاتھ ڈالے سٹیشن
میں داخل ہو گیا۔ ٹکٹ میرے پاس ہی تھا۔ وہاں کوئی ایسا گیٹ نہیں تھا جس طرح
دوسرے شہروں کے ریلوے سٹیشنوں پر گیٹ بنے ہوتے ہیں جہاں مسافر ٹکٹ بابو کو ٹکٹ
دکھا کر پلیٹ فارم پر آتے ہیں۔ پلیٹ فارم سامنے ہی تھا۔ کتنے ہی پلیٹ فارم ساتھ ساتھ
بنے ہوئے تھے جہاں کہیں کہیں گاڑیاں بھی کھڑی تھیں۔ ان میں بمبئی کے مضافات میں
چلنے والی لوکل ٹرینیں بھی تھیں۔ لوکل ٹرین آکر کھڑی ہوتی۔ پہلے مسافر اترتے'
دوسرے مسافر سوار ہوتے اور ٹرین آگے جانے کی بجائے پیچھے کی جانب روانہ ہو جاتی۔
کیونکہ بمبئے سنٹرل کے کچھ پلیٹ فارم ایسے تھے جہاں سے ریلوے لائن بند ہو جاتی تھی۔
یعنی ٹرمینل سٹیشن تھے۔ جس پلیٹ فارم پر میں آیا تھا وہاں کوئی ٹرین نہیں کھڑی تھی۔ اس
زمانے میں وہاں میں نے یہ رواج دیکھا تھا کہ ٹکٹ ٹرین کے بمبئی شہر سے نکلتے ہی ڈبوں
میں چیک کیا جاتا تھا۔ اب مجھے معلوم نہیں وہاں کیا رواج ہو گا۔ اسی طرح جب میں بمبئی
آیا تھا تو سٹیشن آنے سے کوئی دس پندرہ منٹ پہلے ہمارے ڈبے میں ایک ٹی ٹی آ گیا تھا اور
اس نے سب مسافروں کے ٹکٹ چیک کئے تھے۔ جب ٹرین بمبئی کے سٹیشن پر پہنچی تھی
تو وہاں کسی نے ہمارے ٹکٹ نہیں دیکھے تھے۔ پلیٹ فارم کی دوسری جانب پارکنگ لاٹ
میں رکشے اور کاریاں کھڑی تھیں۔

میں ایک بک سٹال پر کھڑے ہو کر اخبار رسالے وغیرہ دیکھنے لگا۔ اصل میں میں پلیٹ
فارم کا جائزہ لے رہا تھا۔ اور یہ دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ خفیہ پولیس کا آدمی یہاں تک
آیا ہے کہ نہیں۔ پلیٹ فارم پر ابھی مسافروں کا رش نہیں ہوا تھا۔ کہیں کہیں مسافر
کھڑے تھے۔ کچھ لوگ سامان ایک جگہ رکھے اپنی عورتوں بچوں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ وہ
آدمی ان میں نہیں تھا۔ میں سمجھ گیا کہ چونکہ میں شہر سے نکل کر جا رہا ہوں اس لئے اس
نے میرا پیچھا چھوڑ دیا ہے۔ میں نے پلیٹ فارم کی گھڑی پر وقت دیکھا۔ ٹرین کے چلنے میں
ابھی پون گھنٹہ رہتا تھا۔ میں سیکنڈ کلاس کے مسافر خانے میں چلا گیا۔ یہاں ایک سکھ فوجی
اپنے سامان کے پاس بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ یہ شام کو چھپنے والا انگریزی کا اخبار تھا۔ اس

کے قریب ایک فیملی بیٹھی تھی۔ موٹی عورت نے ساڑھی پہنی ہوئی تھی اور اپنی چھوٹی
کو فراک پہنا رہی تھی۔ میں خاموشی سے باتھ روم میں چلا گیا۔ منہ پر پانی کے
مارے۔ وہاں تولئے لٹک رہے تھے۔ منہ صاف کر کے وہیں سے کنگھی اٹھا کر بالوں
پھیری۔ پھر باہر پلیٹ فارم پر آکر ٹی سٹال پر کھڑے ہو کر چائے کا گلاس لے کر چائے
لگا۔

اس دوران بھی میں نے پلیٹ فارم کا بھرپور جائزہ لیا۔ وہ گنجا سی آئی ڈی والا
نہیں تھا۔ اس کی طرف سے مجھے پوری طرح اطمینان ہو گیا کہ اب وہ یہاں نہیں آ
گا۔ اس نے روزنامچے میں درج کر لیا ہو گا کہ مشتبہ شخص شہر سے چلا گیا ہے اور ڈا
صدری کی جیب میں ڈال کر اپنے گھر چلا گیا ہو گا۔ چائے کا گلاس بھی ختم ہو گیا۔ ا
طرف بنچ پر بیٹھ گیا۔ تب کہیں جا کر آہستہ آہستہ رینگتے ہوئے ریل کی بوگیاں آئیں
ایک دھچکے کے ساتھ پلیٹ فارم پر آکر رک گئیں۔ اس وقت تک مسافروں کا کافی رش
گیا ہوا تھا۔ ٹرین کے لگتے ہی مسافروں نے ڈبوں پر ہلہ بول دیا۔ میں بھی پیچھے جا کر
کلاس کے ایک ڈبے میں بیٹھ گیا۔ میں ایسی سیٹ پر بیٹھا تھا جہاں ڈبے کا دروازہ قریب
تھا۔ میری سیٹ بھی کھڑکی والی تھی۔ آخر ٹرین چل پڑی۔ اس ٹرین کا نام مجھے یاد نہ
آرہا۔ راجدھانی ایکسپریس تھا یا کچھ اور تھا۔ بڑی فاسٹ ٹرین تھی۔ بمبئی کے مضافات
نکلتے ہی اس کی رفتار تیز ہو گئی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میرا مشن مکمل ہو گیا تھا
پاک فوج کا جوان دشمن کی قید میں نہیں رہا تھا۔ اس ٹرین کا روٹ بمبئی بھوپال گوالیار
جھانسی والا تھا۔ اسے دو راتوں اور ایک دن کے سفر کے بعد دلی پہنچنا تھا۔ میں نے سو
رکھا تھا کہ دلی پہنچ کر میرٹھ تک بس میں سفر کروں گا اور میرٹھ سے آگے پھر ٹرین پکڑو
گا۔ اس طرح میں لوگوں کی مسلسل نظر میں رہنے سے محفوظ رہوں گا۔

میں نے ڈبے میں سوار سبھی مسافروں کو غور سے دیکھا' یونہی اپنا شک دور کر
کے لئے۔ خفیہ پولیس والا آدمی ان میں نہیں تھا۔ اس بلا سے میرا ہمیشہ کے پیچھا چھو
چکا تھا۔ میں نے ہلکی سی جمائی لی اور کھڑکی کے ساتھ سر لگا دیا۔ نیند بالکل نہیں آ ر

تھی۔ ٹرین شور مچاتی کھیتوں اور نیم جنگلی علاقوں سے گزرتی جا رہی تھی۔ باہر سے ٹھنڈی
ور سبزے کی مہک والی ہوا کے تیز جھونکے اندر آ رہے تھے۔ جو بڑے خوشگوار لگ رہے
تھے۔ ایکسپریس گاڑی تھی۔ اس کے سٹاپ صرف بڑے بڑے سٹیشنوں کے ہی تھے۔
"پوری" کے سٹیشن پر ذرا دیر کے لئے رکی اور پھر چل پڑی۔ اگلا بڑا شہر دیولالی تھا جو ایک
گھنٹے بعد آیا۔ یہاں ٹرین رکی تو میں پلیٹ فارم پر اتر گیا۔ میرے سگریٹ ختم ہو گئے تھے۔
ٹال پر سے سگریٹوں کا پیکٹ خریدا اور ایک سگریٹ سلگا کر پلیٹ فارم پر ہی اس وقت
تک ٹہلتا رہا جب تک کہ انجن نے سیٹی نہ دی۔ سیٹی کی آواز پر میں آہستہ آہستہ اپنے
بے کی طرف بڑھا۔ ٹرین آہستہ آہستہ چلنے لگی تھی۔ میں اپنی سیٹ پر آکر بیٹھ گیا ڈبے
یں کچھ نئے مسافر آگئے تھے۔ کچھ پرانے مسافر اتر گئے تھے۔ میں نے ان مسافروں کی
طرف کوئی توجہ نہ دی اور چلتی ٹرین میں سے پلیٹ فارم کی روشنیاں دیکھنے لگا۔ جب ٹرین
آؤٹر سگنل سے بھی نکل گئی اور اس کی سپیڈ بھی تیز ہو گئی اور باہر بھی رات کا اندھیرا چھا
گیا تو میں کھڑکی سے ہٹ کر بیٹھ گیا۔ ڈبے میں کافی روشنی تھی۔ کچھ مسافر سو گئے تھے کچھ
ونے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ اچانک میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں نے دیکھا کہ وہی
فیہ پولیس والا ڈبے کے دروازے کے پاس ایک صندوق کے پاس بیٹھا باہر دیکھ رہا ہے
ر بیڑی پی رہا ہے۔ یقین کریں اس وقت ایک لمحے کے لئے میرے سارے جسم میں ڈر
ڑف کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ اگرچہ دوسرے لمحے میں اپنے حواس پر قابو پا چکا تھا۔ لیکن
ں خفیہ پولیس والے کی ڈبے میں موجودگی نے ایک بات ثابت کر دی تھی کہ اس کی نظر
ں میں بڑا اہم مجرم یا غیر ملکی جاسوس ہوں اور وہ مجھے اتنی آسانی سے چھوڑنے والا نہیں
ہے۔ میں اس کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا تھا۔ وہ کھڑکی میں سے باہر دیکھ رہا تھا۔
چانک اس نے گردن گھما کر میری طرف دیکھا۔ میں نے جلدی سے نگاہیں دوسری طرف
کر لیں۔ لیکن ہم نے ایک دوسرے کو پہچان لیا تھا۔ اب میں اس سے بچ نکلنے کی
ترکیبوں پر غور کرنے لگا۔ یہ شخص میرے لئے انتہائی خطرناک نشان بن چکا تھا۔ میری
مجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ وہ میرا مسلسل تعاقب کس لئے کر رہا ہے؟ اگر وہ مجھے

تھی۔ ٹرین شور مچاتی کھیتوں اور نیم جنگلی علاقوں سے گزرتی جا رہی تھی۔ باہر سے ٹھن
اور سبزے کی مہک والی ہوا کے تیز جھونکے اندر آ رہے تھے۔ جو بڑے خوشگوار لگ ر
تھے۔ ایکسپریس گاڑی تھی۔ اس کے سٹاپ صرف بڑے بڑے سٹیشنوں کے ہی تھ
"پوری" کے سٹیشن پر ذرا دیر کے لئے رکی اور پھر چل پڑی۔ اگلا بڑا شہر دیولالی تھا جو ا
گھنٹے بعد آیا۔ یہاں ٹرین رکی تو میں پلیٹ فارم پر اتر گیا۔ میرے سگریٹ ختم ہو گئے تھ
سٹال پر سے سگریٹوں کا پیکٹ خریدا اور ایک سگریٹ سلگا کر پلیٹ فارم پر ہی اس و
تک ٹہلتا رہا جب تک کہ انجن نے سیٹی نہ دی۔ سیٹی کی آواز پر میں آہستہ آہستہ اپ
ڈبے کی طرف بڑھا۔ ٹرین آہستہ آہستہ چلنے لگی تھی۔ میں اپنی سیٹ پر آکر بیٹھ گیا۔ ڈ
میں کچھ نئے مسافر آگئے تھے۔ کچھ پرانے مسافر اتر گئے تھے۔ میں نے ان مسافروں ک
طرف کوئی توجہ نہ دی اور چلتی ٹرین میں سے پلیٹ فارم کی روشنیاں دیکھنے لگا۔ جب ٹ
آؤٹر سگنل سے بھی نکل گئی اور اس کی سپیڈ بھی تیز ہو گئی اور باہر بھی رات کا اندھیرا
گیا تو میں کھڑکی سے ہٹ کر بیٹھ گیا۔ ڈبے میں کافی روشنی تھی۔ کچھ مسافر سو گئے تھے ک
سونے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ اچانک میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں نے دیکھا کہ
خفیہ پولیس والا ڈبے کے دروازے کے پاس ایک صندوق کے پاس بیٹھا باہر دیکھ رہا
اور بیڑی پی رہا ہے۔ یقین کریں اس وقت ایک لمحے کے لئے میرے سارے جسم میں
خوف کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ اگرچہ دوسرے لمحے میں اپنے حواس پر قابو پا چکا تھا۔ لیک
اس خفیہ پولیس والے کی ڈبے میں موجودگی نے ایک بات ثابت کر دی تھی کہ اس کی نظ
میں میں بڑا اہم مجرم یا غیر ملکی جاسوس ہوں اور وہ مجھے اتنی آسانی سے چھوڑنے والا نہ
ہے۔ میں اس کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا تھا۔ وہ کھڑکی میں سے باہر دیکھ رہا تھا۔
اچانک اس نے گردن گھما کر میری طرف دیکھا۔ میں نے جلدی سے نگاہیں دوسری طر
ں۔ لیکن ہم نے ایک دوسرے کو پہچان لیا تھا۔ اب میں اس سے بچ نکلنے
کیبوں پر غور کرنے لگا۔ یہ شخص میرے لئے انتہائی خطرناک نشان بن چکا تھا۔ مجھ
یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ وہ میرا مسلسل تعاقب کس لئے کر رہا ہے؟ اگر وہ مجھے

کشمیری حریت پسند یا پاکستانی جاسوس سمجھتا ہے تو اس نے مجھے بمبئی میں ہی گرفتار کیوں نہیں کروا دیا۔ آخر اسے میرے ساتھ ڈبے میں بیٹھ کر سفر کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ معمہ میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ لیکن میں نے اس گاڑی کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ٹکٹ میرے پاس موجود تھا۔ میں اس کے بعد کوئی دوسری گاڑی پکڑ سکتا تھا۔ ٹرین چھوڑنے کا طریقہ میں نے یہ سوچا کہ اب کوئی سٹیشن آئے گا اور ٹرین پلیٹ فارم پر کھڑی ہو گی تو میں سامنے جو سٹال بھی نظر آیا اس طرف منہ کر کے اونچی آواز میں کہوں گا۔

"کریم بھائی! کیا حال ہے؟ نہیں نہیں تم وہیں بیٹھے رہو۔ میں خود تم سے ملنے آتا ہوں"

لوگ اور خفیہ پولیس والا یہی سمجھے گا کہ میں سامنے سٹال والے سے مخاطب ہوں۔ پھر میں اتر کر سامنے سٹال پر جاؤں گا اور سٹال والے سے یونہی باتیں شروع کر دوں گا موقع پا کر سٹال کے پیچھے اس طرح جاؤں گا جیسے میں کسی چیز کی تلاش میں ہوں اور وہاں سے مسافروں کے ہجوم میں گھس کر گم ہو جاؤں گا اور پھر سٹیشن سے باہر نکل جاؤں گا۔ مجھے بالکل معلوم نہیں تھا کہ میری تقدیر کچھ اور ہی سوچ رہی ہے۔ اگلا سٹیشن ہی نہیں آ رہا تھا۔ میں نے ایک مسافر سے وقت پوچھا۔ رات کے گیارہ بجنے والے تھے۔ ٹرین بڑی تیز رفتاری سے خدا جانے کیسے کیسے جنگلوں میں سے گزرتی دوڑی جا رہی تھی۔ میری کھڑکی کے سامنے جھکے ہوئے درختوں کے ہیولے تیزی سے پیچھے گزرتے تو شائیں شائیں کی آوازیں آتیں۔

دلی بمبئے کے اس ریلوے روٹ سے میں خوب واقف تھا۔ مجھے فوراً خیال آیا کہ اگلا سٹیشن تو جل گاؤں ہے جو دو گھنٹے بعد آئے گا۔ شاید اسی لئے خفیہ پولیس والا بڑے اطمینان سے بیٹھا ہوا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ کم از کم جل گاؤں تک میں اس کی نظروں سے غائب نہیں ہو سکتا۔ اس شخص نے میرے اردگرد جو خطرناک جالا بن رکھا تھا وہ میرے گمان میں بھی نہیں تھا۔ حالانکہ مجھے اس کا علم ہونا چاہیے تھا۔ اور مجھے چلتی ٹرین میں ہی آنے والے خطرے کا سدباب کر لینا چاہیے تھا اور میں ایسا کر سکتا تھا۔ میرے پاس

اس شخص کو ہلاک کرنے کے واسطے ایسا ہتھیار تھا کہ جس کے فائر کی معمولی سی آواز بھ
نہیں آتی تھی اور آدمی اچانک یوں مرجاتا تھا جیسے اسے ہارٹ اٹیک ہو گیا ہو۔ لیک
انسان کی زندگی میں کبھی کبھی ایک ایسا وقت بھی آجاتا ہے جہاں سوچ سمجھ اور عقل رکھ
ہوئے بھی آدمی دھوکہ کھاجاتا ہے اور غافل ہو جاتا ہے۔

میں نے نظریں بچا کر دروازے کے پاس صندوق پر بیٹھے ہوئے خفیہ پولیس والے
دیکھا۔ وہ کھڑکی کی طرف منہ کئے چپ چاپ بیٹھا تھا۔ اس کے رویے سے یہ ظاہر ہو
تھا کہ وہ میرے لئے ٹرین میں سوار نہیں ہوا بلکہ وہ اپنے طور پر کسی دوسرے شہر جا
کے واسطے سفر کر رہا ہے۔ ایک لمحے کے لئے مجھے بھی یہی خیال آیا کہ اگر اس شخص
مجھے پکڑوانا ہی ہوتا تو اسے میرے ساتھ ٹرین میں سفر کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ بمبئ
میں ہی مجھے گرفتار کروا سکتا تھا۔ لیکن یہ بھی اپنی جگہ پر ایک حقیقت تھی کہ وہ لکشمی سین
گھر کے باہر مجھے رکشا میں سوار ہوتا دیکھ کر میرے پیچھے لگا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھ
کہ یہ شخص آخر مجھ سے کیا چاہتا تھا۔ میں اسی پر پیچ الجھن میں الجھا ہوا تھا کہ ٹرین کی
رفتار ہلکی ہونے لگی۔ کوئی بڑا سٹیشن آرہا تھا۔ بڑے بڑے کارخانوں کی روشنیاں گزر
لگیں۔ پھر ایک بہت کشادہ ریلوے یارڈ آگیا۔ اور ٹرین جل گاؤں کے سٹیشن میں داخل
ہو گئی۔ میرا ڈرامہ ٹرین کے پلیٹ فارم پر رکنے کے بعد شروع ہونا تھا۔ ٹرین پلیٹ فارم پ
پہنچ گئی تھی۔ یہاں مسافر زیادہ نہیں تھے۔

اچانک میری نگاہ پلیٹ فارم پر گیٹ کے پاس پڑی اور میرے اندر سے جیسے آواز
آئی۔ پھنس گئے ہو۔ پلیٹ فارم پر مسلح پولیس کی بھاری نفری کھڑی تھی۔ ان میں دو
پولیس انسپکٹر بھی تھے۔ وہ سب ٹرین کے ڈبوں کی طرف دیکھ رہے تھے جو آہستہ آہستہ
گزر رہے تھے۔ اس دوران خفیہ پولیس والا دروازے میں آکر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس نے
پولیس کی طرف ہاتھ ہلایا۔ اب میرے لئے فرار ہونے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ کیونکہ
اپنے آدمی کو دیکھ کر سپاہی رائفلیں لئے میرے والے ڈبے کی طرف دوڑ پڑے تھے اور
جیسے ہی ٹرین رکی سپاہی ڈبے میں گھس آئے۔ خفیہ پولیس والے نے میری طرف اشارہ

۔ ایک سپاہی وہیں رائفل میری طرف تان کر کھڑا ہو گیا اور دو سپاہی میری طرف لپکے
انہوں نے آتے ہی مجھے بازوؤں سے پکڑ لیا اور کھینچتے ہوئے ڈبے سے باہر لے آئے۔
ں پولیس انسپکٹر بھی وہاں آگئے تھے۔ انہوں نے میری طرف گھور کر دیکھا۔ خفیہ
ں والا ان کے درمیان آکر کھڑا ہو گیا تھا اور ان سے کچھ کہہ رہا تھا۔ ایک کالے
ں انسپکٹر کی بڑی بڑی مونچھیں تھیں۔ اس نے سپاہیوں کو حکم دیا۔

"اسے ہتھکڑی لگا کر لے چلو"

اسی وقت میرے ہاتھوں کو ہتھکڑی لگا دی گئی۔ میں نے شدید احتجاج کرتے ہوئے
ں آواز میں ان سے پوچھا۔

"تم نے ایک شریف شہری کو کس لئے پکڑا ہے۔ میرا جرم کیا ہے؟"

بڑی بڑی مونچھوں والے پولیس انسپکٹر کے ہاتھ میں بید کا ڈنڈا تھا۔ اس نے ڈنڈا اپنی
ں پر آہستہ آہستہ مارتے ہوئے کہا۔

"یہ سب کچھ تمہیں ابھی تھوڑی دیر میں معلوم ہو جائے گا۔"

لوگ تماشہ دیکھنے کے لئے جمع ہو گئے تھے۔ مونچھوں والے کالے پولیس انسپکٹر کے
ے ایک سپاہی نے میری جیبوں کی تلاشی لی۔ میری پتلون کی جیب سے بال پوائنٹ
ں اور عقبی جیب سے کچھ روپے اور سکے نکلے۔ انسپکٹر نے کہا۔

"ان چیزوں کو ابھی اس کی جیب میں ہی رہنے دو۔ اس کے جوتے دیکھو۔

میرے جوتے اتروا کر دیکھے گئے۔ ان میں کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کے بعد وہ مجھے لے
اسٹیشن سے باہر آگئے باہر پولیس کی دو گاڑیاں اور ایک جیپ کھڑی تھی۔ مجھے ایک
ی میں بٹھا دیا گیا۔ چار سپاہی میرے اردگرد گھیرا ڈال کر بیٹھ گئے اور پولیس کی گاڑیاں
شہر کے کسی تھانے کی طرف چل پڑیں۔ میرا خیال ہے کہ آدھی رات گزر چکی تھی
ا وقت۔ جل گاؤں شہر کی سڑکیں خالی خالی تھیں۔ کہیں روشنی ہو رہی تھی اور کہیں
ہرا تھا۔ یہ میرے لئے بالکل نیا شہر تھا۔ دور دور آبادیاں بھی تھیں جن کی روشنیاں
لا رہی تھیں۔ سڑک کی ایک جانب اونچی عمارتیں بھی تھیں۔ بمبئی دلی جتنا بڑا شہر

نہیں تھا لیکن بڑا گنجان آباد لگتا تھا۔ جیپ چونکہ کھلی تھی اس لئے یہ سارا منظر میں دیکھ رہا تھا۔

ہماری جیپ آگے جا رہی تھی۔ پولیس کی دونوں گاڑیاں ہمارے پیچھے آ رہی تھیں۔ میری گرفتاری کے لئے جل گاؤں کی پولیس نے جو اہتمام کیا تھا اس سے یہ بات واضح ہو جاتی تھی کہ ان کے نزدیک میں کوئی بڑا خطرناک اور اہم جاسوس ہوں اور ان کے پاس میری ساری نہیں تو گوالیار سے فرار کی رپورٹیں ضرور پہنچ چکی ہیں۔ تھانے میں پہنچ کر مجھے اس کا ثبوت بھی مل گیا۔ مجھے پولیس سٹیشن کے ایک کمرے میں لے جا کر فرش پر بٹھا دیا گیا۔ جس کانسٹیبل کی زنجیر میری ہتھکڑی کے ساتھ بندھی ہوئی تھی وہ میرے سر پر بندوق لئے کھڑا تھا۔ تھوڑی دیر بعد بڑی بڑی مونچھوں والا پولیس انسپکٹر اپنی ہتھیلی پر بید کی سوٹی آہستہ آہستہ مارتا اندر داخل ہوا۔ اس کے ساتھ دو پولیس کے مسلح سپاہی بھی تھے۔ ایک سپاہی نے فائل اٹھا رکھی تھی۔ انسپکٹر کرسی کھینچ کر میرے سامنے بیٹھ گیا۔ اس نے سپاہی سے فائل لے کر کھولی اور ورق گردانی کرتے ہوئے ایک جگہ نظریں جما کر پڑھنے لگا۔ میں سمجھ گیا کہ معاملہ سنگین ہے۔ ان لوگوں کے پاس ممکن ہے میری کمانڈو سرگرمیوں کا پورا ریکارڈ موجود ہو۔ کیونکہ کئی شہروں کے پولیس سٹیشنوں پر میری فوٹو موجود تھی اور بہت ممکن ہے کہ مجھے شکل سے پہچانا گیا تھا۔

خفیہ پولیس والوں کی نظریں بڑی تیز ہوتی ہیں۔ آپ چاہے اپنا حلیہ کتنا تبدیل کر لیں۔ خفیہ پولیس کی نظریں اپنے ایک خاص حساب سے آپ کو پہچان لیں گی۔ ان کی نگاہوں سے محفوظ رہنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ آدمی اپنے چہرے کی پلاسٹک سرجری کروا لے۔

پولیس انسپکٹر نے فائل میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"اس آدمی کو پہچانتے ہو؟"

میں نے کھلی فائل پر نگاہ ڈالی۔ کونے میں میری تصویر لگی ہوئی تھی۔ اس تصویر میں میری ڈاڑھی مونچھیں نہیں تھیں۔ اس وقت بھی میری ڈاڑھی مونچھیں بہت معمولی

ں۔ اس خفیہ پولیس والے کو اسی لئے مجھے پہچاننے میں آسانی ہوئی تھی کہ اس نے
ں بغیر ڈاڑھی مونچھوں والی تصویر دیکھ رکھی تھی۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا اور منہ
ری طرف کر لیا۔ پولیس انسپکٹر نے بید سے میری ٹھوڑی کو اونچا کرتے ہوئے کہا۔

"ایک بار پر غور سے دیکھو اور جواب دو یہ کس کی تصویر ہے؟"

میں نے کہا۔

"میری تصویر ہے؟"

پولیس انسپکٹر نے کہا۔

"تو پھر یقین کر لو کہ ہمیں تمہارے متعلق ایک ایک بات معلوم ہو چکی ہے۔"

میں نے کہا۔

"اگر آپ کو سب کچھ معلوم ہے تو پھر مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہیں"

پولیس انسپکٹر مسکرایا۔

"آدمی تم تجربہ کار لگتے ہو"۔

اس کے بعد اس نے مجھ سے وہی سوال کرنے شروع کر دیئے جو اس سے پہلے
ں اور ملٹری انٹیلی جینس مجھ سے کئی بار کر چکی تھی۔ یعنی میرے دوسرے کمانڈو
ں کہاں روپوش ہیں اور میں کس مشن پر بمبئی آیا تھا اور اب کس مشن پر دلی جا رہا
میری جیب سے بمبئی سے دلی تک کا ریل ٹکٹ انہوں نے برآمد کر لیا ہوا تھا۔ میں
کہا۔

"مجھے نہیں معلوم آپ کو میرے بارے میں کیا کیا رپورٹیں مل چکی ہیں۔ میں اتنا
صاف صاف بتانا چاہتا ہوں کہ میں اکیلا ہوں۔ مسلمان ہوں۔ اور صرف اپنے
مسلمان کشمیری بھائیوں کی مدد کے لئے چھوٹے چھوٹے کام کرتا رہا ہوں میرا کوئی
مجاہد میرے ساتھ نہیں ہے۔"

"ناگ پور کے اشوکا ہوٹل میں دھماکہ کر کے چھ جرنیلوں سمیت پورے بلاک کو اڑا
ہانڈی چری کی کھاڑی میں ہماری نیوی کے دو جہازوں کو غرق کر دینا اور بھوپال میں

لائن پر انڈین آرمی کی ایمونیشن ٹرین کو بھک سے اڑا دینا۔ تم انہیں چھوٹے چھوٹے کا
کہتے ہو۔"

میرے خدا! ان لوگوں کے پاس میری کارکردگی کی فل رپورٹ موجود تھی۔ اس
حساب سے میں نے بھی اپنی خاص حکمت عملی تیار کرلی۔ اس حکمت عملی پر عمل کرتے
ہوئے مجھے پولیس انسپکٹر کے سامنے انکار بھی نہیں کرنا تھا اور پوری بات بھی نہیں بتانی
تھی۔ غیر اہم اور سامنے آچکی باتیں اور واقعات بتا دینے تھے اور اہم اور راز داری کی
باتیں گول کر جانی تھیں۔ ایک بات یاد رکھیں۔ جو پولیس افسر بھارت میں ہمارے ایسے
خطرناک اور تربیت یافتہ حریت پسندوں اور کمانڈوز سے پوچھ گچھ کرتے ہیں وہ بڑے سمجھ
دار اور تربیت یافتہ ہوتے ہیں۔ انہیں بھی پتہ ہوتا ہے کہ کبھی کبھی جاسوس آدھی بات
اس لئے بتا دیتا ہے کہ اسے آدھی بات کو چھپانا ہوتا ہے۔ اس کے باوجود ہم بھی ہمت
نہیں ہارتے۔ ٹارچر تو انہیں کرنا ہی ہوتا ہے۔ ہمیں طرح طرح کی اذیتیں تو دینی ہی ہوتی
ہیں لیکن ایک محب وطن کمانڈو اور حریت پسند زندگی ہار جاتا ہے مگر ایسی کوئی بات دشمن کو
نہیں بتاتا جس سے اس کی تحریک آزادی یا ملکی مفاد کو خطرہ لاحق ہوتا ہو۔

ں حکمت عملی پر عمل کرتے ہوئے میں نے پولیس انسپکٹر سے کہا۔

"اب جب کہ آپ کو میرے بارے میں سب کچھ معلوم ہو چکا ہے تو میں بھی آپ
ے کوئی بات نہیں چھپاؤں گا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ جب دشمن کسی قوم کی مذہبی شہری
راس کے حق آزادی کو کچل رہا ہو تو اس قوم کا فرض ہے کہ وہ دشمن کا مقابلہ کرے۔
ں کشمیری مسلمان ہوں آپ کی فوج نے کشمیر پر وہاں کی اکثریتی مسلمان آبادی پر زبردستی
ہ کر رکھا ہے اور کشمیریوں کو ان کے حق رائے دہی سے محروم کرنے کی کوشش کر
ہے ہیں۔ آپ وہاں ہماری مسجدوں کو نظر آتش کرتے ہیں۔ نہتے کشمیریوں کا قتل عام کر
ہے ہیں۔ گھروں کو جلا رہے ہیں۔ ایسی صورت اگر آپ کے ساتھ پیش آجائے تو کیا
پ وہی کچھ نہیں کریں گے جو ہم کر رہے ہیں؟"

پولیس انسپکٹر کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اس پر میرے ان دلائل کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ زیر
ب مسکرا رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"تم ایک بات چھپا گئے ہو اور وہ بات یہ ہے کہ تم کشمیری حریت پسند نہیں ہو تم
ستانی کمانڈو ہو۔ پنجابی بھی ہو اور بھارت میں ہماری فوجی تنصیبات کو ناقابل تلافی نقصان
ہنچا رہے ہو۔ اگر تم مجھے یہ بتا دو کہ تمہارے دوسرے ساتھی دلی اور بمبئی میں کہاں پر
ں تو میں تم سے----"

آگے اس نے وہی کہا جو اس سے پہلے کئی بار پولیس اور ملٹری انٹیلی جنیس والے مجھ
ے کہہ چکے تھے۔ یعنی یہ کہ ہم پھر تمہیں کچھ نہیں کہیں گے اور تمہیں جہاں تم کہو گے

وہاں اپنی حفاظت میں پہنچا دیں گے۔ یہ جھوٹا وعدہ ہوتا ہے۔ مجھے یہ فکر بھی پڑ گئی تھ
اگر ان لوگوں نے مجھے پکڑ لیا ہے تو پیچھے بمبئی میں ہمارے آدمی کو بھی پکڑ لیا ہو گا جس
فرضی نام میں نے آپ کو جعفر بھائی بتایا تھا اور جس کی رہائش کی فرضی جگہ میں نے بم
کا لکشمی سینما گھر بتایا تھا۔

میں نے پولیس انسپکٹر کو وہی جواب دیا جو اس سے پہلے میں کئی بار پولیس والوں
دے چکا تھا۔ میں نے کہا۔

"میرا کوئی ساتھی نہیں ہے۔ میں پاکستانی کمانڈو نہیں ہوں۔ میں پنجابی ضرور ہوں گ
پاکستان کے پنجاب سے میرا تعلق نہیں ہے۔ ہم لوگ جالندھر سے ہجرت کر کے جموں آ
گئے تھے۔ میں اس وقت سکول میں پڑھتا تھا۔"

پولیس انسپکٹر نے مجھے کھڑے ہونے کا اشارہ کیا۔ میں زمین پر بیٹھا تھا۔ اٹھ کر کھڑا
گیا۔ مجھے ہتھکڑی لگی ہوئی تھی۔ انسپکٹر خود میری تلاشی لینے لگا۔ میری پچھلی جیب میں ک
نقدی تھی۔ وہ اس نے نکال کر غور سے دیکھی اور دوبارہ میری جیب میں ڈال دی۔ میر
پتلون کی دائیں بائیں جیبوں کی تلاشی لی۔ ایک جیب میں زہریلی بال پوائنٹ پنسل تھی
مجھ سے بس یہی غلطی ہو گئی کہ میں نے اسے اپنی جراب کے اندر جوتے میں نہیں چھپ
تھا۔ لیکن ان لوگوں نے وہاں سے بھی پنسل نکال لینی تھی۔ انسپکٹر بال پوائنٹ پنسل
دیکھنے لگا۔ خدا کا شکر ہے اس کی انگلی پنسل کی کیپ کے قریب ہی جو خشخاش جتنا چھوٹا
نقطہ تھا اس پر نہیں پڑا۔ ورنہ اگر اتفاق سے وہ نقطہ دب جاتا تو بال پوائنٹ میں س
زہریلی سوئی نکل کر سیدھی میرے پیٹ میں اتر جاتی۔ کیونکہ اس وقت بال پوائنٹ کا ر
میرے پیٹ کی جانب تھا۔ میں نے کہا۔

"میں نے یہ بال پوائنٹ بمبئی سے خریدی تھی۔ کبھی کبھی کچھ لکھ کر یاد رکھنا پڑ جا
ہے۔"

پولیس انسپکٹر نے فائل کے کاغذ کے نیچے بال پوائنٹ سے دو تین لکیریں ڈالیں او
پھر اسے اپنی وردی کی سامنے والی جیب میں لگا لیا۔ میں نے کہا۔

"سر! یہ بال پوائنٹ لے کر آپ کیا کریں گے۔ میرے پاس ہی رہنے دیں۔"
اس نے اچانک غصے میں آ کر انگریزی میں مجھے گالی دی اور کہا۔
"زیادہ بکواس سننے کا میں عادی نہیں ہوں۔ ایک بات کان کھول کر سن لو۔ میرا نام
جگو ٹنڈولکر ہے مجھے جگو بوچڑ بھی کہتے ہیں میں نے بڑے بڑوں کی زبان کھلوا لی ہے تم
میرے سامنے کچھ بھی نہیں ہو۔"

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے فائل کانسٹیبل کو پکڑائی اور اسے اشارہ کر کے باہر نکل گیا۔
اس کے جانے کے بعد وہ لوگ مجھے تھانے کی دوسری منزل میں لے گئے اور وہاں بند کر
دیا۔ یہ ایک چھوٹی سی حوالات ہی تھی۔ زمین پر ٹاٹ کا بوریا بچھا تھا۔ دروازہ لوہے کی
سلاخوں والا تھا۔ میں خاموشی سے بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ یہاں سے فرار کس طرح ممکن
ہے۔ میری ہتھکڑی اتار دی گئی تھی۔ لیکن دروازے کی سلاخوں کے پیچھے رائفل اٹھائے
کانسٹیبل پہرہ دے رہا تھا۔ حوالات میں نہ کھڑکی تھی نہ کوئی روشندان تھا۔ لیکن مجھے سب
سے زیادہ پریشانی اپنی بال پوائنٹ پنسل کی تھی جو میرا سب سے مہلک ہتھیار تھا۔ اس کے
بغیر وہاں سے فرار ہونا بے کار تھا۔ یہ بال پوائنٹ اس کم بخت جگو ٹنڈولکر نے اپنے پاس
رکھ لی تھی۔ خدا جانے اس نے کیا سوچ کر بال پوائنٹ اپنی وردی کی جیب میں لگا لی تھی۔
یہ بات آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اور میری سمجھ میں یہ بات بھی نہیں آ رہی تھی
کہ میں اپنی زہریلی بال پوائنٹ پنسل پولیس انسپکٹر سے کیسے واپس لے سکوں گا۔

رات اسی تنگ حوالات میں گزر گئی۔ سلاخوں والے دروازے کے باہر دن کی
روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ رات کو پہرہ دینے والا کانسٹیبل چلا گیا تھا۔ اس کی جگہ دوسرا
کانسٹیبل آ گیا تھا۔ میں نے ایک دو بار اس سے وقت پوچھا مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔
تیسری بار پوچھا تو وہ مجھے گالیاں دینے لگا۔ وقت اس نے پھر بھی نہ بتایا۔ دن کے وقت مجھے
وہی پتلی دال اور ایک باسی روٹی کھانے کو دی گئی۔ میں حوالات کے ٹاٹ پر بیٹھا اس سوچ
میں گم تھا کہ پولیس انسپکٹر سے اپنا ہتھیار بال پوائنٹ پنسل کیسے واپس لی جا سکتی ہے۔ شام
کے وقت ایک مسلمان مولوی صاحب مجھے ملنے آ گئے۔ انہوں نے پہلے تو بڑے پکے

مسلمانوں والی باتیں کیں پھر مجھے یہ بتانا شروع کر دیا کہ ہندوستان ایک امن پسند ملک ہے اور اھنسا کا قائل ہے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ اصلی مسلمان مولوی نہیں ہے بلکہ پولیس کا خریدا ہوا مولوی ہے۔ میں نے مولوی صاحب سے کہا۔

"مولوی صاحب! آپ مجھے کیا سمجھانے بیٹھ گئے ہیں۔ میں نے تو پولیس انسپکٹر کو اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے کہ میں کشمیری مسلمان حریت پسند ہوں۔ پھر اس نے آپ کو میرے پاس کس لئے بھیج دیا ہے۔ آپ اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔"

مولوی صاحب کہنے لگے۔

"بیٹا! بات یہ ہے کہ اگر تم اپنے ان ساتھیوں کے بارے میں بھی بتا دو کہ وہ کہاں کہاں روپوش ہیں تو میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں جہاں تم کہو گے تمہیں حفاظت سے پہنچا دیا جائے گا۔"

میں نے ہنس کر کہا۔

"مولوی صاحب! یہ باتیں میں کئی بار سن چکا ہوں۔ اپنے بارے میں تو میں نے سب کچھ بتا دیا ہے مگر جس چیز کا مجھے علم ہی نہیں اس کے بارے میں میں کچھ نہیں بتا سکتا۔ میں کشمیر سے اکیلا حریت پسند یہاں آیا تھا میرے ساتھ کوئی مجاہد نہیں آیا۔"

مولوی صاحب نے مجھے سمجھانا شروع کر دیا۔ میں ان کی باتیں نہیں سن رہا تھا۔ کیونکہ اس وقت میں ایک منصوبے پر غور کر رہا تھا جو پولیس انسپکٹر جگو بوچڑ سے اپنی بال پوائنٹ پنسل واپس لینے کے سلسلے میں میرے دماغ میں اس وقت آیا تھا۔ میں نے مولوی صاحب کی گفتگو کو کاٹتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میں آپ کی بات مان لیتا ہوں"

مولوی صاحب تو خوشی سے چمک اٹھے۔ میں نے کہا "اپنے کمانڈو ساتھیوں کے نام پتے جس وقت انسپکٹر کو بتاؤں گا تو اس وقت ہم دونوں کے سوا وہاں کوئی نہیں ہو گا۔ دوسرے یہ کہ اس حوالات میں یہ ملاقات نہیں ہوگی۔"

مولوی صاحب نے کہا۔

"اس کا انتظام فوراً کر دیا جائے گا۔ تم بے فکر رہو۔ میں ابھی جا کر انسپکٹر صاحب سے بات کرتا ہوں"

مولوی صاحب چلے گئے۔ اس وقت دن کا تیسرا پہر ہو گا۔ مجھے یقین تھا کہ پولیس انسپکٹر ابھی اپنے آفس میں ہی ہو گا۔ تھوڑی دیر بعد مولوی صاحب کی بجائے پولیس انسپکٹر جگو ٹنڈو لکر خود آ گیا۔ وہ اکیلا آیا تھا۔ کہنے لگا۔

"ایسی بات تھی تو تم مجھے پہلے ہی بتا دیتے۔ یہ کوئی بڑی پرابلم نہیں ہے۔ میرے ساتھ آؤ۔ ہم الگ کمرے میں بیٹھ جاتے ہیں۔"

وہ مجھے حوالات سے نکال کر دو تین کمرے چھوڑ کر ایک سجے سجائے کمرے میں لے گیا۔ یہاں ایک پرانا صوفہ سیٹ پڑا تھا۔ دیوار پر مہاتما گاندھی کی تصویر آویزاں تھی۔ کارنس پر پولیس سٹیشن کو ملے ہوئے میڈل اور شیلڈیں سجی ہوئی تھیں۔ پولیس انسپکٹر نے مجھے اپنے سامنے والے صوفے پر بٹھا لیا اور کہنے لگا۔

"یہاں ہم دونوں اکیلے ہیں۔ ہماری باتیں کوئی دوسرا نہیں سن رہا۔"

میں نے اپنے پلان کے مطابق اسے کہا۔

"مجھ سے ایک اور وعدہ کریں"

"بتاؤ"

میں نے کہا۔

"مجھے اپنے بھگوان کو سامنے رکھ کر وچن دو کہ تم کسی کے آگے ذکر نہیں کرو گے کہ اپنے ساتھی کمانڈوز کے نام میں نے تمہیں بتائے تھے۔"

پولیس انسپکٹر بہت خوش تھا۔ اسے اپنا مشن مکمل ہوتا نظر آ رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"میں بھگوان کو سامنے رکھ کر تمہیں وچن دیتا ہوں کہ تمہارا نام راز میں رکھوں گا اور کسی کو نہیں بتاؤں گا۔"

اس دوران مجھے ایک بات کی بڑی تسلی ہو گئی تھی۔ وہ بات یہ تھی کہ پولیس انسپکٹر نے کل والی وردی ہی پہنی ہوئی تھی اور اس کی قمیض کی جیب میں میری زہریلی بال

پوائنٹ پنسل لگی ہوئی مجھے صاف نظر آرہی تھی۔ یہ میں نے اسی وقت دیکھ لی تھی جب وہ حوالات میں مجھے ساتھ لے جانے کے لئے داخل ہوا تھا۔ اگر بال پوائنٹ اس کی جیب میں نہ ہوتی تو میں کبھی اس کے ساتھ حوالات سے باہر نہ آتا۔ پھر مجھے کسی اور منصوبے پر غور کرنا پڑتا۔ میں نے کہا۔

"میں اپنی زبان سے اپنے ساتھی حریت پسند کمانڈوز کے نام نہیں لوں گا۔"

"تو پھر تم مجھے ان کے نام کیسے بتاؤ گے؟"

میں نے کہا۔

"میں ایک کاغذ پر ان کے نام اور ان کے مکمل پتے جہاں جہاں وہ روپوش ہیں لکھ دوں گا۔ یہ کاغذ میں اپنے ہاتھ میں رکھ کر تمہیں دکھاؤں گا تم بے شک اسے اپنی ڈائری پر نوٹ کر لینا۔ اس کے بعد میں اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا کاغذ خود پھاڑ کر پرزے پرزے کر دوں گا۔"

اس قسم کے ڈرامے کا ماحول میں جان بوجھ کر پیدا کر رہا تھا تاکہ مجھے جو کچھ کرنا ہے اس کا جواز بھی پیدا ہو جائے۔ پولیس انسپکٹر نے فوراً جیب سے ایک چھوٹی سی نوٹ بک نکال کر کھولی اور خالی صفحہ میرے آگے کرتے ہوئے بولا۔

"یہ لو۔ اس پر روپوش حریت پسندوں کے نام اور ایڈریس لکھ دو۔ نوٹ بک تم اپنے ہاتھ میں ہی رکھنا میرے پاس دوسری نوٹ بک بھی ہے۔ میں ان کے نام پتے دوسری نوٹ بک پر اتار لوں گا۔ اس کے بعد تم اپنے ہاتھ سے اس نوٹ بک کا صفحہ پھاڑ کر پرزے پرزے کر دینا۔"

اس نے بش شرٹ کی جیب میں سے دوسری نوٹ بک نکال لی۔ میں نے چھوٹی نوٹ بک ہاتھ میں لے لی اور کہا۔

"مجھے پنسل دو"

وہ اپنی جیبیں تلاش کرنے لگا۔ میں نے جلدی سے کہا۔

"تمہاری جیب میں میری بال پوائنٹ پنسل لگی ہوئی ہے یہی دے دو۔"

اس نے بال پوائنٹ پنسل جیب سے اتار کر مجھے دے دی۔ بال پوائنٹ پنسل میرے ہاتھ میں آئی تو مجھے یوں اطمینان ہوا جیسے میرے ہاتھ میں سائی لینسر لگا پستول آگیا ہو۔ بلکہ یہ ہتھیار سائی لینسر والے پستول سے بھی زیادہ بے آواز اور ہلاکت خیز تھا۔ پستول کی گولی کھا کر تو انسپکٹر زخمی ہونے کے بعد ایک آدھ آواز نکال کر سپاہیوں کو وہاں بلا سکتا تھا لیکن بال پوائنٹ پنسل سے فائر ہونے والی سوئی کے مہلک زہر نے اس کے خون میں شامل ہوتے ہی بلکہ اس کے جسم کی کھال میں اترتے ہی اس کے جسم کو پتھر کی طرح ساکت کر دینا تھا۔ میں نے بال پوائنٹ پنسل ہاتھ میں لے کر اس کی کیپ الگ کی۔ کیپ کو دوسری طرف لگایا۔ اب پنسل کی نوک فائر کے لئے بالکل تیار تھی۔ بس یہی ایک خطرہ تھا کہ کسی خرابی کی وجہ سے ایسا نہ ہو کہ فائر نہ ہو سکے۔ میں پنسل ہاتھ میں سیدھی کر کے نوٹ بک کے خالی صفحے پر لکھنے لگا تو رک گیا۔ پھر پولیس انسپکٹر کی طرف دیکھا اور کہا۔

"انسپکٹر صاحب! آپ ایک سیکنڈ کے لئے منہ دوسری طرف کر لیں۔ میرے ضمیر کو یہ بات گوارا نہیں کہ دشمن کے سامنے میں اپنے ساتھیوں کے نام پتے لکھوں"

پولیس انسپکٹر مسکرایا۔ کہنے لگا۔

"تم مسلمانوں کو اپنے ضمیر کا بڑا خیال رہتا ہے۔ یہ لو۔ میں منہ دوسری طرف کر لیتا ہوں"

اس نے میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھے بیٹھے منہ دوسری طرف کر لیا۔ میں اس کے صوفے پر آگے کو ہو کر بیٹھا تھا۔ ہمارے درمیان بڑا تھوڑا فاصلہ تھا۔ درمیان میں کوئی حائل نہیں تھا۔ وہ بھی آگے کو ہو کر صوفے کے کنارے پر میری طرف جھک کر بیٹھا تھا۔ کمرے میں ہم دونوں کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ اب میرے پاس یہ سوچنے کے لئے وقت نہیں تھا اور نہ مجھے یہ سوچنے کی ضرورت تھی کہ میں بھارت کے شہر جل گاؤں کے پولیس سٹیشن کے اندر ہوں۔ یہاں چاروں طرف مسلح پولیس موجود ہے۔ یہاں سے میں کیسے باہر نکل سکوں گا۔ یہ ساری باتیں اس وقت میں نے اپنے دماغ سے نکال دی تھیں۔ اس وقت دشمن میرے نشانے میں تھا۔ اور مجھے اسے ہلاک کرنا تھا۔

جیسے ہی پولیس انسپکٹر جگو ٹنڈولکر نے منہ دوسری طرف کیا' میں بال پوائنٹ پنسل
نوک ہاتھ بڑھا کر اس کی گردن کے پاس لے گیا اور فائر کر دیا۔ میں اپنے اس مجاہد کو
بھی داد دیتا ہوں جس نے یہ حیرت انگیز ہتھیار بنایا تھا۔ بال پوائنٹ کا خفیہ بٹن ذرا
دباتے ہی زہریلی سوئی اس کی خفیہ نالی سے نکل کر انسپکٹر ٹنڈولکر کی گردن میں گھس گ
اس نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا۔ شاید وہ اسے اپنی گردن تک لے جانا چاہتا تھا جہاں اسے
چبھنے کا احساس ہوا تھا۔ سائی نائیڈ زہر اتنی مہلت نہیں دیا کرتا۔ میں حیران ہوا کہ ا
پولیس انسپکٹر کو اتنی مہلت کیسے مل گئی کہ وہ اپنا ہاتھ اوپر اٹھاتا۔ اس کا ہاتھ گردن ت
نہیں پہنچ سکا۔ اور نہ وہ گردن میری طرف موڑ سکا۔ ہاتھ ذرا سا اوپر آکر گر پڑا اور
کندھے کے بل صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔ میں نے جلدی سے بال پوائنٹ کو کیپ لگائی۔ ا
پتلون کی پچھلی جیب میں ڈالا اور صوفے پر سے اچھل کر دروازے کی طرف گ
دروازے پر پردہ گرا ہوا تھا۔ میں نے پردہ ذرا سا ہٹایا۔ دروازہ بند تھا۔ میں نے درواز
کا پٹ ہلکے سے دباؤ کے ساتھ کھولا۔ دروازہ اندر کو کھلتا تھا۔ مجھے تین چار قدموں
فاصلے پر آمنے سامنے دو پولیس کانسٹیبل رائفلیں اٹھائے پہرہ دیتے نظر آئے۔ میں
دروازہ آہستہ سے بند کر دیا۔ یقینی طور پر پولیس انسپکٹر نے اندر آتے ہوئے ان
سپاہیوں کو ہدایت کر دی ہو گی کہ وہ باہر کھڑے رہ کر پہرہ دیں اور جب تک میں نہ بلاؤں
وہ اندر نہ آئیں۔ میرے منصوبے کا مقصد بھی یہی تھا۔ میں نے یہ کام کیا کہ بڑے آرا
سے دروازے کی اندر سے چٹخنی لگا دی۔ اس لئے کہ میں نے اس کمرے میں دوسری دیوا
میں ایک اور دروازہ آتے ہی دیکھ لیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ یہ ضرور غسل خانہ ہو گا او
غسل خانوں میں عام طور پر باہر نکلنے کا ایک دروازہ اس قسم کے سرکاری دفتروں میں رکھ
جاتا ہے۔ بہرحال یہ ایک بلائنڈ چال تھی۔ میں نے پولیس انسپکٹر پر ایک نگاہ ڈالی۔ و
صوفے پر بے حس و حرکت پڑا تھا۔ اس کی پیٹی کے ہولسٹر میں پستول بھی لگا ہوا تھا مگر میں
نے اسے نہ نکالا۔ میں دبے پاؤں مگر بڑی تیزی سے غسل خانے والے دروازے کے پاس
گیا اور دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ یہ چھوٹا سا گندہ غسل خانہ ہی تھا۔ مگر اس میں دوسرا

دروازہ کوئی نہیں تھا۔ صرف ایک کھڑکی تھی جو بند تھی۔ میں نے کھڑکی کا ایک پٹ کھول
کر دیکھا۔ کھڑکی میں نہ جالی لگی تھی نہ سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ چونکہ یہ تھانے کے اندر
بنا ہوا وی آئی پی روم تھا اس لئے اس کے غسل خانے کی کھڑکی کو جالی یا سلاخیں لگانے کی
ضرورت نہیں سمجھی گئی تھی۔ باہر سامنے پولیس سٹیشن کی دیوار نظر آئی جو غسل خانے کی
کھڑکی سے دس پندرہ قدموں کے فاصلے پر تھی۔ دیوار کے پاس ہی ایک درخت تھا جس
کی ٹہنیاں دیوار پر جھکی ہوئی تھیں۔ یہاں کوئی سپاہی نہیں تھا۔

میں جلدی سے غسل خانے کی کھڑکی پر چڑھ کر دوسری طرف اتر گیا اور ایک لمحے
کے لئے وہیں دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھا رہا۔ دن کا وقت تھا۔ چاروں طرف دن کی
روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میری خوش قسمتی یہ تھی کہ یہ پولیس سٹیشن کے دفاتر اور وی آئی
پی کمرے کا عقبی حصہ تھا اور میری دونوں جانب دیوار دور تک چلی گئی تھی۔ سامنے جو
دس پندرہ گز تک خالی جگہ تھی وہاں ایک طرف ٹوٹی پھوٹی کرسیوں اور میزوں کا ڈھیر لگا
ہوا تھا اور دوسری طرف ایک پرانی کھٹارا جیپ کھڑی تھی۔ جب مجھے اطمینان ہو گیا کہ
وہاں کوئی سپاہی وغیرہ نہیں ہے تو میں اٹھا اور بڑے آرام سے چلتا کھٹارا جیپ کے پیچھے جا
کر جیپ کے پہیوں کو جھک کر یوں دیکھنے لگا کہ اگر دور سے کسی کی مجھ پر نظر پڑ بھی جائے
تو وہ یہی سمجھے کہ میں کوئی پرانی گاڑیوں کی مرمت کرنے والا مستری ہوں جو جیپ کا معائنہ
کر رہا ہے۔ وہاں ایک طرف مجھے بنچ پر پولیس کے دو سپاہی بیٹھے ہوئے نظر آئے۔ ان کی
پیٹھ میری جانب تھی۔ یہ موقع غنیمت تھا۔ تھانے کے احاطے کی دیوار میرے قریب ہی
تھی۔ بس تین چار گز دور ہو گی۔ دیوار زیادہ اونچی نہیں تھی۔ زمین پر لوہے کے تاروں کا
ایک گچھا پڑا ہوا تھا۔ میں نے اسے اٹھایا اور تار کھول کر ہاتھوں میں پکڑی اور آہستہ آہستہ
گچھے کو کھولتا ہوا دیوار کی طرف بڑھا۔ میں یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ میں اپنا ہی آدمی ہوں۔
جیسے ہی میں دیوار کے پاس آیا۔ میں نے تار کا گچھا وہیں پھنکا۔ اچھل کر دیوار کی منڈیر کو
پکڑا اور تیزی سے دوسری طرف کود گیا۔ مجھے کچھ پتہ نہیں تھا کہ دوسری طرف کیا ہے۔
میں ناریلوں کی چھال کے ڈھیر پر گرا جو وہاں سکھانے کے لئے ڈالی ہوئی تھی۔ میں ایک دم

نہیں اٹھا بلکہ وہیں ناریل کی چھال کے ڈھیر کے پاس ہی بیٹھ گیا اور دائیں بائیں دیکھا۔ دن ڈھل رہا تھا۔ سورج بادلوں کے پیچھے تھا دن کی روشنی پھیکی ہونے لگی تھی۔ میں نے دیکھا کہ سامنے ڈھلان میں کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پڑے تھے۔ تھانے کی دیوار کے ساتھ چلنا خطرناک تھا۔ میں اٹھ کر ڈھلان میں اتر گیا۔ کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں کے قریب سے نکل کر سامنے چھوٹی سی سڑک پر آگیا جہاں ناریل پانی بیچنے والے کا کھوکھا تھا۔ دو آدمی کھوکھے کی طرف منہ کئے وہاں کھڑے کچے ناریل پی رہے تھے۔

میں خاموشی سے ان کے قریب سے گزر گیا۔

جتنا وقت مجھے تھانے کے وی آئی پی روم سے نکل کر یہاں تک آنے میں لگا تھا اتنی دیر میں میرا خیال تھا کہ تھانے کے سپاہیوں نے دروازے کے پاس آکر یہ معلوم کرنے کی ضرور کوشش کی ہوگی کہ اندر سب خیریت ہے اور کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔ اور جب انہوں نے اندر سے دروازہ بند پایا ہوگا تو اسے ضرور کھٹکھٹایا ہوگا اور جب اندر سے کوئی جواب نہیں آیا ہوگا تو وہاں کھلبلی مچ گئی ہوگی۔

مطلب یہ کہ اب تک تھانے میں میرے فرار اور پولیس انسپکٹر کے قتل کا راز فاش ہو چکا ہوگا اور خدا جانے شہر کے کس کس تھانے کی پولیس مجھے پکڑنے کے لئے نکل آئی ہوگی اگر میرے اندازے کے مطابق ابھی تک پولیس کو علم نہیں ہوا ہوگا تو زیادہ سے زیادہ دس پندرہ منٹ تک علم ہو جائے گا اور جل گاؤں شہر کے سٹیشن لاری اڈوں اور شہر سے باہر جانے والی سڑکوں کی پولیس ناکہ بندی کر لے گی۔ میرے لئے ضروری تھا کہ میں جتنی جلدی شہر سے دور ہو سکتا ہوں دور ہو جاؤں اور اگر ایسا ممکن نہیں تو پھر اس شہر کے کھیتوں اور اجاڑ علاقے میں کوئی ایسی جگہ تلاش کروں جہاں چھپ کر میں رات گذار سکوں۔

جل گاؤں شہر میرے لئے بالکل اجنبی تھا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ کونسا راستہ کس طرف جاتا ہے۔ میں نے صرف اتنا کیا تھا کہ پولیس سٹیشن کی مخالف سمت کو اپنا رخ کر لیا تھا اور جتنی تیز چل سکتا تھا چھوٹی سڑک کے کنارے کنارے چلا جا رہا تھا۔ سامنے

ے ایک کھٹارا سی ویگن آرہی تھی جس کی چھت پر بھی لوگ بیٹھے تھے۔ ویگن میرے یب سے گزر گئی۔ جس سڑک پر میں چلا جا رہا تھا اس کی ایک جانب کچھ کھیت تھے اور چھے اونچی نیچی پہاڑیاں نظر آرہی تھیں۔ دوسری جانب شہر کی عمارتیں تھیں جو آہستہ ہستہ میرے ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ میں کھیتوں میں اتر گیا۔ یہ دھان کے کھیت ے۔ فصل زیادہ اونچی نہیں تھی۔ ان میں چلتے ہوئے میں دور سے نظر آسکتا تھا۔

میں نے ایک جگہ رک کر پیچھے دیکھا کہ پولیس میرے پیچھے تو نہیں آرہی۔ ابھی تک محفوظ تھا۔ میں کھیتوں میں سے نکل کر ایک کھلی جگہ پر آگیا۔ یہ جگہ اونچی نیچی تھی۔ ھ درخت بھی تھے۔ جھاڑیاں بھی تھیں۔ بارشوں کی وجہ سے ہر طرف سبزہ اگا ہوا تھا۔ علاقوں میں برسات کے موسم میں موسلادھار بارشیں ہوتی ہیں جن کی وجہ سے ہر ف سبزہ ہی سبزہ دکھائی دیتا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ جلدی شام کا اندھیرا پھیل جائے اور دور نظر آنے والی پہاڑیوں میں کسی جگہ جا کر چھپ جاؤں مگر دن کی روشنی بڑی آہستہ ستہ ماند پڑ رہی تھی۔ اب میں وقت ضائع کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ تھانے میں یس انسپکٹر کی لاش مل چکی ہوگی اور پولیس ایک قیامت خیز طوفان کی طرح میری تلاش شہر میں پھیل گئی ہوگی۔ میں کوئی عام دنیا دار یا دشمن ملک میں آکر پھنسا ہوا عام قسم کا ح نہیں تھا کہ اس قسم کے حالات میں مجھ پر ہیجانی کیفیت یا گھبراہٹ طاری ہو جاتی۔ ایک تجربہ کار تربیت یافتہ انتہائی سخت جان اور پکا مسلمان کمانڈو تھا۔ میرا مقصد صرف جان بچانا نہیں تھا۔ بلکہ مجھے دشمن کے کسی ناپاک منصوبے کو تباہ کرنے کے بعد اپنے ہ اڈے پر پہنچ کر دوسرے کمانڈو مشن کی منصوبہ بندی کرنی تھی۔ ایک میدان میں جیت کر میں نکل آیا تھا۔ اب مجھے دوسرے میدان جنگ میں دشمن کا مقابلہ کرنے لئے اترنا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ حالات کی سنگینی کے باوجود میں صورت حال پر بڑی ہوش مندی سے ہ بچار بھی کر رہا تھا اور پولیس سٹیشن سے زیادہ دور ہو جانے کے لئے تیز تیز ا چل رہا تھا۔ سامنے ایک ندی آگئی۔ ندی پر ایک جگہ چھوٹی سی پلیا بنی ہوئی تھی۔ میں

نے پلیا پر سے ندی پار کی اور سامنے درختوں کے جو جھنڈ نظر آرہے تھے ان میں داخل ہو
گیا۔ ان درختوں کے جھنڈوں کے آگے کیا ہے؟ دور جو اونچی نیچی پہاڑیاں مجھے نظر آرہی
ہیں ان کے آگے کیا ہے؟ میں آگے کس طرف نکل جاؤں گا یہ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔
بس میں یہی چاہ رہا تھا کہ جتنی جلدی ہو سکے شام کا اندھیرا ہو جائے اور میں پہاڑیوں میں
جا کر کسی جگہ چھپ جاؤں اور آدھی رات کے سناٹے میں شہر سے نکل جانے کی کوشش
کروں۔ چلتے چلتے آخر میں دور سے دکھائی دینے والی پہاڑیوں میں پہنچ گیا۔ یہ چھوٹی چھوٹی
پہاڑیاں تھیں۔ ان پر کہیں کہیں درخت اور جھاڑیاں نظر آتی تھیں۔ اکثر پہاڑیاں بنجر او
سیاہ رنگ کی تھیں۔ میں ایک پہاڑی کے ساتھ ساتھ چل پڑا۔ یہاں زمین کا رنگ گہ
سرخی مائل تھا اور اتنی جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں کہ پیدل چلنا مشکل ہو رہا تھا۔ پہاڑی خ
ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ اس طرف پولیس میری تلاش میں
شاید ہی آئے۔ وہ زیادہ تر مجھے شہر کے لاری اڈوں' سینما گھروں کے باہر' ریلوے سٹیش
اور شہر سے باہر نکلنے والی سڑکوں پر ہی ڈھونڈے گی۔ لیکن میں نے پولیس کے ان پہاڑیو
کی طرف آنے کے امکان کو رد نہیں کیا تھا۔ کیونکہ میں کوئی معمولی قیدی نہیں تھا۔
پولیس افسر کو قتل کر کے فرار ہو گیا ہوں۔ پولیس افسران کو معلوم تھا کہ میں ایک تربی
یافتہ کمانڈو ہوں اور بھارت میں بڑی تباہی مچا چکا ہوں۔ اور اپنی سخت جانی کی وجہ سے م
ویران پہاڑیوں میں روپوش ہو سکتا ہوں۔

مجھے کسی جانور کی خر خر کی آواز آئی۔ میں رک کر ایک طرف ہو گیا۔ دوسرے
ایک کالے رنگ کا انتہائی بدشکل جنگلی سور دوڑتا ہوا جھاڑیوں میں سے گزر گیا۔ جنگلی
بڑا خطرناک ہوتا ہے اور سامنے سے حملہ کرتا ہے۔ مجھے جنگلی سوروں سے بچنے اور انہ
ہلاک کرنے کے سارے گر معلوم تھے۔ مگر وہاں ضرورت پیش نہ آئی۔ سور غائب ہو
تھا۔ رات آرہی تھی۔ مجھے جنگل کے دوسرے درندوں کا بھی خیال آنے لگا۔ رات ہو
ہی شیر چیتے وغیرہ (اپنا پیٹ بھرنے کے لئے شکار کی تلاش میں نکل پڑتے ہیں۔ وہ کسی
پہاڑی کے اوپر سے مجھ پر حملہ کر سکتے تھے۔ میں نے اوپر دیکھا۔ پہاڑی ٹیلے کی ڈھلا

یادہ سیدھی تھی اور اس طرف سے پہاڑی پر نہیں چڑھا جا سکتا تھا۔ میں پہاڑی پر چڑھنا
ہتا تھا تا کہ وہاں چھپ کر رات گزارنے کے لئے کوئی غار وغیرہ ہو تو وہاں رات گزار
ں اور اس کے بعد جیسے حالات ہوں ویسے کوئی اگلا قدم اٹھاؤں۔ اب دن کی روشنی جیسے
ہنے لگی تھی۔ بادل اس طرح آسمان پر جھکے ہوئے تھے۔ ان بادلوں کی وجہ سے کچھ زیادہ
اندھیرا ہو گیا تھا۔ میں رات پڑنے سے پہلے پہلے کوئی ایسا ٹھکانہ تلاش کر لینا چاہتا تھا
اں میں بارش سے بھی محفوظ رہ سکوں۔ کیونکہ مجھے بادلوں میں ایک بار ہلکی گرج سنائی
ی تھی۔ کوئی پتہ نہیں تھا کس وقت بارش شروع ہو جائے۔

چلتے چلتے وہ پہاڑی ایک طرف کو مڑ گئی جس کے ساتھ ساتھ میں چل رہا تھا۔ یہاں
ے ایک خاص قسم کی سیٹی کی آواز آئی میں نے آواز پہچان لی۔ یہ سانپ کی آواز تھی۔
علاقوں میں بارشوں کے موسم میں سانپ بلوں سے باہر نکل آتے ہیں اور جنگلی کیڑوں
ڑوں اور چوہوں کا شکار کرتے ہیں۔ یہ اتنے گھنے جنگل نہیں تھے کہ یہاں کوئی شیر بھی
ود ہوتا۔ ویسے شیر کا کوئی پتہ نہیں ہوتا۔ ہندوستان کے وسطی جنگلوں میں رات کو شیر
تے پھرتے دور دور تک نکل جاتے ہیں۔ دوسری پہاڑی سامنے ہی تھی۔ میں نے
ھا کہ اس کی چڑھائی سیدھی نہیں تھی۔ جھاڑیوں کے درمیان مجھے ایک پتلی سی
نڈی کی جھلک بھی نظر آ کر شام کے بڑھتے ہوئے اندھیرے میں غائب ہو گئی۔ قریب جا
یں نے اس پگ ڈنڈی کو ڈھونڈ لیا اور پہاڑی پر چڑھنے لگا۔ چڑھائی تو اتنی مشکل نہیں
لیکن جھاڑیاں اتنی گھنی تھیں کہ مجھے ادھر ادھر سے ہو کر چڑھنا پڑ رہا تھا۔ کافی دیر بعد
پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ گیا۔ اوپر پہنچتے پہنچتے شام کا دھندلکا اور گہرا ہو گیا تھا۔ پہاڑی کے
کافی جگہ تھی۔ درخت کھلے کھلے اگے ہوئے تھے۔ دوسری طرف پہاڑی کی چوٹی کے
ایک چھوٹی سی پہاڑی کھڑی تھی۔

میں نے اس پہاڑی کا جائزہ لیا۔ یہ کالے رنگ کی بہت بڑی چٹان تھی جس کے آگے
کئی ٹن بڑے بڑے پتھر ایسے پڑے تھے جیسے کبھی وہاں زبردست زلزلہ آیا ہو اور چٹان
اوپر کا حصہ ٹوٹ کر نیچے گر پڑا ہو۔ میں ان پتھروں میں ادھر ادھر چل کر چھپنے کے لئے

کوئی جگہ تلاش کرنے لگا۔ پتھر اتنے بڑے بڑے تھے کہ ان میں چلتے وقت وہ میرے
سے کئی فٹ اونچے اونچے تھے۔ یہ بالکل صاف پتھریا چٹانیں تھیں۔ ان پر نہ مٹی جمی ہو
تھی اور نہ کوئی گھاس ہی اگی ہوئی تھی۔ میں ان پتھروں میں سے گزرتا ہوا اس ٹیلے یا
چٹان کے دامن میں آگیا جس کے یہ پتھر بکھرے ہوئے ٹکڑے تھے۔ یہاں مجھے ایک
سے پانی کے گرنے کی آواز سنائی دی۔ ذرا آگے جا کر دیکھا کہ دو پتھروں کے درمیان
پانی کی ایک دھار نیچے پتھروں کے درمیان گر رہی تھی جہاں ایک چھوٹا سا تالاب بن
تھا۔ میں نے پہلا کام یہ کیا کہ نیچے اتر کر منہ ہاتھ دھویا۔ پانی پی کر پیاس بجھائی اور واپ
اوپر آگیا۔ خدا جانے یہ پانی کہاں سے آرہا تھا۔ میری سمجھ میں یہ بات کبھی نہیں آسکی
کہ پہاڑیوں کے اوپر اور بڑی بڑی چٹانوں کے اندر پانی کہاں سے پیدا ہو کر نیچے چشمو
اور جھرنوں کی شکل میں بہنے لگتا ہے۔ آپ اسے کچھ کہیں۔ لیکن میں اسے خدا کی شا
ہی کہوں گا۔ میں نے اتنے جنگلوں کی دربدری کی ہے کہ آپ اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے
میں نے اس دربدری میں ایسی ایسی پہاڑیوں کے اندر سے غاروں میں اور چٹانوں کے ا
سے پانی کی دھاریں نکلتی دیکھی ہیں کہ جہاں پانی کی موجودگی کا کبھی یقین نہیں آسکتا۔
پانی نیچے جا کر آبشاریں بن جاتا ہے اور میدانی علاقوں میں جا کر جب ادھر ادھر کی ندیا
اس میں شامل ہو جاتی ہیں دریاؤں کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ یہ سب اللہ کی شان ہے
کبھی ان کی وضاحتیں جغرافیہ کی کتابوں میں نہ ڈھونڈتے پھریں۔ بس دل میں یقین کر
کہ یہ سب اللہ کی شان ہے جو ہر شے کا مالک ہے اور ہر شے پر قادر ہے۔ آپ دنیا
کسی شے کی وضاحت تلاش نہیں کر سکیں گے۔ عقل جواب دے جائے گی۔ کتابیں خامو
ہو جائیں گی۔ یاد رکھیں آج کی جدید ترین سائنس اور سائنسدان بھی ادھر ادھر سے گھ
پھر کر اس قادر مطلق کے قدموں میں پہنچ رہے ہیں۔ اگر یقین نہ آئے تو ماڈرن ٹیکنالو
اور ماڈرن طبیعات وارضیات کی جدید ترین کتابیں پڑھ کر دیکھ لیں۔ آپ یہ کتابیں نہ
پڑھتے۔ میں پڑھتا تھا۔ مگر اب میں بھی یہ کتابیں نہیں پڑھتا۔ جب اللہ تعالیٰ نے ا
پاک کلام میں ہمیں سیدھا راستہ دکھا دیا ہے تو ہمیں کسی آئین سٹائین یا برٹینڈ رسل

پیچھے مارے مارے پھرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

میں اپنی داستان سناتے سناتے بیچ میں کبھی کبھی جذباتی ہو کر آپ کے ساتھ اپنے دل کی باتیں کرنے لگ جاتا ہوں۔ آپ بھی دل کھول کر میری ایسی باتیں سن لیا کریں آپ کے بہت کام آئیں گی۔

بڑی والی چٹان کی بالکل سیدھی اوپر کو اٹھی ہوئی دیوار کے ساتھ چند گز تک چلنے کے بعد مجھے ایک جگہ سے دیوار میں خم پڑا ہوا نظر آیا۔ قریب جا کر دیکھا یہ ایک قدرتی غار کا دہانہ تھا جس کے آگے اتنی گھاس اور سرکنڈے اگے ہوئے تھے کہ غار کا دہانہ اس میں چھپ گیا تھا۔ میرے جنگلوں پہاڑوں کے تجربے نے مجھے بتا دیا تھا کہ یہاں کوئی شگاف موجود ہے ورنہ میں بھی آگے نکل گیا تھا۔ یہ ایک قدرتی غار تھا۔ اندر ابھی اتنا زیادہ اندھیرا نہیں تھا۔ میں نے اوپر دیکھا۔ اس کی چھت کافی اونچی تھی اور کٹی پھٹی تھی۔ کئی جگہوں پر بڑی بڑی پتھریلی نوکیں نیچے کو نکلی ہوئی تھیں۔ غار کے اندر بھی چھوٹے بڑے گول گول پتھر بہت زیادہ بکھرے ہوئے تھے۔ ایک عجیب قسم کی نامانوس سی بو غار میں پھیلی ہوئی تھی۔ یہ سیلن اور جلی ہوئی جھاڑیوں کی بو تھی۔ میں نے غار میں زیادہ آگے جانا مناسب نہ سمجھا۔ کیونکہ رات کی تاریکی چھانے لگی تھی اور مجھے آگے جانے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ وہاں میں بڑے آرام سے رات گزار سکتا تھا۔ اگر وہاں میری تلاش میں پولیس والے آ بھی جاتے تو پتھروں پر چلنے سے مجھے ان کے جوتوں کی آواز دور ہی سے آسکتی تھی اور میں وہاں سے نکل کر کسی دوسری طرف فرار ہو سکتا تھا۔ اس کے علاوہ میرے پاس میرا ہتھیار زہریلی بال پوائنٹ پنسل موجود تھی جس سے میں اپنا بچاؤ کر سکتا تھا۔ اگرچہ اتنی دور پہاڑیوں میں اتنی جلدی پولیس کے آنے کی توقع نہیں تھی۔

میں نے وہیں پتھروں کو ادھر ادھر ہٹا کر جگہ صاف کی اور غار کی دیوار سے لگ کر بیٹھ گیا۔ مجھے بیٹھنے کے بعد جو سکون محسوس ہوا اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ میں کافی دور سے چل کر پہاڑی کی چڑھائی چڑھ کر وہاں آیا ہوں۔ غار کے باہر چٹانی پتھروں کے کافی آگے اگرچہ چند ایک اونچے اونچے درخت تھے ان میں کسی کسی درخت میں دو ایک پرندے

تھوڑی تھوڑی دیر بعد بول لیتے تھے۔ جب رات گہری ہوگئی تو وہ بھی خاموش ہوگئے۔ ایک تو میں زمین سے کافی بلندی پر تھا دوسرے یہ جگہ شہر کے شور وغل سے کافی دور تھی۔ رات پڑتے ہی ایک تو وہاں ایک دم سے اندھیرا چھا گیا۔ دوسرے اتنی زیادہ خاموشی چھا گئی کہ مجھے اپنے سانس کے چلنے کی آواز بھی سنائی دینے لگی۔ مجھے ایسی ہی دور دراز اور خاموش جگہ چاہیے تھی۔ سوچا یہاں رات کو آرام کرتا ہوں۔ دن نکلے گا تو پہاڑیوں کی دوسری جانب نکل جاؤں گا اور جل گاؤں شہر سے آگے بھوساول اور برہان پور کے شہروں کی طرف نکل جانے کی کوشش کروں گا۔ کیونکہ دلی کی طرف جانے کے لئے یہی روٹ تھا۔ میں کافی تھک چکا تھا۔ جیسے ہی تھوڑا آرام ملا مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔

مجھے اندازہ نہیں میں کتنی دیر تک سویا ہوں گا کہ ایک آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ یہ بادلوں کے گرجنے کی آواز تھی۔ غار کے دہانے کے باہر سرکنڈوں کے پیچھے بجلی چمکی۔ اور دوسرے لمحے بادل زور سے گرجا۔ اس کے ساتھ ہی موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ یہ موسلا دھار بارش میرے حق میں بڑی اچھی تھی۔ اب اس طرف کسی پولیس پارٹی کے آنے کا امکان یا خطرہ نہیں رہا تھا۔ مجھے پتہ تھا ان علاقوں میں بارش دیر تک ہوتی رہتی ہے اگر دو گھنٹے بھی بارش ہوئی تو جل گاؤں شہر سے یہاں تک راستے میں جتنے ندی نالے اور تالاب ہیں سب بھر جائیں گے اور پولیس اس طرف کا رخ نہیں کرے گی۔ غار کے اندر مچھر ضرور آگئے تھے۔ خدا جانے یہ بارش کے ساتھ ہی کہاں سے نکل آئے تھے۔ میری جیب میں سگریٹ کا پیکٹ اور ماچس اسی طرح پڑی تھی۔ میری نقدی کے ساتھ یہ چیزیں بھی پولیس انسپکٹر نے میرے پاس ہی رہنے دی تھیں۔ میں نے اٹھ کر اندھیرے میں ادھر ادھر سے سوکھی گھاس اور جھاڑیاں اکٹھی کر کے ان میں آگ لگا دی اور پھر آگ کو اس طرح بجھا دیا کہ اس میں سے صرف دھواں ہی نکلتا رہے۔ ہمیں اس کی بھی باقاعدہ ٹریننگ دی گئی تھی۔ آگ میں نے صرف اتنی جلائی تھی کہ دھواں غار میں بھرے نہیں بلکہ پتلی لکیر کی شکل میں غار کی چھت کی طرف جا کر وہاں جمع ہوتا رہے اور پھر غار کے دہانے سے آہستہ آہستہ باہر نکلتا رہے۔

اس سے مجھے یہ فائدہ ہوا کہ مچھروں سے جان بچ گئی اور کوئی کیڑا مکوڑہ یا سانپ بچھو بھی میرے قریب نہیں آسکتا تھا۔ جانور اور کیڑے مکوڑے آگ سے بڑا ڈرتے ہیں اور انہیں دور ہی سے اس کا احساس ہو جاتا ہے اور وہ اپنا راستہ بدل لیتے ہیں۔ میں دوبارہ سونے کی کوشش کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد میں واقعی سو گیا۔ میرا خیال ہے میں کافی دیر سوتا رہا تھا۔ کیونکہ جب میری آنکھ کھلی تو باہر بارش رک چکی تھی۔ میں اٹھ کر غار سے باہر آگیا۔ باہر دیکھا کہ آسمان بادلوں کی وجہ سے گہرے سلیٹی رنگ کا دکھائی دے رہا تھا۔ ابھی رات ہی تھی۔ اگر پو پھٹ رہی ہوتی تو بادلوں کے پیچھے سے پھیکی پھیکی سفیدی ضرور جھلک رہی ہوتی۔ میں غار میں واپس آکر بیٹھ گیا۔ آگ بجھ چکی تھی۔ کبھی کبھی کوئی ایک آدھ مچھر میرے کان کے گرد منڈلاتا اور میرے ہاتھ مارنے پر بھاگ جاتا تھا۔ پہلے میں نے سوچا کہ میں کیوں نہ دن کی روشنی ہونے سے پہلے ہی یہاں سے نکل جاؤں۔ پھر یہ سوچ کر یہ ارادہ ملتوی کر دیا کہ جنگل ان جانا ہے۔ ندی نالے بھرے ہوئے ہوں گے۔ کہیں راستے سے نہ بھٹک جاؤں۔

میں پو پھٹنے کا انتظار کرنے لگا۔

میں نے سگریٹ نکال کر سلگا لیا تھا۔ اس وقت سگریٹ پینے کا اتنا مزا آیا کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ مجھے اچانک ماضی کے زمانے میں ملی ہوئی اپنی محسن سمیری قوم کی لڑکی سوسن کا خیال آگیا۔ ساتھ ہی میں بے اختیار ہو کر خدا کا شکر ادا کرنے لگا کہ اس نے اپنے فضل و کرم سے مجھے چندریکا بدروح کی دی ہوئی بیماری سے ہمیشہ کے لئے شفا عطا کر دی تھی۔ مجھے نجیب آباد والے پتھر گڑھ قلعے کی شہید خاتون کا بھی خیال آگیا جس نے مجھے ماضی کے زمانے میں سوسن کے پاس بھیجا تھا اور سوسن مجھے روشن بزرگ کے پاس لے گئی تھی جس نے اللہ کے حکم سے میری بیماری دور کر دی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں ان سب کا شکریہ ادا کیا۔ سوسن کا خیال آتے ہی یہ بھی خیال آنے لگا کہ وہ میرے اس ماڈرن زمانے میں واپس آنے کے بعد صرف ایک بار ہی مجھے ملی تھی اس کے بعد اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ حالانکہ وہ جس وقت چاہے ماضی کے زمانے سے نکل کر ہمارے زمانے میں آسکتی

تھی۔ پھر خیال آیا کہ یہ ماورائی لوگ بغیر کسی صالح مقصد کے یونہی کسی سے نہیں ملا کرتے۔ اگرچہ مجھے ماضی کے زمانے میں واپس جانے کی ترکیب بتا دی گئی تھی مگر مجھے بھی بلا ضرورت اپنا زمانہ اور وہ حالات چھوڑ کر جن کا میں مقابلہ کر رہا تھا ماضی کے زمانے میں واپس جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ اگرچہ کبھی کبھی دل میں یہ آرزو ضرور پیدا ہوتی تھی کہ میں ماضی کے زمانے میں سوسن کے پاس جاؤں اور اس سے درخواست کروں کہ وہ مجھے سمیری تہذیب کے زمانے سے لے کر پاکستان کے قیام تک کی تاریخ اور خاص طور پر اسلامی تاریخ کی سیر کرائے تاکہ میں اپنی آنکھوں سے اسلام کے نامور مجاہدوں طارق بن زیاد' محمد بن قاسم' سلطان صلاح الدین ایوبی اور محمود غزنوی بت شکن کو کفر کے خلاف جہاد کرتے دیکھوں۔ لیکن میں اس وقت خود کشمیر میں کفر کے خلاف جہاد کر رہا تھا۔ میں پاکستان کی سلامتی اور کشمیر کے محاذ کو چھوڑ کر ماضی کی دنیا میں نہیں جا سکتا تھا۔

بارش رک جانے کے بعد بادلوں نے بھی گرجنا بند کر دیا تھا۔ پہاڑی کے اردگرد رات ایک بار پھر خاموش اور ساکت ہو گئی تھی۔ میں جاگ رہا تھا اور پو پھٹنے کے انتظار میں تھا۔ اتنے میں مجھے ٹرین کے انجن کی سیٹی کی آواز سنائی دی۔ یہ آواز دور سے آئی تھی۔ ضرور اس پہاڑی کے پیچھے ریلوے لائن تھی۔ دوسری بار انجن کی سیٹی کی آواز ذرا قریب سے آئی تو میں غار سے نکل کر چٹانوں کے پیچھے آ گیا۔ یہاں پہاڑی کی پچھلی ڈھلان شروع ہو جاتی تھی۔ میں نے مغرب کی طرف جو ایک پہاڑی رات کے اندھیرے میں بھوت کی طرح نظر آ رہی تھی اس طرف مجھے ریل کے انجن کی روشنی نظر آئی جو آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی۔ پھر انجن کی چھک چھک سنائی دینے لگی۔ اس آواز سے صاف پتہ چل رہا تھا کہ ٹرین چڑھائی چڑھ رہی ہے اور بہت آہستہ آہستہ چل رہی ہے۔ انجن کی روشنی آہستہ آہستہ قریب آ رہی تھی۔ اس کی روشنی میں مجھے ڈھلان کے نیچے ریل کی پٹڑی چمکتی ہوئی دکھائی دی۔ یہاں اترائی بہت آسان تھی۔ میں ریل کو قریب سے دیکھنے کے لئے نیچے اترنے لگا۔ ریل گاڑی سانپ کی طرح بل کھاتی میرے والی پہاڑی کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس کے ڈبوں میں روشنی ہو رہی تھی۔ میں بہت نیچے نہ گیا۔ آدھی

ڈھلان پر ہی جھاڑیوں کی اوٹ میں ہو گیا تاکہ اگر مجھ پر انجن کی روشنی پڑے تو میں دور سے کسی کو نظر نہ آ سکوں۔ یہاں پہاڑی چڑھائی کافی اونچی تھی۔ بہت جلد میں نے دیکھ لیا کہ ٹرین کو دو انجن لگے تھے۔ ایک انجن آگے تھا دوسرا انجن پیچھے لگا ہوا تھا۔ دونوں انجن دھواں چھوڑ رہے تھے اور ٹرین اتنی سست رفتار سے چل رہی تھی کہ آدمی اتر کر اس میں دوبارہ سوار ہو سکتا تھا۔ اچانک میرے دل میں خیال آیا کہ مجھے اس ٹرین میں بیٹھ کر یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ لیکن خیال کے دل میں پیدا ہونے اس کو ارادے میں تبدیل کرنے اور پھر اس ارادے پر عمل کرنے میں مجھے دیر لگ گئی۔ اتنی دیر میں ٹرین نیچے پہاڑی کے قریب سے ہو کر گزرنے لگی تھی۔ اس وقت اگر میں نیچے چلا بھی جاتا تو ٹرین کو نہیں پکڑ سکتا تھا۔

ٹرین گزر گئی لیکن مجھے ایک ترکیب بتا گئی تھی۔

یہاں پہاڑ کی چڑھائی تھی اور پیچھے سے جو بھی گاڑی آتی تھی یہاں پہنچ کر اس کی رفتار بہت آہستہ ہو جاتی تھی۔ دن میں یہاں سے چار پانچ ریل گاڑیاں ضرور گزرتی ہوں گی۔ اور ان سب کی رفتار یہاں پہنچ کر آہستہ ہو جاتی ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ اگر میں پہاڑی سے اتر کر ریلوے لائن کے قریب کہیں چھپ کر بیٹھ جاؤں تو اس کے بعد آنے والی گاڑی پر میں سوار ہو کر یہاں سے نکل سکتا ہوں۔

قدرت نے خود ہی ایک وسیلہ میرے لئے پیدا کر دیا تھا۔ اب مجھے واپس غار میں جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ رات کا پچھلا پہر تھا اور زیادہ نہیں تو گھنٹے ڈیڑھ دو گھنٹے بعد دوسری کوئی نہ کوئی گاڑی ضرور آنے والی تھی۔ یہ مین لائن تھی کوئی برانچ لائن نہیں تھی۔ اتنا میں جانتا تھا کہ یہ ٹرینیں پیچھے جل گاؤں سے آتی ہیں اور آگے بھوساول برہان پور کی طرف جاتی ہیں یہ سب سٹیشن بمبئی دلی مین لائن پر واقع تھے۔ میں نے ریلوے لائن پر جا کر دوسری گاڑی کے انتظار کرنے کا فیصلہ کر لیا اور آہستہ آہستہ پہاڑی کی اترائی اترنا شروع کر دی۔

ڈھلان پر ایک برساتی نالہ بن گیا ہوا تھا جہاں سے بارش کا پانی اوپر سے نیچے بہتا تھا۔

میں نالے کے ساتھ ساتھ جھاڑیوں کو پکڑ پکڑ کر اندھیرے میں بڑی احتیاط سے نیچے اتر
لگا۔ جب نیچے ریلوے لائن کے پاس پہنچا تو ایک طرف ہٹ کر ایسی جگہ پر بیٹھ گیا جہ
سے مجھے پیچھے بل کھاتی گاڑی کے انجن کی بڑی روشنی نظر آسکتی تھی۔ گاڑی کے گ
جانے کے بعد ریلوے لائن کے آس پاس گہری خاموشی چھا گئی تھی۔ مجھے اگر کوئی خطرہ
تو صرف اس بات کا تھا کہ کوئی جنگلی درندہ ریلوے لائن پر نہ نکل آئے۔ اگرچہ میر
پاس کسی بھی جنگلی درندے کو ہلاک کرنے کے لئے زہریلی سوئی والا بال پوائنٹ موجود
لیکن اگر درندہ پیچھے سے مجھ پر اچانک حملہ کرتا ہے تو میں بے بس ہو سکتا تھا۔ میں
اندھیرے میں گھور گھور کر دیکھا۔ ریلوے لائن کے قریب کوئی اونچا درخت نہیں تھ
جھاڑیاں تھیں یا چھوٹے چھوٹے زمین سے پانچ پانچ فٹ اونچے درخت تھے۔

جہاں پہاڑی کی دیوار نیچے آکر زمین کے ساتھ لگ جاتی تھی وہاں سے کوئی پندرہ بی
فٹ کے فاصلے پر ریلوے لائن تھی۔ ریل کی پٹڑی زمین سے اونچی تھی۔ میں پہاڑی
دیوار کے ساتھ جو جھاڑیاں تھیں ان کے قریب ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ رات کی موسلا دھ
بارش کی وجہ سے جھاڑیاں اور گھاس گیلی ہو رہی تھی۔ بیٹھے بیٹھے اکتا گیا تو اٹھ کر ریلو
لائن کے ساتھ ساتھ ٹہلنے لگا۔ تھوڑی دور تک ٹہلتا ہوا گیا پھر واپس آکر بیٹھ گیا۔ اب
تک کسی ریل گاڑی کی آمد کے آثار نہیں تھے۔ رات گزرتی چلی گئی۔ پھر بادلوں کے پیچ
سے صبح کی سفیدی نمودار ہونے لگی۔ تھوڑی دیر بعد دن کا اجالا ہو گیا۔ اس اجالے م
مجھے ریل کی پٹڑی اور اس کے اوپر جھکی ہوئی پہاڑی ڈھلانیں اور ڈھلانوں پر اگی ہوا
جھاڑیاں بھی نظر آنے لگیں۔ اتنے میں مجھے دور سے ریل گاڑی کے انجن کی سیٹی کی آوا
سنائی دی۔ یہاں پہاڑی موڑ تھا اس لئے انجن یہاں پہنچ کر سیٹی ضرور دیتا تھا۔ میں جلد
سے جھاڑیوں کے پیچھے ہو گیا۔ میں ٹرین کے کسی پچھلے ڈبے میں سوار ہونا چاہتا تھا اور
نہیں چاہتا تھا کہ اگلے ڈبوں کے مسافر مجھے دیکھیں۔ کیونکہ دن کی روشنی چاروں طرف
پھیلی ہوئی تھی۔ میں جل گاؤں کے انسپکٹر کا خون کر کے بھاگا تھا اور یہ گاڑی پیچھے جل
گاؤں کے سٹیشن ہی سے آرہی تھی۔ مجھے بے حد احتیاط کی ضرورت تھی۔ گاڑی چونکہ

ھائی چڑھ رہی تھی اس لئے اس کا انجن کافی دیر بعد مجھے نظر آیا۔ انجن تھوڑی
ر بعد سیٹی دے رہا تھا۔ انجن چھک چھک کرتا بڑی آہستہ رفتار کے ساتھ لائن پر میری
ف بڑھ رہا تھا۔ انجن کو چڑھائی پر چونکہ پوری طاقت خرچ کرنی پڑ رہی تھی اس لئے
ں کی چمنی میں سے سیاہ کالے دھوئیں کے بادل اٹھ رہے تھے۔ ٹرین پہاڑی کے موڑ
ے نکل کر سامنے آئی تو مجھے ٹرین کے پیچھے لگے ہوئے دوسرے انجن کا دھواں بھی نظر
نے لگا۔

مجھے جلدی کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں بڑی آسانی سے ٹرین پکڑ سکتا تھا۔
انچہ میں جھاڑیوں کے پیچھے چھپ کر بیٹھا رہا۔ انجن آہستہ آہستہ قریب آتا جا رہا تھا۔ پھر
ہ میرے قریب سے شور مچاتا بھاپ اور دھوئیں کے مرغولے اڑاتا آہستہ آہستہ گزر گیا۔
نجن ڈرائیور اور فائرمین مجھے صاف نظر آئے۔ مجھے خدشہ تھا کہ یہ کہیں مال گاڑی نہ
و۔ مگر یہ مسافر گاڑی تھی۔ مسافروں سے بھرے ہوئے ڈبے گزرنے لگے۔ ٹرین واقعی
ڑی دھیمی رفتار سے چل رہی تھی۔ میں پچھلی بوگی کے انتظار میں بیٹھا رہا۔ جب آخری
گی میرے سامنے سے گزرنے لگی تو میں باہر نکلنے کے لئے تیار ہو گیا۔ اب مجھے پیچھے لگا
ہوا انجن صاف نظر آیا تھا۔ میں خاموشی سے جھاڑیوں کے پیچھے سے نکل آیا اور ٹرین کے
ساتھ ساتھ آگے کی طرف چلنے لگا۔

جب آخری ڈبہ آیا تو میں دروازے کے ہینڈل کو پکڑ کر پائیدان پر چڑھ گیا۔ دروازہ
بند تھا۔ مجھے اوپر آتا دیکھ کر ایک مسافر نے دروازہ کھول دیا۔ میں خاموشی سے ڈبے میں
داخل ہو کر وہیں دروازے کے پاس بیٹھ گیا۔ ٹرین آہستہ آہستہ چلی جا رہی تھی۔ پچھلے
انجن کا وہاں پورا شور سنائی دے رہا تھا۔ میں نے بڑے محتاط انداز میں نظریں اٹھا کر ڈبے
میں بیٹھی ہوئی سواریوں کا جائزہ لیا۔ تھرڈ کلاس کا ڈبہ تھا اور اس میں کافی سواریاں بیٹھی
تھیں۔ ان میں مخصوص ٹوپیوں والے گجراتی بھی تھے اور دھوتی کرتوں والے ہندو بھی
سوار تھے۔ دو چار ساڑھی والی عورتیں بھی اپنے بچوں کو لئے بیٹھی تھیں۔ سواریاں ایک
دوسرے سے باتیں کرنے اور اپنے اپنے کام میں لگی تھیں۔ زیادہ تر لوگ کھڑکیوں میں

سے باہر کا منظر دیکھ رہے تھے۔ کسی کی توجہ میری طرف نہیں تھی۔ یہ بڑی اچھی بات تھی۔ اب میں چاہتا تھا کہ جلدی سے ٹرین کی رفتار تیز ہو تاکہ میں اس علاقے سے جتنی جلدی دور نکل سکتا ہوں نکل جاؤں۔

پہاڑ کی چڑھائی ختم ہوئی تو ہموار جگہ آگئی۔ اس کے آگے پھر اترائی تھی۔ اترائی ٹرین نے رفتار پکڑی اور کھٹا کھٹ کرتی بڑی تیزی سے ڈھلان اترنے لگی۔ ٹرین پہاڑیوں سے نکل آگئی اور میدان شروع ہو گئے۔ کہیں کہیں ہرے بھرے کھیت بھی تھے۔ کسی کسی وقت کوئی ٹیلہ آجاتا اور ٹرین تیزی سے آگے نکل جاتی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میں جل گاؤں سے دور سے دور تر ہوتا جا رہا تھا۔ آسمان پر بادل اسی طرح جھکے ہوئے تھے۔ پتہ نہیں بارش ہو رہی تھی کہ نہیں۔ ڈبے میں بیٹھ کر اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ باہر سے ہوا کے تھپیڑے ڈبے میں آرہے تھے۔ ایک بار مجھے اپنے چہرے پر پانی کی بوندیں گرتی محسوس ہوئیں۔ اس کا مطلب تھا کہ باہر بارش پھر شروع ہو گئی تھی۔ میں نے اٹھ کر دروازے کی کھڑکی میں سے ہاتھ باہر نکالا۔ بارش موسلا دھار نہیں تھی۔ ہلکی ہلکی بونداباندی ہونے لگی تھی۔ میں دوبارہ دروازے کے پاس ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ بھوساول وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ میرے اندازے کے مطابق گھنٹے سوا گھنٹے میں ٹرین کو بھوساول پہنچ جانا تھا۔ میں نے یہی پروگرام بنایا کہ جیسے ہی ٹرین بھوساول شہر میں داخل ہو گی میں ڈبے کے ٹائیلٹ میں چھپ کر بیٹھ جاؤں گا۔ مجھے یقین تھا اور اس بات کا قوی امکان تھا کہ بھوساول پولیس کو میرے فرار اور پولیس انسپکٹر کے قتل کے بارے میں الرٹ کر دیا ہو گا اور سٹیشن پر پولیس اور خفیہ پولیس کی بھاری نفری موجود ہو گی اور ٹرین کی تلاشی لی جائے گی۔

گاڑی ہرے بھرے کھیتوں اور میدانوں میں دوڑتی جا رہی تھی۔ ٹیلے اور پہاڑیاں دور دور ہٹ گئی تھیں۔ تقریباً سوا گھنٹے کے سفر کے بعد ریلوے لائن کے آس پاس آبادیاں نظر آنے لگیں۔ گاڑی شہر کے ایک بڑے پل پر سے گزری جس کے نیچے سے موٹر کار اور رکشے اور دو بیل گاڑیاں گزرتی میں نے دیکھیں۔ میں اٹھ کر ٹائیلٹ میں جانے کے

ے میں سوچ رہا تھا کہ گاڑی کی رفتار ایک دم سے کم ہو گئی اور پھر ایک دھچکے کے تھ رک گئی۔ ایسے معلوم ہوتا تھا کہ گاڑی کو اچانک سرخ سگنل دے کر روک لیا گیا ۔ میں نے کھڑکی میں سے جھانک کر اگلے ڈبوں کی طرف دیکھا۔ میرے دل کی دھڑکن ز ہو گئی۔ مجھے ریلوے لائن کے پاس باوردی پولیس کی بھاری تعداد دکھائی دی۔ اب ئیلٹ میں چھپنا اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کرنے کے برابر تھا۔ کیونکہ پولیس کی یادہ تعداد بتا رہی تھی کہ ایک ایک ڈبے کی تلاشی لی جانے والی تھی۔ گاڑی کو اسی مقصد ے لئے سٹیشن سے کافی پیچھے روک لیا گیا تھا کہ مفرور قاتل اور جاسوس مسافروں کے وم میں گم نہ ہو جائے۔ میں نے اپنے حواس کو قابو میں رکھا۔ ڈبے کے دوسرے روازے میں سے بھی مسافر جھانک کر باہر دیکھ رہے تھے کہ ٹرین کیوں کھڑی ہو گئی ہے۔ ں بھی دوسرے دروازے پر آکر باہر دیکھنے لگا۔ ٹرین کی اس طرف بھی پولیس موجود تھی ر ڈبوں کے آگے پھیل کر ٹرین کو گھیرے میں لے رہی تھی۔ اگلے ڈبوں کی جانب سے یک دیہاتی آرہا تھا۔ کسی نے پوچھا کیا ہوا ہے بھیا؟ پولیس کیوں آئی ہے؟ اس نے کہا۔

”کوئی قیدی بھاگ گیا ہے۔ پولیس اسے ڈھونڈ رہی ہے۔“

میں چپکے سے دروازے میں سے پیچھے کھسک گیا۔ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ یہ وقت رین سے نکل کر جس طرف منہ اٹھے اسی طرف بھاگ جانے کا وقت تھا۔ جیسا کہ میں بتا کا ہوں۔ یہ آخری بوگی کا آخری ڈبہ تھا اور اس کے پیچھے بھی ایک انجن لگا ہوا تھا۔ ڈبے ے کچھ مسافر حالات معلوم کرنے کے لئے ڈبے سے اتر رہے تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ ی نیچے اتر گیا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا انجن کے پیچھے خالی ریلوے لائن پر آگیا پیچھے ریلوے ائن خالی پڑی تھی اور ریلوے لائن کی دونوں جانب بھی کوئی نہیں تھا۔ میں نے ریلوے ائن کے درمیان پیچھے کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ یہاں پیچھے سے مجھے کچھ دور تک کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس کے بعد میں آگے ٹرین کی دونوں جانب موجود پولیس کو نظر آسکتا تھا۔ جب میں نے محسوس کیا کہ میں محفوظ رینج سے نکلنے والا ہوں اور پیچھے سے مجھ پر پولیس والوں کی نظر پڑ سکتی ہے تو میں ریلوے لائن پر بیٹھ گیا۔ میں نے سر آگے نکال کر

گاڑی کے ڈبوں کی طرف دیکھا۔ مجھے پولیس کے سپاہی ڈبوں میں گھستے اور ڈبوں سے نکلے نظر آئے۔

ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ پیدل چلنے کا راستہ بنا ہوا تھا۔ اس کی دوسری جانب اونچی اونچی جھاڑیاں تھیں۔ اس کے آگے کیا تھا؟ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ میں اٹھ کر کھڑے ہونے کی بجائے بیٹھے بیٹھے آگے کھسک کر جھاڑیوں میں گھس گیا۔ جھاڑیوں میں گھستے ہی میں جھک کر جس طرف منہ تھا اس طرف جلدی جلدی چلنے لگا۔ یہ کوئی جنگل نہیں تھا۔ گاڑی بھوساول شہر کے مضافات میں کھڑی تھی۔ مجھے سڑک پر سے گاڑیوں کے گزرنے اور ہارن دینے کی آوازیں آرہی تھیں۔ ریلوے لائن زمین سے اونچی تھی۔ آگے دیوار تھی جس کی دوسری طرف نیچے سڑک پر ٹریفک چل رہی تھی۔ دیوار دس بارہ فٹ سے زیادہ اونچی تھی۔ میں دیوار سے نیچے اترنے کے لئے کوئی جگہ تلاش کرتے ہوئے پیچھے کی طرف چلنے لگا۔ آگے ایک جگہ سے ریلوے کی دیوار ٹوٹی ہوئی تھی اور وہاں ڈھلوان بنی ہوئی تھی جہاں سے ایک عورت اپنے بچے کے ساتھ نیچے سڑک پر اتر رہی تھی۔ میں بھی وہاں سے اتر کر سڑک پر آگیا۔ سڑک کے پار مکانوں کی قطار تھی جن کے درمیان ایک تنگ سی گلی نظر آئی تو میں سڑک کراس کر کے اس گلی میں داخل ہو گیا۔ اب میں نے تیز تیز چلنا شروع کر دیا تا کہ اس علاقے سے جتنی دور نکل سکتا ہوں نکل جاؤں۔

گلی کے آگے پھر بازار تھا۔ یہاں چند ایک کھوکھا نما دکانیں ہی تھیں۔ ایک طرف مندر تھا۔ مندر کے آگے چھوٹا سا تالاب تھا۔ بارش کی وجہ سے سڑک گیلی تھی۔ میں سڑک کراس کرنے لگا کہ پیچھے ایک لاری آکر مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر رک گئی۔ کلینر نے دروازے میں سے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"برہان پور۔ برہان پور لالہ جی۔"

بھوساول سے اگلا شہر برہان پور ہی تھا۔ میں نے سوچا اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ آگے جو ہو گا دیکھا جائے گا اس خطرے والے علاقے سے تو نکلو۔ میں دوڑ کر

لاری میں گھس گیا۔ یہ بھی نہ سوچا کہ آگے جا کر لاری کی بھی چیکنگ ہو سکتی ہے۔ لاری میں کافی سواریاں بیٹھی تھیں۔ میں بھی ایک جگہ سواریوں میں گھس کر بیٹھ گیا۔ کلینر نے لاری کا دروازہ بند کرتے ہوئے زور سے ہاتھ مار کر کہا۔

"چلو دادا"

اور لاری روانہ ہو گئی۔

میں لاری کے دروازے کے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا۔

سوچ رکھا تھا کہ اگر آگے پولیس کی کوئی چیک پوسٹ ہوئی تو لاری سے اتر کر فرار ہ
جاؤں گا۔ لاری بھوساول شہر کی سڑکوں پر سے ہوتی ہوئی برہان پور جانے والی سڑک پر نکل
پیچھے ا۔ شہر میں کسی جگہ پولیس کی چیک پوسٹ نہیں تھی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ ب
ڈھلوان شدہ تھی کہ مجھے دلی نہیں تو کم از کم بھوپال سے آگے تک اسی طرح قسطوں میں
تھی۔ میں ے گا۔ میں کوئی جیل سے بھاگا ہوا کوئی عام قیدی ہوتا تو پولیس کو میرے بار
تردد اور بک بک کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن میں عام قیدی نہیں تھا۔ ایک
درمیان ں نے پولیس کے اعلیٰ افسر کو قتل کیا تھا دوسرے بقول پولیس کے میں پاکستانی جاسو
تھا جس نے بھارت کے مختلف علاقوں میں اپنی کمانڈو سرگرمیوں سے زبردست تباہی مچا
تھی۔ ظاہر ہے جل گاؤں سے لے کر بھوپال تک کی پولیس کو میرا حلیہ بتا کر خبردار کر دیا
گا اور پولیس ہر شہر کے ریلوے سٹیشن اور لاری اڈوں پر مجھے پکڑنے کے لئے موجود ہ
گی۔

بھوساول سے برہان پور تک کا فاصلہ اتنا ہی ہے جتنا لاہور سے گجرات تک کا فاصلہ
ہے۔ لاری بڑی شکستہ حال تھی اور آہستہ چل رہی تھی۔ میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد آ
سڑک پر نگاہ ڈال لیتا تھا۔ راستے میں لاری سواریاں بھی اٹھا رہی تھی۔ یوں رک رک ک
چل رہی تھی۔ بھوساول کا شہر آج کل کے بھارت کے صوبہ مہاراشٹر میں واقع ہے۔ برہان
پور سے بھارت کی صوبہ مدھیہ پردیش یعنی وسطی ہندوستان کے گھنے جنگلوں والے علا

کی سرحد شروع ہو جاتی ہے۔ برہان پور سے کچھ کلومیٹر پیچھے مدھیہ پردیش کے گھنے جنگل
اور چھوٹی بڑی پہاڑیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ میں ان جنگلوں سے واقف تھا۔ سارے کے
سارے جنگل تو میں نے نہیں دیکھے تھے مگر یہاں چونکہ ایک مرد مومن نے مجھے کمانڈو
ٹریننگ دی تھی اس لئے اس کے ہوشنگ آباد والے جنگل میرے لئے اجنبی نہیں تھے۔
مگر ہوشنگ آباد برہان پور سے کافی فاصلے پر تھا۔ موسم کی صورت حال یہ تھی کہ صبح سے
ہلکی ہلکی بونداباندی ہو رہی تھی۔ کسی وقت تھوڑی دیر کے لئے رک جاتی اور اس کے
بعد پھر شروع ہو جاتی۔ موسلا دھار بارش بس رات کو ہی ہوئی تھی۔ راستے میں ایک قصبہ
آیا تو لاری رک گئی۔ دکانیں ٹین کی ڈھلانی چھتوں والی تھیں۔ ایک آدمی سنتروں کا ٹوکرا
اٹھائے لاری کے پاس آگیا۔ یہ ناگ پوری سنترے تھے۔ ناگ پوری سنترے باہر سے سبز
اور اندر سے کیسری رنگ کے ہوتے ہیں۔ کسی زمانے میں ناگ پوری سنترے بڑے
مشہور تھے مگر ان سنتروں کو پاکستان کے کنوؤں نے چاروں شانے چت گرا دیا۔ 65ء کی
جنگ سے پہلے پاکستان سے جو پاکستانی ویزا لے کر انڈیا جاتا تھا بھارت کے لوگ اس سے
پہلا سوال یہ کرتے تھے۔

"پاکستانی کنو لائے ہو تو ہمیں دے دو ہم منہ مانگے پیسے دیں گے۔"

بھارت سے جو لوگ ویزا لے کر پاکستان آتے تھے وہ پاکستان سے واپس انڈیا جاتے
ہوئے کنوؤں کا ٹوکرا بھر کر ضرور لے جاتے تھے۔ ناگ پور کے سنترے دیکھ کر مجھے پاکستان
کے کنو یاد آگئے۔ پھر اپنا وطن پاکستان بہت یاد آیا۔ یہی دل چاہنے لگا کہ فوراً پاکستان واپس
پہنچ جاؤں اور اپنے والد صاحب کی قبر پر جا کر کہوں۔ ابا جی! میاں جی! میں نے آپ سے
جو وعدہ کیا تھا اسے جان کی بازی لگا کر پورا کر رہا ہوں۔

لاری آگے چل پڑی۔ کافی دیر بعد لاری پھر ایک قصبے کے باہر سڑک پر رک گئی۔
یہاں جنگل میں سے کوئی سڑک نکالی جا رہی تھی۔ بڑے مزدور مرد اور عورتیں کام کر رہی
تھیں۔ میں نے یہاں اتر کر چائے اور ساتھ ڈبل روٹی کے دو چار سلائیس کھا لئے۔ یہ
ناشتہ میرے لئے سارے دن کے لئے کافی تھا۔ آگے کے حالات کا کچھ پتہ نہیں تھا کہ مجھے

کہاں جانا پڑے اور کیا صورت حال پیدا ہو جائے۔

برہان پور کا شہر قریب آ رہا تھا۔ سڑک کی دونوں جانب شہر کی گاڑیاں کبھی کبھی آجاتی تھیں ۔ یہاں دور دور پہاڑیاں درختوں سے ڈھکی ہوئی تھیں ۔ لاری ایک بار پھر جنگل والے علاقے سے گزرنے لگی۔ بوندا باندی رک گئی تھی۔ سڑک کی دونوں جانب کہیں دیودار اور کہیں سال کے گھنے درخت آجاتے تھے۔ یہ وسطی ہندوستان کے گھنے جنگلوں کے درخت تھے۔ سامنے سے فوجی گاڑیوں کا کانوائے آنے لگا۔ ہماری لاری سڑک کی ایک جانب ہو گئی اور اس کی رفتار ہلکی ہو گئی۔ لاری سڑک کا موڑ گھومی تو کچھ فاصلے پر ایک اونچے پہاڑ کی ڈھلان پر بنے ہوئے مکان نظر آئے۔ لاری ریلوے پھاٹک سے گزر گئی۔

ریلوے پھاٹک سے کچھ دور جا کر لاری کی رفتار بہت ہلکی ہونے لگی۔ پھر لاری سڑک سے اتر کر رک گئی۔ میں سمجھا کوئی اور قصبہ آیا ہو گا۔ یہاں سے ڈرائیور سواریاں لے کر آگے چلے گا۔ مگر کسی قصبے کے وہاں کوئی آثار نہیں تھے۔ لاری جنگل کے علاقے میں کھڑی ہو گئی تھی۔ میں نے کلینر سے پوچھا کہ گاڑی یہاں کیوں رکی ہے۔ اس نے نیچے اترتے ہوئے کہا۔

"ابھی معلوم کرتا ہوں"

وہ لاری سے اتر کر آگے چلا تو میں نے دروازے میں سے جھانک کر دیکھا۔ ہماری لاری کے آگے بھی دو تین لاریاں کھڑی تھیں ۔ میرے دل میں کچھ شک پیدا ہوا۔ مگر میں نے کوئی خیال نہ کیا۔ ڈرائیور بھی نیچے اتر آیا تھا۔ کلینر جلدی واپس آگیا۔ ڈرائیور نے پوچھا۔

"کیوں رے۔ کیا بات ہے آگے؟"

وہ بولا۔

"دادا آگے پولیس ہی پولیس ہے چیکنگ ہو رہی ہے۔"

"کیا ہو گیا ہے رے؟ کیا ادھر بھوپت ڈاکو آیا ہوا ہے؟"

جب ڈرائیور کی زبان سے یہ جملہ ادا ہوا تو میں لاری سے اتر کر پیچھے جا چکا تھا۔

سامنے سے فوجی گاڑیاں ابھی تک چلی آ رہی تھیں ۔ یہ کوئی ملٹری کانوائے تھا۔ بڑے بڑے فوجی ٹرک تھے جو ترپالوں کی چھتوں والے تھے۔ ایک ٹرک کے بعد دوسرا ٹرک گزر جاتا تھا۔ ان کے درمیان تھوڑا سا وقفہ ملتا تھا۔ میں اسی وقفے میں جلدی سڑک پار کر کے دوسری طرف درختوں میں اتر گیا۔

میری تلاش میں برہان پور کی پولیس نے سڑک کی ناکہ بندی کر رکھی تھی۔ اگر آگے دو ایک لاریاں کھڑی نہ ہوتیں تو مجھے یہ مہلت نہیں مل سکتی تھی۔ ہماری لاری سیدھی پولیس والوں کے پاس جا کر کھڑی ہو جاتی اور میرا پکڑا جانا یقینی تھا۔ جس جگہ میں سڑک سے دوڑ کر اترا تھا وہاں درخت اتنے گھنے نہیں تھے لیکن جنگلی جھاڑ جھنکار نے بہت جلد مجھے اپنے اندر چھپا لیا۔ پھر بھی میں نے اپنی رفتار آہستہ نہ کی اور تیز تیز قدم اٹھاتا چلتا گیا۔ وہاں کوئی پگ ڈنڈی یا راستہ نہیں تھا۔ جھاڑیاں اور درختوں کی باہر نکلی ہوئی جڑیں اور گھاس ہی تھی۔ مجھے ان میں چلنے پھرنے کی عادت ہو گئی تھی۔

میں ان درختوں اور جھاڑیوں میں کافی دور نکل گیا تھا۔ راستے میں کئی ندی نالے آئے۔ یہ نیم پہاڑی ندی نالے تھے اور ان میں بڑے بڑے چھوٹے چھوٹے پتھر پڑے ہوئے تھے۔ میں نے ان پتھروں پر پاؤں رکھ کر ندی نالے پار کئے تھے۔ جیسے جیسے میں آگے جا رہا تھا جنگل زیادہ گھنا ہوتا جا رہا تھا۔ میں خطرے سے بہت دور نکل گیا تھا لیکن ایک ڈر یہاں بھی تھا کہ کہیں میں اس جنگل میں بھٹک نہ جاؤں۔ بس اندازے سے میں نے رخ شمال کی طرف کیا ہوا تھا۔ بلکہ شمال کی طرف چلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کیونکہ مجھے دلی کی طرف جانا تھا اور دلی شمال کی طرف ہی چل کر پہنچ سکتا تھا۔ مشکل یہ تھی کہ گھنے جنگل میں آدمی اپنی سمت برقرار نہیں رکھ سکتا۔ وہاں کوئی سڑک یا پگ ڈنڈی وغیرہ تو ہوتی نہیں۔ جنگل کے شروع میں تو اس قسم کی چھوٹی سڑک یا پگ ڈنڈی کہیں کہیں مل جاتی ہے مگر مدھیہ پردیش کے گھنے جنگلوں میں راستہ تلاش کرنا مشکل ہوتا ہے۔ جہاں کہیں آدی باسی یعنی جنگلی قبیلے کے لوگ رہتے ہوں وہاں کوئی پگ ڈنڈی ضرور نظر آجاتی ہے جو ان جنگلی لوگوں کے چلنے پھرنے سے بن گئی ہوئی ہے۔ ابھی تک مجھے ایسی کوئی پگ

ڈنڈی نظر نہیں آئی تھی۔

دوسرا خطرہ شیر چیتے اور ہاتھی وغیرہ کا بھی تھا۔ یہ ایسے درندے ہیں کہ ان جنگلوں میں کسی بھی جھاڑیوں سے نکل کر سامنے آجاتے ہیں۔ چنانچہ میں بے حد محتاط ہو کر چل رہا تھا اور اپنا رخ شمال کی طرف ہی رکھا ہوا تھا۔ کسی جگہ چٹانوں یا کسی ندی نالے یا کھڈ کی وجہ سے مجھے دائیں بائیں ہو جانا پڑتا تو میں آگے جا کر پھر شمال کی جانب رخ کر لیتا تھا۔ یہ سب کچھ اندازے ہی سے ہو رہا تھا۔ میرے پاس کوئی کمپاس تو تھا نہیں۔ بس دل میں خدا سے یہی دعا مانگتا کہ یا اللہ میں جنگل میں بھٹک نہ جاؤں۔ صحرا میں آدمی بھٹک جائے تو کم از کم ریت کے کسی ٹیلے پر چڑھ کر اور سورج کی مدد سے اپنی سمت ضرور معلوم کر سکتا ہے لیکن گھنے جنگلوں میں آپ درخت پر بھی چڑھ جائیں تو آگے سوائے درختوں کے کچھ نظر نہیں آتا۔ ویسے بھی درخت کی سب سے اوپر والی شاخ تک پہنچنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔

ایک جگہ تھوڑی سی کھلی جگہ آگئی۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ بادل ایک دوسرے میں گھل مل گئے تھے۔ سورج ان کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ ایک دھندلی سی سپیدی پھیلی ہوئی تھی۔ وقت کا کچھ اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ چلتے چلتے جب میں تھک گیا تو میں نے اندازہ لگا لیا کہ میں کافی دور آگیا ہوں اور وقت بھی کافی گزر چکا ہے۔ ہو سکتا ہے آدھا دن گزر گیا ہو۔ میں ایک جگہ بیٹھ گیا۔ جنگل میں سناٹا تھا۔ کسی کسی درخت پر سے ایک آدھ پرندے کے بولنے کی آواز آجاتی تھی۔ برسات کے سبزے اور دلدل کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر بیٹھا رہا۔ اس کے بعد دوبارہ چلنا شروع کر دیا۔ راستے میں جنگلی کیلوں کے درختوں کا جھنڈ نظر آیا۔ یہاں سے میں نے چھوٹے چھوٹے زرد رنگ کے کچھ کیلے توڑ کر کھائے۔ ایک چھوٹی سی ندی قریب ہی بہہ رہی تھی۔ وہاں پانی پی کر پیاس بجھائی اور ندی کے ساتھ شمال کی طرف چلنے لگا۔ آگے جا کر ندی مغرب کی طرف مڑ گئی۔ مجھے اس طرف نہیں جانا تھا۔ اس علاقے سے میں فرار ہو کر آیا تھا۔ چنانچہ میں نے ندی کے کنارے کو چھوڑ دیا اور سامنے کی سمت والے درختوں میں گھس گیا۔ یہاں ایک جگہ مجھے

عجیب سی بو محسوس ہوئی۔ چلتے چلتے میں اونچی اونچی نرکل کی جھاڑیوں کے قریب سے گزرا تو وہاں مجھے ادھ کھائے ہوئے ہرن کی لاش نظر آئی۔ میں نے فوراً رستہ تبدیل کر لیا اور جلدی جلدی وہاں سے دور ہٹنے لگا۔

یہاں ہرن کی لاش کسی شیر نے آدھی کھانے کے بعد چھپا دی ہوئی تھی اور کوئی پتہ نہیں تھا کہ وہ کس وقت یہاں آجائے۔ میں دور ہٹتا ہٹتا ایک ٹیلے کے پاس آگیا۔ اس ٹیلے نے شمال کی طرف جانے والا راستہ روک رکھا تھا۔ میں ٹیلے کی چڑھائی چڑھنے لگا۔ ٹیلہ زیادہ اونچا نہیں تھا۔ اس کی چوٹی پر بانس کے درختوں کے بڑے بڑے جھنڈ تھے۔ ان کے پیچھے دوسری طرف ٹیلے کی ڈھلان اترتی تھی۔ میں دوسری طرف اترا تو دیکھا کہ وہاں جھاڑیوں کے درمیان پتلی سی پگ ڈنڈی بنی ہوئی تھی جو ادھر کو ہی جاتی تھی جدھر میں جا رہا تھا۔ میں پگ ڈنڈی پر چلنے لگا۔ تھوڑی دور چلا ہوں گا کہ پیچھے سے کسی کے باتیں کرنے کی آواز آئی۔ میں جلدی سے ایک طرف ہٹ کر جھاڑیوں کے پیچھے چھپ گیا۔ میری نظریں پگ ڈنڈی پر تھیں۔ کوئی آدمی بات کر رہا تھا۔ آواز قریب آئی تو میں نے دیکھا کہ ایک بوڑھا آدمی چلا آرہا ہے جس نے کندھے پر چھوٹی سی گٹھڑی لٹکا رکھی ہے اس کے ساتھ ایک نوجوان عورت ہے۔ عورت نے ساڑھی پہنی ہوئی ہے۔ اس نے بھی بغل میں ایک گٹھڑی دبا رکھی ہے۔ جب وہ دونوں میرے قریب سے گزرے تو میں نے انہیں غور سے دیکھا۔ بوڑھے آدمی کی سفید ڈاڑھی مونچھیں اس علاقے کے مسلمانوں کی طرح تھیں۔ عورت نے بھی ماتھے پر تلک یا بندیا نہیں لگائی ہوئی تھی۔ دونوں یقیناً مسلمان تھے۔ میں نے انہیں آگے نکل جانے دیا۔ جب وہ دو چار قدم آگے نکل گئے تو میں بھی جھاڑیوں سے باہر آگیا یہ اس علاقے کے لوگ لگتے تھے اور جنگل میں میری راہ نمائی کر سکتے تھے۔ ان کے مسلمان ہونے سے بھی مجھے تسلی ہو گئی تھی۔ میں نے پیچھے سے آواز دی تو دونوں وہیں رکے اور مڑ کر میری طرف دیکھا۔ میں جلدی سے ان کے پاس آگیا اور بوڑھے کو السلام علیکم کہا۔ میں نے کہا۔

"میاں جی! میں جنگل میں راستہ بھول گیا ہوں۔ کیا آپ کو معلوم ہے آگے کون سا

شہر ہے؟"

بوڑھے نے نوجوان عورت کو اپنے پیچھے کر لیا تھا اور مجھے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا

بولا۔

"تم اس علاقے کے نہیں لگتے۔ اس جنگل میں کیسے آ گئے ہو؟"

میں نے یونہی ایک کہانی گھڑ کر سنا دی کہ ایک دوست کے ساتھ شکار کھیلنے آیا تھا
شیر نے حملہ کر دیا۔ میرا دوست دوسری طرف جان بچا کر بھاگ گیا۔ میں جان بچا کر اِ
طرف نکل آیا ہوں"۔

بوڑھے نے پوچھا۔

"تم کون سے شہر سے یہاں آئے تھے؟"

میں نے برہان پور شہر کا نام لے دیا کیونکہ پیچھے وہی شہر تھا۔ نوجوان عورت بوڑھے
کے پیچھے کس قدر سہمی ہوئی سی کھڑی تھی اور مجھے آنکھیں پھاڑ کر دیکھ رہی تھی۔ میں نے
فوراً کہا۔

"میاں جی! میں مسلمان ہوں - میرے ماں باپ پنجاب کے رہنے والے تھے۔
پنجاب سے بمبئی آکر آباد ہو گئے ان کا بمبئی میں سلائی مشینوں کا کاروبار تھا۔ وہ اس دنیا میں
نہیں رہے اب میں دکان پر بیٹھتا ہوں - ایک دوست کے ساتھ شکار کھیلنے یہاں چلا آیا اور
مصیبت میں پھنس گیا ہوں"

اپنے آپ کو پنجابی میں نے اس لئے بتا دیا تھا کہ میرا پنجابی لہجہ اردو بولتے وقت فوراً
ظاہر ہو جاتا تھا۔ بوڑھے نے کہا۔

"بیٹا آگے دریا پار بھنڈارا کا بڑا قصبہ ہے۔ وہاں سے تمہیں برہان پور جانے والی ریل
گاڑی مل جائے گی۔ ہمارے ساتھ آجاؤ۔ ہم ادھر ہی جا رہے ہیں - یہ میری بہو ہے۔ ہم
یہاں قریب ہی ایک گاؤں میں آئے تھے۔ اب واپس بھنڈارا جا رہے ہیں -"

میں ان کے ساتھ چل پڑا۔ میں نے سوچا کہ بھنڈارا قصبے کے ریلوے سٹیشن سے
اگر برہان پور کی طرف ٹرین جاتی ہے تو لازمی طور پر آگے دلی وغیرہ کی طرف بھی جاتی ہے

۔ میں وہاں سے کوئی نہ کوئی گاڑی پکڑ لوں گا۔ اتنی دور نکل آیا ہوں آگے پولیس کہاں
ری تلاش میں آئی ہو گی بوڑھے آدمی نے بتایا کہ اس کا بیٹا دیو لالی شہر میں کسی کارخانے
ملازم ہے۔ مہینے میں ایک بار گھر آتا ہے۔

"میں اپنی بہو کو اس کے ماں باپ سے ملانے لایا تھا۔ پیچھے ان کا گاؤں ہے۔"

ہم چھوٹی سی پگ ڈنڈی پر چلے جا رہے تھے۔ بوڑھا آگے آگے چل رہا تھا۔ پیچھے اس
بہو چل رہی تھی۔ اس کے پیچھے میں چلا آ رہا تھا۔ بوڑھے نے یہ بھی بتایا کہ وہ بھنڈارا
میں اپنے محلے کی مسجد کا امام ہے اور بچوں کو قرآن مجید پڑھاتا ہے۔ میں خاموشی سے
کی باتیں سنتا چلا جا رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔

"میاں جی! یہاں سے دریا کتنی دور ہے؟

وہ بولا۔

"زیادہ دور نہیں ہے بیٹا۔ وہاں گھاٹ ہے۔ ہمیں سواریوں والی کشتی مل جائے گی۔"

مجھے اطمینان ہو گیا تھا کہ اس جنگل سے نکلنے کا راستہ ہی نہیں ملا تھا بلکہ میں ایک
ے سٹیشن پر بھی پہنچ جاؤں گا۔ جہاں سے رات کے وقت دلی کی طرف جانے والی کوئی
ئی گاڑی پکڑنے کی کوشش کروں گا۔ پگ ڈنڈی اب جنگل کے ایسے علاقے میں داخل
ئی تھی جہاں اردگرد بڑے گنجان درخت تھے۔ میں اپنی سوچ میں گم پیچھے چلا جا رہا تھا
اچانک مجھے ایک مرد کی رعب دار آواز سنائی دی۔

"کھڑے ہو جاؤ یہیں"

میں نے سر اٹھا کر دیکھا کہ سامنے پگ ڈنڈی پر ایک بھاری جسم والا آدمی کھڑا تھا۔
کے ہاتھ میں چھرا تھا۔ اس کے دائیں جانب دو قدم پر ایک اور آدمی کھڑا تھا۔ اس
ہاتھ میں بھی چھرا تھا۔ انہوں نے ڈاٹھے باندھ رکھے تھے اور ان کے چہرے پورے
نہیں آتے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ ڈاکو یا ٹھگ لٹیرے ہیں - بوڑھا تو تھر تھر کانپنے لگا۔
ان لڑکی چیخ مار کر اپنے سسر سے لپٹ گئی۔ میں اپنی جگہ پر خاموش کھڑا ان دونوں
وں کی طرف دیکھنے لگا۔ دونوں ڈاکو آگے بڑھے۔ خاموش تماشائی بنے رہنے کا وقت

نہیں تھا۔ مجھے جو کچھ کرنا تھا آناً فاناً کر گزرنا تھا۔ کیونکہ اگر ان میں سے کوئی ڈاکو بوڑھے یا
اس کی بہو کو قابو کر لیتا تو پھر میرے لئے ان پر حملہ بھی کرنا اور ان کی قاتلانہ گرفت سے
لڑکی یا بوڑھے کو بچانا مشکل ہو سکتا تھا۔ جیسے ہی ڈاکو اس لڑکی اور بوڑھے کی طرف بڑھے
میں دوڑ کر ان کے سامنے آگیا اور ایسی اداکاری کرنے لگا جیسے میں بھی ان سے خوف زدہ
ہوں ۔ میں نے کہا۔

"بھائیو ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ ہمیں جانے دو۔"

جو ڈاکو بھاری بدن والا تھا اس نے کہا۔

"ہمیں تمہارے مال کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم تو اس لڑکی کو ساتھ لے جانے کے
لئے آئے ہیں ۔ کیوں بے راموں میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟"

دوسرے ڈاکو نے ہنس کر کہا۔

"ہاں مکھو دادا تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔"

مکھو ڈاکو کے ہاتھ میں جو چھرا تھا وہ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ وہ مجھ سے بمشکل تین چار
فٹ کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ میرے پیچھے بوڑھا اپنی بہو کو ساتھ لگا کر زمین پر بیٹھ گیا تھا۔ ڈاکو
نے مجھے گالی دے کر کہا۔

"ایک طرف ہٹ جاؤ نہیں تو مارے جاؤ گے۔ بابو۔"

اس نے مجھے ایک طرف دھکا دیا اور نیچے جھکا کہ بوڑھے کے ساتھ چمٹی ہوئی نوجوان
لڑکی کو بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لے۔ لڑکی اونچی آواز میں رونے لگی۔ بوڑھا اس
ڈاکو کی منتیں کرنے لگا۔ جیسے ہی ڈاکو نیچے جھکا میں نے اس کا چھرے والا ہاتھ پکڑ کر زور
سے نیچے کو جھٹکا دیا۔ یہ کسی اناڑی آدمی کا اٹیک نہیں تھا ایک تربیت یافتہ کمانڈو کا اٹیک
تھا۔ ڈاکو سنبھل نہ سکا۔ وہ منہ کے بل گر پڑا۔ میں نے پوری طاقت سے ٹھڈا اس کے
منہ پر مارا وہ الٹا ہو گیا چھرا اس کے ہاتھ سے گر پڑا۔ اتنے میں دوسرے ڈاکو نے مجھ پر
حملہ کر دیا۔ اگر وہ دور سے مجھ پر چھرا نشانہ لگا کر پھینکتا تو میں زخمی ہو سکتا تھا مگر اس نے
ایسا نہ کیا۔ اپنے ساتھی ڈاکو کو بچانے کے لئے وہ دوڑ کر مجھ پر حملہ آور ہوا۔ جیسے ہی وہ

ے قریب آیا تو میں نے اس کے چھرے کا وار بچاتے ہوئے اس کے چھرے والے
و کو پکڑ کر اس کی ٹانگوں میں لات ماری۔ یہ بڑا خطرناک داؤ ہوتا ہے۔ اگر لات ٹھیک
ؤں کے درمیان پڑ جائے اور لات بھی کسی مارشل آرٹ کے ماہر یا کمانڈو کی ہو تو آدمی
ہرا ہو جاتا ہے۔ اتنی شدید درد ہوتی ہے کہ آدمی سب کچھ بھول جاتا ہے۔ دوسرا ڈاکو
ہیں دہرا ہو گیا۔ اس دوران پہلے والا ڈاکو اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس کا ڈھاٹا کھل گیا تھا۔ چھرا
ر پڑا تھا۔ وہ مجھ سے جسمانی اعتبار سے زیادہ موٹا اور بھاری بدن کا تھا۔ وہ گالی دیتا ہوا
ضبناک ہو کر میری طرف بڑھا اور اس نے میری گردن دونوں ہاتھوں سے دبوچ لینے کی
وشش کی مگر میں بجلی کی تیزی سے ایک طرف ہو گیا اور وہیں سے بجلی ایسی تیزی کے
اتھ میرے بازو نے اس کی گردن کو اپنے فولادی شکنجے میں جکڑ لیا۔ میں نے اس کو دو
ٹکے دیئے۔ کیونکہ اس کی گردن موٹی تھی مجھے شک تھا کہ ایک جھٹکے میں اس کی گردن
ہیں ٹوٹے گی۔ دوسرے جھٹکے کے ساتھ ہی اس کا جسم ڈھلک گیا۔ دوسرا ڈاکو اپنا پیٹ
کڑے وہیں بیٹھا ہائے ہائے کر رہا تھا اور یہ منظر بھی دیکھ رہا تھا۔ جب اس نے اپنے
اتھی کا انجام دیکھا تو ہاتھ جوڑ کر وہیں بیٹھے بیٹھے بولا۔

"دادا رحم کرو۔ مجھے نہ مارنا۔"

مگر میں اسے زندہ نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ مجھ پر اس وقت کوئی بھوت سوار ہو گیا تھا۔
ی خیال دماغ میں سما گیا تھا کہ اگر اسے زندہ چھوڑا تو یہ کسی دوسری مسلمان عورت کو
غوا کر لے گا اور اس کی عزت برباد کر دے گا۔ میں نے اسے بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور کہا۔

"فکر نہ کرو۔ روتے کیوں ہو۔ میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔"

اس کے ساتھ ہی میں نے اس کی گردن اپنے بازو کے شکنجے میں جکڑی اور دوسرے
ٹے وہ بھی بے جان ہو کر نیچے گر پڑا۔ یہ سارا خونی ڈرامہ بوڑھا اور اس کی بہو پگ ڈنڈی
بیٹھے سہمی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ جب میں نے دونوں ڈاکوؤں کا کام تمام کر
ا تو بوڑھے نے اٹھ کر مجھے گلے لگا لیا۔ اس سے خوف اور خوشی کے مارے بات نہیں ہو
ہی تھی۔ اس کی بہو گٹھڑی سینے سے لگائے حیرت کے عالم میں مجھے اور ڈاکوؤں کی لاشوں

کو تک رہی تھی۔ میں نے بوڑھے سے کہا۔

"میاں جی! یہاں سے نکل چلو۔ ہو سکتا ہے ان ڈاکوؤں کے ساتھی کہیں قریب ہی ہوں۔"

میں نے لڑکی سے کہا۔

"بہن تم بھی چلو۔ چلو شاباش!"

ان دونوں کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ ان کے چہرے بتا رہے تھے کہ میں نے وہاں جو کام کر دکھایا تھا اس کی انہیں مجھ سے ہرگز توقع نہیں تھی۔ لڑکی اور بوڑھے کو میں نے آگے کر دیا تھا اور خود ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگا تھا کہ وہاں ڈاکوؤں کا کوئی ساتھی کسی طرف سے نکل کر حملہ نہ کر دے۔ ہم جلدی جلدی چلتے درختوں کے جھنڈوں سے نکل آئے۔ سامنے مجھے دریا نظر آنے لگا۔ ہم گھاٹ پر آ گئے۔ ایک بہت بڑی کشتی گھاٹ کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ اس میں کچھ دیہاتی لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے گھاٹ والے کو دو دو روپے فی کس کرایہ ادا کیا اور بوڑھے اور اس کی بہو کو لے کر کشتی میں سوار ہو گیا۔

بوڑھا سخت ڈرا ہوا تھا۔ ہم کشتی کے پچھلے سرے کے پاس بیٹھے تھے۔ بوڑھے نے آہستہ سے کہا۔

"بیٹا! دو آدمی قتل ہو گئے ہیں پولیس کو پتہ چل جائے گا۔"

میں نے کہا۔

"میاں جی! وہ آدمی نہیں تھے۔ ڈاکو تھے۔ آپ کی بہو کی عزت لوٹنے آئے تھے انہیں جہنم میں پہنچا کر میں نے بالکل ٹھیک کیا ہے۔ کسی کو پتہ نہیں چلے گا۔ ان جنگلوں میں ڈاکو لوگ ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے اور قتل ہوتے ہی رہتے ہیں۔ آپ بے فکر رہیں۔"

بوڑھا خاموش ہو کر بیٹھا رہا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ تھوڑی دیر میں کشتی دریا روانہ ہوئی۔ دریا کا پاٹ زیادہ چوڑا اگر نہیں تھا تو اتنا مختصر بھی نہیں تھا۔ دوسرے

کنارے کے درخت وغیرہ پہلے تو صاف نظر آرہے تھے کشتی دریا کے وسط میں پہنچی تو دوسرا کنارا صاف دکھائی دینے لگا۔ میں نے یونہی دریا کے دوسرے کنارے کی طرف نگاہ ڈالی تو میری آنکھیں وہیں ساکت ہو گئیں۔ مجھے دوسرے کنارے کے گھاٹ پر پولیس کی وردیوں والے کچھ آدمی نظر آئے۔ کشتی کو دو ملاح لمبے لمبے بانسوں کی مدد سے کنارے کی طرف کھینچ رہے تھے۔ کشتی تھوڑی اور قریب گئی تو مجھے درختوں کے نیچے پولیس کی دو گاڑیاں کھڑی دکھائی دیں۔ اس علاقے کی پولیس کی وردیوں اور ان کی گاڑیوں کو میں بڑی اچھی طرح سے پہچانتا تھا۔ پولیس کے سپاہی کافی تعداد میں تھے۔ ان کے پاس بندوقیں بھی تھیں اور وہ سب کشتی کے گھاٹ پر لگنے کا انتظار کر رہے تھے۔ میں یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا کہ وہ میرے انتظار میں وہاں کھڑے ہیں یا کسی دوسرے مفرور مجرم کو پکڑنے کے لئے وہاں آئے ہیں۔ کشتی لحہ بہ لحہ کنارے کے قریب ہو رہی تھی۔ اب کشتی میں بیٹھے ہوئے مسافر بھی پولیس والوں کو ضرور دکھائی دے رہے تھے۔ کشتی کو قریب آتا دیکھ کر وہ دریا کے کنارے پر پھیل گئے۔ میں نے انہیں پوزیشنیں لیتے دیکھا تو اللہ کا نام لیا اور دریا میں چھلانگ لگا دی۔

مجھے نہیں معلوم کہ مجھے اس طرح اچانک دریا میں چھلانگ لگاتے دیکھ کر بوڑھے میاں جی اور ان کی بہو اور دوسرے مسافروں نے میرے بارے میں کیا سوچا ہو گا اور ان کے چہروں پر کیسی حیرت طاری ہو گئی ہو گی۔ مجھے دریا میں چھلانگ لگاتے گھاٹ پر موجود پولیس نے بھی دیکھ لیا تھا۔ اس کا ثبوت مجھے فائرنگ کے دھماکوں سے ملا جو دریا میں چھلانگ لگانے کے فوراً بعد مجھے سنائی دینے لگے۔ میں جتنی تیز تیر سکتا تھا دریا کے بہاؤ کی طرف تیرنے لگا۔ کچھ گولیاں چیختی ہوئی میرے آگے پیچھے اور دائیں جانب پانی میں گریں۔ میں نے ڈبکی لگا لی اور پانی کے اندر ہی اندر بازو اور ٹانگیں چلاتا دریا کے بہاؤ کے ساتھ آگے نکلتا چلا گیا۔ پانی کے اندر آدمی زیادہ تیزی سے نہیں تیر سکتا۔ پانی کے اندر اس پر پانی کا دباؤ بھی ہوتا ہے۔ لیکن میری مجبوری تھی۔ پانی کی سطح پر میں پولیس والوں کے لئے کھلا ٹارگٹ تھا۔ پانی کے نیچے پھر بھی میرا بچاؤ ہو سکتا تھا۔ میں نے صرف اتنا کیا کہ

دوسرے کنارے کی طرف اپنے آپ کو دھکیلنے لگا۔ مجھے صرف تخ تخ کی آواز ہی پانی کے اندر آرہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد یہ آواز بھی بند ہو گئی۔

میں دشمن کی فائرنگ سے محفوظ ہو چکا تھا۔

مجھے پانی کے اندر غوطہ لگا کر دیر تک رہنے کی بڑی پریکٹس تھی اور میں کافی دیر تک سانس روک سکتا تھا۔ اس پریکٹس نے مجھے بڑا فائدہ دیا اور میں نے جہاں سانس لینے کے لئے سر دریا کی سطح سے باہر نکالا تو دوسرا کنارا بہت قریب آچکا تھا۔ یہاں تک پہنچنے میں دریا کے اندر پانی کے بہاؤ نے بھی میری بڑی مدد کی تھی۔ میں تیرتے ہوئے کنارے پر اگے ہوئے اونچے سرکنڈوں کی اوٹ میں ہو گیا اور جب میرے پاؤں زمین کو لگنے لگے تو لمبے ڈگ بھرتا دریا سے نکل کر کنارے پر آکر بیٹھ گیا۔

میں نے ابھی سانس ہی لیا تھا کہ میری نگاہ دریا کے پاٹ کی طرف گئی۔ دوسرے کنارے پر سے وہی کشتی میری طرف بڑھ رہی تھی۔ اس میں پولیس کی وردیوں والے سپاہی کھڑے تھے اور کشتی کو دو ملاحوں کی بجائے چار ملاح لمبے لمبے بانسوں کی مدد سے چلا رہے تھے۔ جس کی وجہ سے کشتی بڑی تیزی سے کنارے پر اس طرف بڑھ رہی تھی جہاں میں سرکنڈوں کی اوٹ میں بیٹھا تھا۔ میں فوراً اٹھا اور میں نے درختوں کی طرف دوڑنا شروع کر دیا۔ پولیس نے مجھے دوڑتے ہوئے دیکھ لیتا تھا۔ مجھ پر پیچھے رائفلوں کے فائر آنے لگے۔ فائرنگ کے دھماکے ہو رہے تھے۔ اور یہ دھماکے میری طرف بڑھ رہے تھے۔ میں رکے بغیر دوڑتا گیا اور اسی جنگل میں دوبارہ داخل ہو گیا جہاں سے نکل کر میں نے دریا پار کرنے کی کوشش کی تھی۔

میرا رخ اب شمال کی بجائے مشرق کی طرف تھا۔ شمال کی طرف سے پولیس میرے پیچھے لگی تھی۔ پولیس کی پارٹی اسی طرف آرہی تھی جس طرف میں دوڑ رہا تھا۔ کیونکہ فائرنگ کی آواز میرے بالکل عقب سے آرہی تھی۔ یہ میں ایک نئی مصیبت میں پھنس گیا تھا۔ یہ حقیقت تھی کہ جنگل میں زیادہ دور تک دوڑ نہیں سکتا تھا۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ پولیس کی نفری یعنی سپاہی زیادہ تھے۔ وہ جنگل میں دونوں پہلوؤں کی طرف سے مجھے

ھیرے میں لے سکتے تھے۔ جنگل میں چھپنے کی جگہ جھاڑیاں اور درخت ہی ہو سکتے تھے مگر پولیس کی یہاں نظر پڑ سکتی تھی اور ایک بار پولیس کی نظر پڑ جانے کے بعد میں وہاں سے اگ نہیں سکتا تھا۔ اس لئے میں کسی جھاڑی کے پیچھے یا درخت کے اوپر چھپنے کا خطرہ ول نہیں لے رہا تھا۔ دوسری مشکل یہ پیش آگئی کہ جنگل کا گھنا پن یہاں آکر ختم ہو گیا ا اور جھاڑیوں اور خشک اور چھوٹی چھوٹی گھاس والی اونچی نیچی زمین شروع ہو گئی تھی۔ رختوں کے جھنڈ کہیں کہیں نظر آرہے تھے۔ یہ میری موت تھی۔

میں درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف دوڑنے لگا۔ جگہ کھلی تھی۔ مجھے پیچھے سے دیکھا ا سکتا تھا اور مجھ پر فائر بھی ہو سکتا تھا۔ لیکن شاید پولیس ابھی وہاں نہیں پہنچی تھی۔ جیسے ں میں درختوں کے جھنڈ میں گھسا پیچھے سے فائر کے تین دھماکے ہوئے۔ ان دھماکوں نے ادیا کہ پولیس بھی گھنے جنگل سے نکل آئی ہے۔ میں درختوں میں آکر چھپنے کی جگہ تلاش لرنے لگا۔ کیونکہ ان درختوں کے آگے بھی کھلی زمین تھی اور دور تک چلی گئی تھی۔ اگر ں وہاں دوڑتا ہوں تو پولیس کو صاف نظر آسکتا تھا۔ کیونکہ ابھی دن کی روشنی کافی تھی۔ رخت ایسے تھے کہ ان کے تنے اوپر تک بغیر ٹہنیوں کے چلے گئے تھے۔ کافی اوپر جاکر ناخیں ایک دوسری میں پیوست ہو گئی تھیں درختوں کے ستون ایسے تنوں پر میں چڑھ یں سکتا تھا۔ یکے بعد دیگرے دو فائر ہوئے۔ یہ رائفلوں کے فائر تھے۔ یقین کریں ایک ر تو میں بھی گبھرا گیا۔ جلدی سے ادھر ادھر دیکھا کہ کہیں کوئی چھپنے کی جگہ مل جائے۔ رختوں کے نیچے ایک طرف مجھے اینٹوں کا ڈھیر نظر پڑا۔ میں دوڑ کر اس کے پاس گیا۔ یہ ینٹوں کا ڈھیر نہیں تھا۔ ایک چھوٹا سا چبوترہ تھا جس کی بہت سی اینٹیں اکھڑ چکی تھیں۔ بوترے کے اوپر لکڑی کی ایک صلیب نصب تھی جو ایک طرف کو جھک گئی تھی۔ بوترے کی دوسری طرف اونچی گھاس نے چبوترے کی دیوا رکو چھپا رکھا تھا۔ میں نے بلدی میں یہی فیصلہ کیا کہ اب جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ اس گھاس کی دیوار کے پیچھے چھپ جانا چاہئے۔ میں جلدی سے گھاس کی دیوار کے پیچھے گھس گیا۔ جیسے ہی میں دیوار کے پیچھے گھسا میں لڑھکتا ہوا نیچے ایک گڑھے میں گر گیا۔

یہ ایک اندھا گڑھا تھا۔ اوپر گھاس کی دیوار اتنی گھنی تھی کہ اندر دن کی روشنی بھی
نہیں آتی تھی۔ قسمت اچھی تھی۔ یا یوں کہہ لیں کہ اس وقت قسمت میرا ساتھ دے
رہی تھی اور مجھے عین موقع پر چھپنے کے لئے یہ گڑھا مل گیا۔ بلکہ قسمت نے مجھے اس
گڑھے میں دھکیل دیا جو باہر سے مجھے کبھی نظر نہیں آسکتا تھا۔ اور جس پر پولیس کی اس
وقت تک نظر نہیں پڑسکتی تھی جب تک کہ کوئی گھاس کی دیوار کو ہٹا کر نہ دیکھے۔ گھاس
کی یہ دیوار چبوترے کی دوسری طرف تھی اور کسی کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہیں
آسکتی تھی کہ اس کے پیچھے ایک گڑھا ہے جہاں میں چھپ کر بیٹھا ہوا ہوں۔

میں گڑھے میں دبک کر بیٹھ گیا۔ میرے کان باہر لگے ہوئے تھے۔ رائفلوں کا فائر اب
رک گیا تھا۔ تھوڑی دیر گزری ہوگی مجھے لوگوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ یہ پولیس
کے سپاہی تھے۔ ان میں ایک افسر بھی تھا جو کہہ رہا تھا۔

"وہ کہیں دور نہیں گیا۔ یہیں کہیں چھپا ہوا ہوگا۔ اچھی طرح سے دیکھو۔"

آدمیوں کی آوازیں بتا رہی تھیں کہ سات آٹھ پولیس کے سپاہی ہیں۔ وہ وہیں
درختوں کے جھنڈ میں آکر رک گئے تھے۔ ان کے ادھر سے ادھر دوڑتے قدموں کی آواز
بھی آرہی تھی۔ کسی نے کہا۔

"سر وہ کسی درخت میں چھپا ہوا نہ ہو۔"

اسی افسر کی آوز آئی۔

"گوپی چند عقل سے کام لو۔ دیکھتے نہیں درخت بالکل سیدھے ہیں ان پر تو کوئی بندر
بھی مشکل سے چڑھے گا۔ جھاڑیوں میں دیکھو۔"

بس یوں سمجھ لیں کہ میں ایک طرح سے سانس روکے بیٹھا تھا۔ باہر کی ایک ایک
آہٹ ایک ایک آواز پر میرے کان لگے ہوئے تھے۔ یہی ڈر تھا کہ کہیں کوئی سپاہی گھاس
کی دیوار کو ہٹا کر نہ دیکھ لے۔ یہ لوگ کچھ دیر تک درختوں کے جھنڈ میں مجھے تلاش
کرتے رہے جب انہیں میں نہ ملا تو اسی افسر کی آواز آئی۔

"بھاگ کر آخر کہاں جائے گا۔ اراوتی ضلع کی پولیس نے جنگل کو دوسری طرف سے

ے میں لے لیا ہے۔ پولیس افسر کو قتل کر کے بھاگا ہے یہ پاکستانی جاسوس۔ ہمیں ہر
ں میں اسے پکڑنا ہے۔ چلو آگے چلو۔ وہ اس جگہ نہیں ہے۔"

سپاہیوں کے بھاری جوتوں کی اور ان کی آپس میں باتیں کرنے کی آوازیں آہستہ
نہ دور ہوتی گئیں۔ جب یہ آوازیں ختم ہوگئیں تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ لیکن
باہر نہیں نکل رہا تھا۔ اس بات کا خدشہ تھا کہ پولیس افسر اپنے کسی خفیہ آدمی کو وہاں
نہ چھوڑ گیا ہو۔ مجھے اندھیرے گڑھے میں بیٹھے بیٹھے کافی دیر ہوگئی تو میں نے گڑھے
شگاف کے آگے آئی ہوئی گھاس کو ذرا سا ہٹا کر باہر دیکھا۔ اس طرف کوئی سپاہی نہیں
میں دبے پاؤں اپنے آپ کو سمیٹ کر باہر آگیا۔ میں نے سر اٹھا کر چبوترے کی
ری طرف دیکھا۔ وہاں بھی مجھے کوئی آدمی نظر نہ آیا۔ میں چبوترے کے پاس ہی بیٹھ
۔ دوسری طرف جو کھلی جگہ تھی وہاں سے پولیس کے سپاہی گزر کر آگے جو گھنا جنگل
ں جنگل میں داخل ہو چکے تھے۔ مجھے اس طرف نہیں جانا تھا جدھر پولیس گئی تھی۔
چھ دیر وہاں بیٹھا رہا کہ پولیس جنگل میں کافی آگے نکل جائے تو میں چلوں۔ میں اٹھا۔
نے اپنا رخ شمال کی طرف کیا اور درختوں کے اونچے اونچے تنوں کی آڑ لیتا چلنے لگا۔
ی صاحب کے ساتھ دریا پار کرتے ہوئے میرے ذہن میں راستے کا تعین ہو چکا تھا۔
دریا کی طرف واپس جانا تھا تاکہ کسی گھاٹ پر سے دریا پار کروں اور آگے اس ریلوے
پر پہنچوں جو برہان پور سے آگے دلی کی طرف جاتی تھی۔

دن گزرتا جا رہا تھا۔ میں رات ہونے سے پہلے پہلے دریا پار کر جانا چاہتا تھا۔ خواہ مجھے
رہی دریا پر کیوں نہ کرنا پڑے۔ مجھے بھوک اور پیاس بھی محسوس ہو رہی تھی۔ مگر
علاقے سے میں گزر رہا تھا۔ وہاں نہ کوئی ناریل کا درخت تھا نہ کیلے کے جنگلی درخت
تھے۔ جنوبی ہند کے جنگلوں میں یہ درخت عام مل جاتے ہیں مگر میں مدھیہ پردیش کے
امیں سے گزر رہا تھا۔ یہاں تاڑ کے درخت تو ضرور تھے مگر ناریل کے درخت کہیں
ا بھی دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ مجھے بھوک اور پیاس برداشت کرنے کی عادت
ا اس لئے چلا جا رہا تھا۔ کوئی ایک گھنٹے کے بعد دریا آگیا۔ یہاں دریا کا پاٹ کافی چوڑا

نظر آرہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر میں دریا کے ساتھ ساتھ چلتا گیا تو کوئی نہ کوئی گھا
ضرور آئے گا جہاں سے میں کشتی کے ذریعے دریا پار کرسکوں گا۔ اور اگر رات ہونے
اور گھاٹ نہ آیا تو میں دریا کو تیر کر پار کرلوں گا۔ مجھے اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ دریا آہ
آہستہ اس طرف کا رخ اختیار کر رہا ہے جس طرف جنگل میں پولیس گئی تھی۔ کافی آ
جا کر دریا کے کنارے دلدل شروع ہو گئی۔

میں دلدل سے اپنے آپ کو بچاتا بائیں جانب ہوتا گیا۔ خدا جانے یہاں اتنی دلد
کیوں تھی اور کہاں سے آگئی تھی۔ یہ دریا کے ڈیلٹے کا علاقہ بھی نہیں تھا۔ اس طرح
دریا سے دور ہونے لگا۔ یہ میں نہیں چاہتا تھا۔ مجھے ہر حالت میں دریا کے ساتھ ساتھ
تھا۔ ایک جگہ رک کر میں نے دریا پر ایک نظر ڈالی۔ دریا کے دوسرے کنارے پر درخت
کے جھنڈ چھوٹے چھوٹے دکھائی دے رہے تھے۔ میں دوبارہ چلنے لگا۔ آگے ایک جگہ د
سے نہر نکل کر جنگل کی طرف جا رہی تھی۔ اور نہر کا پاٹ بھی وہاں کافی چوڑا تھا اور پا
بہاؤ بھی کافی تیز تھا۔ میرے لئے اس کے سوائے کوئی راستہ نہیں تھا کہ نہر کے ساتھ سا
چلوں اور کسی جگہ سے نہر پار کر کے دوبارہ دریا کے قریب آجاؤ۔ خطرناک بات یہ تھی
نہر کا رخ اسی جنگل کی طرف تھا جہاں پولیس میری تلاش میں گئی تھی۔ یہاں دو چار ہر
نہر میں پانی پیتے نظر آئے۔ میں قریب گیا تو وہ بدک کر بھاگ گئے۔ نہر کا پانی بڑا تیز تھ
دریا کے بہاؤ سے بھی زیادہ تیز محسوس ہو رہا تھا۔ اس بات کا امکان تھا کہ پانی مجھے بہا
خطرے والے علاقے میں نہیں لے جائے۔ میں چل بھی رہا تھا اور ماحول کا جائزہ بھی
رہا تھا کہ کس جگہ سے نہر پار کروں۔ وہاں کوئی پل وغیرہ بھی نہیں تھا۔ کچھ فاصلے پر ایک
پہاڑی تھی۔ میں اس کے قریب گیا تو وہاں سے نہر دوسری طرف گھوم جاتی تھی۔ یہا
پانی کی رفتار اور زیادہ تیز ہو گئی تھی۔ میں پہاڑی کے عقب میں آگیا۔ یہاں نیچے مجھے ایک
خشک نالہ نظر آیا جو پہاڑی کے پہلو میں نہر کے نیچے کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ ہو
سکتا ہے یہ نالہ نہر کے نیچے سے دوسری طرف نکل جاتا ہو۔ میں خشک نالے میں اتر گیا
نالے کے دونوں طرف اونچی ڈھلان تھی۔ نالے میں پتھر ہی پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ م

اس میں چلنا شروع کر دیا۔ نالہ نہر کے نیچے سے گزرتا محسوس ہوتا تھا۔ آگے جا کر
لے نے ایک سرنگ کی شکل اختیار کرلی۔ میرا خیال تھا کہ نہر کا پاٹ زیادہ چوڑا نہیں
ہے۔ یہ سرنگ دوسری طرف نکل جائے گی مگر سرنگ آگے جا کر اس طرف کو گھوم گئی
ں طرف میں اپنا رخ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن یہ میری مجبوری تھی۔ میں سرنگ میں چلتا
ا۔ سرنگ میں پیچھے دن کی روشنی آرہی تھی۔ یہ سرنگ پہاڑی کے ساتھ ساتھ دوسری
ف جاتی تھی۔ میں نے سوچا کہ چلو نہر کے نیچے سے تو گزر آیا ہوں اب آگے جا کر باہر
آؤں گا۔ آخر یہ سرنگ کہاں تک جائے گی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ سرنگ پہاڑی
نیچے ایک اور سرنگ سے جا کر مل جاتی تھی جو قدرتی سرنگ تھی۔ یہ مجھے اس وقت
لوم ہوا جب میں نے چھت کی طرف دیکھا تو وہاں بڑے بڑے پتھروں کی نوکیں نیچے کو
ہوئی تھیں۔ دل میں خیال آیا کہ یہیں سے واپس چلا جاتا ہوں۔ پھر سوچا کہ اتنی دور
یا ہوں۔ آخر یہ سرنگ کسی نہ کسی جگہ ضرور نکلے گی۔ میں آگے بڑھتا گیا۔ سرنگ کبھی
یں طرف گھوم جاتی۔ کبھی دائیں طرف مڑ جاتی۔ اندھیرا بھی ہو گیا تھا۔ میں دیوار کو پکڑ
آگے بڑھ رہا تھا۔ میری چھٹی حس ایسے موقعوں پر مجھے ضرور خبردار کر دیا کرتی تھی۔
وقت بھی میری چھٹی حس نے بیدار ہو کر مجھے آگے جانے سے روکا۔ مگر میں نے اس
ف دھیان نہ دیا۔ آخر سرنگ میں آگے روشنی نظر آئی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ
نگ کی مصیبت ختم ہو رہی ہے۔

مجھے معلوم نہیں تھا کہ اصل مصیبت اب شروع ہونے والی ہے۔

میں روشنی کی طرف بڑھنے لگا۔ یہ سرنگ کے دوسرے طرف والے دہانے کی
ئی تھی۔ وہاں جا کر سرنگ ختم ہو جاتی تھی۔ میں سرنگ سے باہر نکل آیا۔ سرنگ سے
نکلتے ہی میں نے اپنا رخ بائیں جانب شمال مشرق کی طرف کر لیا۔ بادل اسی طرح
ئے ہوئے تھے۔ دن کی روشنی پھیکی پھیکی تھی۔ سامنے درخت ہی درخت تھے۔ کسی
ا درخت پر کسی پرندے کے بولنے کی آواز آرہی تھی۔ آگے اونچی زمین آگئی۔ میں
ا پر چڑھ کر دوسری طرف اتر گیا۔ دوسری طرف درختوں کے کٹے ہوئے تنوں اور

لکڑیوں کے جگہ جگہ ڈھیر لگے تھے۔ ایک پگ ڈنڈی ان درختوں کے درمیان ہو کر جا رہی تھی۔ میں اس پر چل پڑا۔ کٹے ہوئے درختوں کے ڈھیر اس بات کی علامت تھے کہ یہاں قریب ہی جنگل کی کٹائی ہو رہی ہے اور وہاں مزدور لوگ موجود ہوں گے۔ میں ان سے بچ کر آگے نکل جانا چاہتا تھا۔

کٹائی کے ذخیرے سے باہر نکلتے ہی میں نے ایک آدمی کو دیکھا جو درخت کے پاس بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا اور لگتا تھا کہ وہ پہلے سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور میرے قریب آکر کہنے لگا۔

"بابو! اس طرف مت جانا۔ جنگل میں ایک آدم خور شیرنی کہیں سے آگئی ہوئی ہے۔ میں اسی لئے یہاں بیٹھا ہوں کہ اس طرف سے کوئی گزرے تو اسے آگے جانے سے روک لوں"

اس آدمی کا لباس اور لب ولہجہ اس علاقے کے دیہاتیوں والا نہیں تھا۔ میں نے بڑے اعتماد سے پوچھا۔

"تم کون ہو؟"

اس نے کہا۔

"میں ٹھیکیدار کا آدمی ہوں۔ ٹھیکیدار نے ہی مجھے یہاں بٹھایا ہے۔ کل کٹائی کا کام شروع ہونے والا ہے۔ مزدور لوگ شہر سے آرہے ہیں۔ تم یہاں کیسے آگئے ہو؟"

میں نے یونہی کہہ دیا۔

"میں اپنے شکاری دوست کے پیچھے یہاں آیا ہوں۔ وہ مجھ سے بچھڑ گیا ہے۔"

وہ آدمی بولا۔

"تمہیں آگے نہیں جانا چاہیے۔ آگے آدم خور شیرنی کا خطرہ ہے۔ میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں جنگل کا دوسرا راستہ دکھاتا ہوں"

میں نے سوچا ہو سکتا ہے یہ آدمی ٹھیک کہہ رہا ہو۔ میں اس کے پیچھے چل پڑا۔ وہ مجھے دوسری طرف لے گیا۔ ادھر بڑے گنجان درخت تھے۔ کہنے لگا۔

"ان درختوں کے پیچھے تمہیں کچی سڑک ملے گی وہ تمہیں گھاٹ پر پہنچا دے گی"

میں بڑے اطمینان کے ساتھ اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ ہم گنجان درختوں میں آگئے۔ مجھے درختوں کی دوسری طرف کچھ آدمیوں کے بولنے کی آوازیں سنائی دیں۔ میں نے یہی خیال کیا کہ درختوں کی کٹائی کرنے والے آدمی ہوں گے۔ جیسے ہی میں اس آدمی کے ساتھ درختوں سے نکل کر کھلی جگہ پر آیا تو میرے بدن میں ایک سرد لہر سی دوڑ گئی اور ایک لمحے کے لئے میں دم بخود ہو کر رہ گیا۔ میرے سامنے پولیس کی گاڑی کھڑی تھی اور دس بارہ پولیس کے سپاہی رائفلیں لئے زمین پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اس آدمی نے آتے ہی کہا۔

"انسپکٹر صاحب اسے میں یہاں تک تو لے آیا ہوں۔ اب تم دیکھ لو کہ یہ وہی آدمی ہے یا کوئی اور ہے۔"

میں اس قدر حیرت زدہ ہو گیا تھا کہ بھاگنے کا خیال آیا بھی لیکن زمین نے جیسے میرے پاؤں جکڑ لئے تھے۔ جب بھاگنے لگا تو اس وقت تک دیر ہو چکی تھی۔ اور پولیس کے سپاہیوں نے مجھے پکڑ لیا تھا۔ دو کانسٹیبلوں نے اپنی رائفلیں میری طرف سیدھی کر لی تھیں ان میں ایک پولیس انسپکٹر بھی تھا۔ اس نے بھی پستول نکال لیا تھا۔ وہ دوڑ کر میرے پاس آیا مجھے گھور کر دیکھتے ہوئے بولا۔

"ملکی رام تم نے بڑا کام کیا ہے۔ یہ وہی پاکستانی جاسوس ہے جو ہمارے آفیسر کو قتل کر کے بھاگا تھا۔ مجھے اس کی تصویر دکھائی گئی تھی۔ اسے زمین پر لٹا دو۔ یہ بڑا خطرناک کمانڈو ہے"

مجھے پہلے ہی سے چار سپاہیوں نے اس طرح بازوؤں میں جکڑ رکھا تھا کہ میں نے اپنے بازو نہیں ہلا سکتا تھا۔ انہوں نے مجھے منہ کے بل زمین پر گرا دیا اور اسی وقت میرے ہاتھ پیچھے کر کے مجھے ہتھکڑی لگا دی۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی ہو گیا کہ مجھے سنبھلنے کا موقع نہ مل سکا۔ دراصل اس کی خاص وجہ میرا حیرت زدہ ہونا تھا۔ جب میں مٹی کا اونچا بند اتر کر نیچے آیا تھا تو میرے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ میرے سامنے مسلح پولیس کی بھاری

تعداد موجود ہو گی۔ جو آدمی مجھے میرا راہ نما بن کر مجھے وہاں تک لایا تھا وہ پولیس ہی کا
آدمی تھا اور اسے پیچھے اس لئے بٹھایا ہوا تھا کہ وہ آتے جاتے آدمیوں پر نگاہ رکھے اور
کوئی قمیض پتلون والا کھلتی رنگت والا نوجوان وہاں سے گزرے تو اسے اپنے ساتھ پولیس
کے پاس لے آئے۔ میں اچانک اپنے سامنے پولیس کی پوری گارڈ کو دیکھ کر حیرت زدہ ہو
کر رہ گیا تھا۔ اور پولیس کو مجھے قابو کرنے کا موقع مل گیا تھا۔

ایسا میرے ساتھ پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

اب میرے ساتھ ایسا ہو گیا تھا اور میں پھنس گیا تھا۔ کچھ مجھے نہر کے نیچے سے
گزرنے والے خشک نالے کی سرنگ نے مروا دیا تھا۔ اس میں گزرتے ہوئے میں جنگل
کے جنوب کی جانب پولیس پارٹی کے قریب آگیا تھا۔ پولیس سارا جنگل چھاننے کے بعد
وہاں بیٹھی آرام کر رہی تھی کہ شکار خود بخود ان کے جال میں آکر پھنس گیا۔ پولیس نے
مجھے پکڑ کر گاڑی میں ڈالا جو درختوں کے پیچھے ایک جگہ کھڑی تھی اور مجھے لے کر کسی
نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو گئی۔

جس گاڑی میں مجھے ٹھونسا گیا تھا اس کی صرف سامنے اور پیچھے والی کھڑکی ہی کھلی
تھی۔ ان میں بھی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ یہ قیدی لے جانے والی گاڑی تھی۔ پولیس
مجھے گرفتار کرنے کا سارا بندوبست کر کے آئی تھی۔ مجھے اتنا یاد ہے کہ پولیس کی گاڑی
ایک دریا کے پل پر سے گزری تھی۔ یہ وہی دریا تھا جس کو میں پار کرنے والا تھا مگر میری
قسمت میں ایسا کرنا نہیں لکھا تھا۔ اب میں نے اپنے انجام پر پچھتانا اور افسوس کرنا چھوڑ
دیا تھا اور اپنے آپ کو پولیس ٹارچر اور پولیس کی قید سے فرار ہونے کے لئے تیار کرنا
شروع کر دیا تھا۔ اتنا میں جانتا تھا کہ یہ لوگ مجھے نہ تو گولی ماریں گے نہ پھانسی پر لٹکائیں
گے۔ کم از کم اس وقت تک مجھے ہلاک نہیں کیا جائے گا اور زندہ رکھا جائے گا جب تک
کہ میں ان کی خواہش کے مطابق انہیں اپنے ساتھی کشمیری حریت پسندوں اور کشمیری
کمانڈوز کے بارے میں نہیں بتا دیتا کہ وہ بھارت میں کہاں کہاں چھپے ہوئے ہیں اور جو میں
انہیں کبھی نہیں بتا سکتا تھا۔ مجھے جسمانی اذیتیں انہوں نے بہت دی تھیں اور اب بھی

ے والے تھے لیکن یہ امر باعث اطمینان تھا کہ میں موقع ملنے پر فرار ہونے کے لئے
ہ رہوں گا۔ اگر انہیں مجھے مارنا ہوتا تو اب تک مار چکے ہوتے مگر انہیں میری
دست سرگرمیوں اور ہیبت ناک کمانڈو ایکشن سے معلوم ہو چکا تھا کہ میں کوئی معمولی
نڈو نہیں ہوں بلکہ وہ تو مجھے پاکستانی جاسوس اور پاکستانی کمانڈو سمجھ رہے تھے اور ہر
ت میں میرے ساتھیوں کے بارے میں مجھ سے معلومات حاصل کرنا چاہتے تھے۔

دریا کے پار جاتے ہی میری آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھ دی گئی۔ اب مجھے کچھ نظر نہیں
تھا۔ پولیس کی گاڑی کافی دیر تک چلتی رہی۔ سیدھی سڑک پر سے بھی گزری اور
وں کے موڑ بھی کاٹے۔ ٹریفک کی آوازوں سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ ہم کسی شہر
آگئے ہیں۔ یہ شہر برہان پور ہی ہو سکتا تھا۔ کیونکہ یہی ایک شہر اس جنگل کے قریب
ع تھا۔ گاڑی ایک جگہ گھومی اور پھر رک گئی۔ میری آنکھوں پر پٹی بندھی تھی۔
ازوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ کسی دفتر کا احاطہ ہے۔ مجھے گاڑی سے اتار کر چلاتے
ئے ایک کمرے میں لے جا کر بٹھا دیا گیا۔ یہاں میری پٹی کھول دی۔ پولیس سٹیشن کا
ہ لگتا ہے دو پولیس آفیسر میرے سامنے بیٹھ گئے۔ میری ہتھکڑی کھول دی گئی۔ اب مجھ
پوچھ گچھ شروع ہو گئی۔ ان کی گفتگو سے مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ میرے بارے میں
ب کچھ جانتے ہیں اور انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ میں پیچھے ایک پولیس انسپکٹر کو قتل کر
فرار ہوا تھا۔

سوال وہی تھے کہ میں اپنے ساتھیوں کا بتاؤں کہ وہ بھارت میں کہاں کہاں روپوش
۔ ان کے خفیہ اڈے کہاں کہاں پر ہیں۔ میں نے چپ سادھ لی۔ وہاں سے مجھے
رے کمرے میں لے جایا گیا۔ یہاں مجھ پر ٹارچر شروع ہو گیا۔ میں زیادہ تفصیل میں
ں جاؤں گا۔ اب تک آپ بھی جان گئے ہوں گے کہ بھارت میں جب کوئی کمانڈو یا
ت پسند مجاہد پکڑا جاتا ہے تو اس کو کس کس طرح اذیتیں دی جاتی ہیں۔ اکثر مجاہد ان
وں کی وجہ سے شہید ہو جاتے ہیں مگر کچھ نہیں بتاتے۔ میں سخت جان تھا۔ اور مجھے
یں برداشت کرنے کی تربیت بھی ملی ہوئی تھی۔ میں ہر قسم کا ٹارچر برداشت کرتا رہا اور

زبان نہ کھولی۔ وہ برہان پور شہر ہی تھا۔ وہاں سے مجھے پولیس کی قیدیوں والی بند گاڑی میں بٹھا کر میری آنکھوں پر پٹی باندھ کر دوسرے شہر لے جایا گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ شمال کی جانب نرسنگ پور شہر تھا۔ یہاں خفیہ پولیس کا ایک بدنام زمانہ ٹارچر سیل تھا۔ مجھے اسی سیل میں تین دن تک طرح طرح کی وحشیانہ اذیتیں دی گئیں۔ مجھے نیم بے ہوشی کے انجکشن بھی لگائے گئے لیکن میں نے اپنے ساتھی حریت پسندوں اور بھارت کے مختلف شہروں میں وطن کی آزادی کے لئے زیر زمین کام کرنے والے کشمیری مجاہدوں کے بارے میں ایک لفظ بھی نہ بتایا۔

اگر آپ بھارت کا نقشہ دیکھیں تو آپ کو وہاں کے صوبہ مدھیہ پردیش کے شمال مشرق میں نرسنگ پور لکھا ہوا نظر آئے گا۔ یہ شہر بھارت کے وسطی علاقے میں واقع ہے۔ اس کے تھوڑا اوپر کی طرف جبل پور کا شہر ہے۔ یہ تفصیل میں آپ کو اس لئے بتا رہا ہوں تاکہ آپ کو پتہ چل جائے کہ میں بھارت کے کس حصے میں تھا جہاں سے مجھے واپس مقبوضہ کشمیر جانا تھا۔ پولیس نے انٹیروگیشن کے دوران مجھ سے میری نقدی اور زہریلی بال پوائنٹ پنسل بھی چھین لی تھی۔ اب میں بالکل نہتا ہو گیا تھا۔ وحشیانہ جسمانی اذیتیں سہہ کر میری جسمانی حالت بہت کمزور ہو گئی تھی۔ جب پولیس کو یقین ہو گیا کہ میں مر جاؤں گا مگر انہیں اپنے حریت پسند ساتھیوں کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا تو مجھے ایک چھوٹی سی کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا۔

یہ بالکل پھانسی کی کوٹھڑی کی طرح تھی۔ نہ کوئی روشندان تھا نہ اندر روشنی تھی۔ لوہے کی سلاخوں والا دروازہ تھا جہاں ایک مسلح سپاہی پہرہ دے رہا تھا۔ تین دن میں اس پھانسی کی کوٹھڑی میں قید میں پڑا رہا۔ اس دوران مجھے بالکل ٹارچر نہ کیا گیا۔ میں سمجھ گیا کہ خفیہ پولیس اور ملٹری انٹیلی جنیس کے درمیان میرے بارے میں کسی آخری فیصلے کے سلسلے میں گفت وشنید ہو رہی ہے۔ آخر انہوں نے میرے بارے میں فیصلہ کر لیا۔ چوتھے دن پولیس کمشنر دو تین پولیس افسروں کے ساتھ میری کوٹھڑی میں آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک فائل تھی۔ میں ٹاٹ پر سر جھکائے بیٹھا تھا۔ مجھ پر سخت نقاہت طاری تھی۔ پولیس

شنر نے اپنا تعارف کروایا اور کہا۔

"میں اس علاقے کا پولیس کمشنر ہوں۔ پولیس اور ملٹری انٹیلی جنیس نے تمہارے ے میں جو فیصلہ کیا ہے میں اس فیصلے سے تمہیں آگاہ کرنے آیا ہوں۔ لیکن فیصلہ نے سے پہلے میں تمہیں ایک بار پھر کہوں گا کہ اگر تم اپنے ساتھی کمانڈوز کے خفیہ کانوں کے بارے میں ہمیں صحیح بتا دو کہ وہ کہاں ہیں۔ انڈیا کے کس کس شہر میں یہ ک کام کر رہے ہیں تو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تم جہاں کہو گے میں خود پولیس کی ظت میں تمہیں وہاں پہنچا دوں گا اور یہ بھی یقین دلاتا ہوں کہ تمہارا نام کسی پر بھی ظاہر ں کیا جائے گا۔"

اتنا کہہ کر پولیس کمشنر جو نوجوان سا آدمی تھا اور اسی علاقے کا رہنے والا لگتا تھا چپ گیا اور میری طرف دیکھنے لگا۔ میرا دل جواب دینے کو نہیں چاہتا تھا۔ واقعی مجھ پر سخت زوری طاری تھی مگر اسے جواب دینا ضروری تھا۔ میں نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

"میں اپنے کسی ایک ساتھی کا بھی نام اور خفیہ ٹھکانہ آپ کو نہیں بتاؤں گا۔ آپ جو ہے میرے ساتھ سلوک کریں۔"

پولیس کمشنر نے ایک بار پھر مجھ سے پہلے والا سوال کیا۔ میں نے انکار کر دیا۔ تب ں نے فائل کھولی اور صرف اتنا لکھا ہوا پڑھا۔

"تمہیں موت کی سزا دی جاتی ہے۔"

فائل بند کی اور اپنے ساتھی پولیس افسروں کے ساتھ کوٹھڑی سے نکل گیا۔ اسی ت مجھے ہتھکڑی لگا دی گئی۔

پہلے میں یہی سمجھا کہ یہ بھی ایک ڈرامہ کیا جا رہا ہے اور اس کا مقصد محض یہی ہے ہ میں موت کے ڈر سے ہتھیار ڈال دوں گا۔ لیکن جب کافی دیر تک میری کوٹھڑی میں ئی نہ آیا۔ اور اس کے بعد تین پولیس کے سپاہی آکر مجھے ہتھکڑی سمیت باہر لے گئے تو سمجھ گیا کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔ میری آنکھوں پر پٹی بھی نہیں باندھی گئی تھی۔ رات کا

وقت تھا۔ یہ معلوم نہیں تھا کہ رات کتنی گزر چکی ہے۔ مجھے قیدیوں والی گاڑی میں چا
سپاہیوں کے درمیان بٹھا دیا گیا۔ ہتھکڑی میرے ہاتھ پیچھے کر کے لگائی گئی تھی۔ پولیس ک
مسلح گارڈ میرے اردگرد بیٹھی تھی۔ میں پوری طرح سے ہل جل بھی نہیں سکتا تھا۔
گاڑی کسی طرف روانہ ہو گئی۔

قیدیوں والی گاڑی چاروں طرف سے بند تھی۔

چھت کے پاس دو چار سلاخیں لگی تھیں جن میں سے شہر کی روشنیوں کی ایک جھلک نظر آجاتی تھی۔ سڑکوں پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ رات کافی گزر چکی ہے۔ کبھی مجھے خیال آتا کہ یہ مجھے کسی دوسرے شہر کے ٹارچر سیل میں مجھ پر وحشیانہ اذیت کا کوئی نیا طریقہ آزمانے کے لئے لے جا رہے ہیں۔ کبھی خیال آتا کہ یہ مجھے مارنے کے لئے لے جا رہے ہیں اور جنگل میں کسی جگہ مجھے شوٹ کر کے میری لاش کسی گڑھے میں دبا دیں گے یا جنگلی درندوں کے کھانے کے لئے وہیں چھوڑ دیں گے۔

گاڑی شہر سے باہر نکل گئی تھی۔ شہر کی عمارتوں اور سڑک کنارے کی روشنیوں کی جو جھلک کبھی کبھی نظر آجاتی تھی اب غائب ہو گئی تھی۔ گاڑی ناہموار راستے پر چل رہی تھی۔ جب گاڑی کو سفر کرتے گھنٹہ سوا گھنٹہ گزر گیا تو مجھے یقین ہو گیا کہ یہ لوگ مزید انٹیروگیشن اور مجھ پر ٹارچر کا کوئی جدید طریقہ آزمانے کے لئے مجھے کسی دوسرے شہر لے جا رہے ہیں۔ کیونکہ اگر انہیں مجھے مارنا ہوتا تو راستے میں کسی بھی جگہ مجھے گولی مار سکتے تھے۔ مجھے زندگی کی تھوڑی سی امید ہو گئی اور میں فرار کے طریقوں پر غور کرنے لگا۔ پولیس کی مسلح گارڈ نے ویگن کے اندر مجھے اس طرح اپنے گھیراؤ میں لے رکھا تھا کہ وہاں فرار کی کوشش ناممکن تھی۔ میں نے یہی فیصلہ کیا کہ دوسرے شہر کے ٹارچر سیل پہنچنے کے بعد فرار ہونے کی کوشش کروں گا۔

گاڑی کی سپیڈ ہلکی ہونے لگی۔

پھر ایک جگہ گاڑی رک گئی۔ مجھے نیچے اتار گیا۔ میں نے دیکھا کہ آسمان پر بادل غائب ہو چکے ہیں۔ ایک طرف سے چاند نکل آیا ہے اور اس کی روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔ یہ جنگل کا علاقہ تھا۔ اردگرد بہت درخت تھے۔ پولیس کی اور کوئی گاڑی ساتھ نہیں آئی تھی۔ پولیس کی نفری سات آٹھ سپاہیوں کی تھی۔ سارے مسلح تھے اور سب کے پاس رائفلیں تھیں۔ میں سمجھ گیا کہ میرا آخری وقت آن پہنچا ہے۔ میں نے دل میں اللہ سے اپنے گناہوں کی معافیاں مانگنی شروع کر دیں۔ ایک لمحے کے لئے یہ خیال بھی آیا کہ شاید ماضی کے زمانے سے سوسن میری مدد کو وہاں پہنچ جائے۔ لیکن ایسی امید بہت کم تھی۔ سپاہی مجھے کھینچتے ہوئے ایک طرف کو چل پڑے۔ دو سپاہیوں نے مجھے پکڑ رکھا تھا۔ دو سپاہی رائفلیں اٹھائے آگے آگے چل رہے تھے۔ چار سپاہی رائفلیں تانے میرے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ میرا خیال تھا کہ یہ لوگ ابھی کسی درخت کے ساتھ باندھ کر مجھے شوٹ کر دیں۔ شاید وہ کسی کھلی جگہ کی تلاش میں تھے۔ چاندنی اتنی زیادہ تھی کہ ایک ایک درخت صاف صاف نظر آ رہا تھا۔ شاید یہ چاند کی چودھویں یا پندرھویں تاریخ تھی۔

چلتے چلتے آگے ایک اونچی جگہ آ گئی۔ ایسے لگتا تھا جیسے بند باندھا ہوا ہے۔ مجھے کھینچتے ہوئے بند کے اوپر چڑھایا گیا تو میں نے دیکھا کہ وہ ریلوے لائن تھی۔ میں ابھی سنبھل ہی رہا تھا کہ میرے پیچھے جو سپاہی تھے انہوں نے مجھے دھکا دے کر ریل کی پٹڑی پر گرایا اور میری دونوں ٹانگوں کے گرد رسی لپیٹ کر باندھ دی۔

ساری بات میری سمجھ میں آ گئی تھی۔ میں نے اپنے جسم کی بچی کھچی طاقت کو جمع کیا اور زور سے اچھل کر سامنے والے سپاہی کو ٹکر ماری۔ وہ گر پڑا۔ اس کے ساتھ ہی میں بھی گر پڑا۔ ایک تو میرے ہاتھ ہتھکڑی میں پیچھے جکڑے ہوئے تھے۔ دوسرے میرے پاؤں بھی باندھ دیئے گئے تھے۔ چھ سات سپاہی مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ انہوں نے مجھے ریلوے لائن پر گرا دیا تھا۔ میں نے ان کی گرفت سے نکلنے کی سر توڑ کوشش کی مگر تارچر سہہ کر میرے بدن کی آدھی طاقت ختم ہو چکی تھی۔ اوپر سے چھ سات آدمیوں نے مجھے جکڑ رکھا تھا۔ میں بے بس ہو گیا۔ انہوں نے مجھے ریلوے لائن کے ساتھ باندھ دیا۔ ریل کی پٹڑی

کے ساتھ ایک طرف میرے دونوں پاؤں جکڑ دیئے اور دوسری طرف میرا سر ریل کی پٹڑی پر رکھ کر میری گردن رسی سے لائن کے ساتھ اس طرح باندھ دی کہ گردن ہلاتے ہوئے میرا سانس رکنے لگتا تھا۔ مجھے ریلوے لائن کے ساتھ باندھ کر سپاہی ریل کی پٹڑی سے نیچے اتر گئے۔ میرا سر ریلوے لائن پر تھا اور میں انہیں دیکھ رہا تھا۔ چاندنی میں وہ مجھے درختوں میں اس جگہ واپس جاتے نظر آئے جہاں پولیس کی گاڑی کھڑی تھی۔ اس کے بعد وہ میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے اور چاروں طرف خاموشی چھا گئی۔

میری موت بظاہر یقینی تھی۔

اب خدا ہی میری زندگی بچا سکتا تھا۔ پولیس نے مجھے ہلاک کرنے کے لئے بڑا بھیانک طریقہ اختیار کیا تھا۔ کسی نہ کسی جانب سے ریل گاڑی آئے گی اور میرے جسم کے پرخچے اڑاتی ہوئی گزر جائے گی اور سارا کھیل ختم ہو جائے گا۔ پولیس کی گاڑی کے سٹارٹ ہونے کی آواز نہیں آئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ پولیس گارڈ وہیں درختوں میں بیٹھی میری موت کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ اس بات کی تصدیق کرنے کے بعد وہاں سے جانا چاہتی تھی کہ ٹرین نے میرے جسم کے ٹکڑے اڑا دیئے ہیں اور میں مر چکا ہوں۔ میں بیان نہیں کر سکتا تھا کہ اس وقت میرے ذہن کی کیا حالت تھی۔ بس دماغ کے پردے پر فلم چلنے لگی تھی۔ بچپن کے جوانی کے تمام سین سامنے آ رہے تھے۔ دوسروں کے ساتھ کی ہوئی اچھائیوں اور برائیوں دونوں کے مناظر آنکھوں کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ میں نے کلمہ طیبہ پڑھنا شروع کر دیا تھا اور اللہ تعالیٰ سے اپنی بخشش کی دعائیں مانگ رہا تھا۔ ابھی تک کسی طرف سے ریلوے انجن کی سیٹی کی یا اس کی چھک چھک کی دور سے آتی آواز سنائی نہیں دی تھی۔ یہ آواز اب میرے واسطے موت کی آواز بن گئی تھی۔

آسمان پر کہیں کہیں تارے ٹمٹما رہے تھے۔ ایک طرف پورا چاند نکلا ہوا تھا۔ گہری خاموشی طاری تھی۔ میں نے ایک دو بار اپنے پاؤں رسی میں سے چھڑانے کی کوشش کی مگر میرے پاؤں پولیس نے اس طرح ریل کی پٹڑی سے باندھے ہوئے تھے کہ میں صرف اپنے پاؤں کے پنجے ہی ہلا سکتا تھا۔ یہی حال میری گردن کا تھا۔ رسی میری گردن میں ڈال

کر ریل کی پٹڑی کے ساتھ تین چار بل دے کر اتنی کس کر باندھی گئی تھی کہ دائیں بائیں گردن ہلانے سے مجھے اپنا سانس رکتا محسوس ہوتا تھا۔ میرے دونوں ہاتھ کمر کے پیچھے ہتھکڑی میں جکڑے ہوئے تھے اور ہتھکڑی میری کمر میں بری طرح چبھ رہی تھی۔ میں چھوٹے چھوٹے سانس لینے پر مجبور تھا۔ کبھی آسمان کو دیکھتا اور کبھی آنکھیں بند کر لیتا۔

اتنے میں مجھے ایک آواز سنائی دی۔

یہ آواز ریل گاڑی کی آواز نہیں تھی۔ یہ گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز تھی۔ یہ آواز میری بائیں جانب سے آ رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ کچھ گھوڑے ہلکی رفتار سے چلتے ریلوے لائن کی پگ ڈنڈی پر میری طرف بڑھ رہے ہیں۔ میں نے بڑی مشکل سے گردن بائیں طرف موڑ کر دیکھا۔ چاندنی رات میں مجھے کچھ گھوڑ سواروں کے ہیولے دکھائی دیئے جو گھوڑوں پر سوار اوپر نیچے ہوتے چلے آ رہے تھے۔ یہ گھوڑ سوار ذرا قریب آئے تو معلوم ہوا کہ گھوڑ سواروں کا پورا ایک گروہ ہے۔ سب سے آگے آگے جو گھوڑ سوار چلا آ رہا تھا اس نے کھلی ہوئی چاندنی میں مجھے دیکھا تو گھوڑے کو فوراً روکا اور اونچی آواز میں کہا۔

"لکھو دادا! ادھر آ کر دیکھو یہ کیا معاملہ ہے۔"

ایک گھوڑ سوار گھوڑا دوڑاتا آگے آیا اور ریلوے لائن پر جہاں میں بندھا ہوا تھا وہاں آ کر رک گیا۔ اس نے تھوڑا آگے کو جھک کر میری طرف دیکھا اور رعب سے پوچھا۔

"کیوں بے کون ہے تو؟"

میں نے اسے خدائی مدد سمجھا اور کہا۔

"دادا! مجھے پولیس گاڑی تلے کچل کر مارنا چاہتی ہے۔ مجھے پولیس نے باندھا ہے۔"

"ابے پولیس تو یہاں کہیں نہیں دکھائی دیتی"

ان لوگوں کی چال ڈھال اور لب و لہجے سے میں سمجھ گیا تھا کہ یہ ڈاکوؤں کا گروہ ہے اور ڈاکو لوگ پولیس کے جانی دشمن ہوتے ہیں۔ میں نے فوراً کہا۔

"دادا! پولیس وہاں درختوں کے نیچے بیٹھی میری موت کا انتظار کر رہی ہے۔"

یہ لکھو دادا ڈاکوؤں کے اس گروہ کا سردار تھا۔ اس نے پولیس کو گالی دے کر بندوق سنبھالی اور جن درختوں کی طرف میں نے بتایا تھا اس طرف منہ کر کے اندھا دھند دو فائر کر دیئے۔ وہاں پولیس موجود تھی۔ اس طرف سے بھی رائفل کا فائر آنے لگا۔ لکھو دادا کے دوسرے ڈاکو گھوڑوں سے چھلانگیں لگا کر نیچے اتر پڑے اور لائن کے پاس بیٹھ کر جدھر سے پولیس کا فائر آ رہا تھا اس طرف گولیاں چلانے لگے۔ میں نے کہا۔

"دادا! بھگوان کے لئے مجھے کھولو۔ گاڑی آ گئی تو میں مارا جاؤں گا۔"

لکھو دادا میرے قریب ہی زمین پر اوندھا لیٹا درختوں کی طرف فائر کر رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"ابے چھلیا۔ اس سسرے کو کھول دے"

ڈاکو ریل کی پٹڑی کے ساتھ لیٹے درختوں کی طرف فائرنگ بھی کر رہے تھے اور ایک دوسرے سے ہنس ہنس کر باتیں بھی کر رہے تھے۔ ایک ڈاکو بالکل میری گردن کے قریب ریلوے لائن کو آڑ بنائے' بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ میرے سر کو آڑ بنائے بندوق چلاتے مسلسل دھماکے کر رہا تھا۔ اس نے فوراً بندوق ایک طرف رکھی اور میری رسیاں کھولنے لگا۔ جب میری رسیاں کھل گئیں اور میں اٹھ بیٹھا تو وہ میری ہتھکڑی دیکھ کر بولا۔

"دادا!! اس کو ہتھکڑی بھی لگی ہے۔ کھول دوں یا رہنے دوں؟"

ان کا سردار جس کو یہ لکھو دادا کہہ کر مخاطب کر رہے تھے۔ ذرا آگے ریل کی پٹڑی کے پاس لیٹا گولیاں چلا رہا تھا۔ فائرنگ کے دھماکوں میں اس نے چلا کر کہا۔ ہتھکڑی رہنے دے بے چھلیا ابھی"

اس ڈاکو نے جس کا نام چھلیا تھا اور جس نے میری رسیاں کھولی تھیں مجھے بازو سے پکڑ کر وہیں لائن کے قریب اپنے پاس کھینچ کر بٹھا لیا اور بولا۔

"یہاں بیٹھ جا بے۔ نہیں تو مارا جائے گا"

میں وہیں دبک کر بیٹھ گیا۔ دونوں طرف سے گولیاں چل رہی تھیں۔ پولیس کے آٹھ سپاہی جو مجھے ریلوے لائن پر باندھنے کے بعد خود درختوں کے جھنڈ میں بیٹھ کر ٹرین کے

نیچے میرے نکلنے جانے کا انتظار کر رہے تھے ڈاکوؤں کی فائرنگ کا جواب فائرنگ سے دے
رہے تھے مگر ڈاکوؤں کی تعداد کافی تھی جبکہ پولیس کے سپاہی محدود میگزین ساتھ لائے
تھے۔ بہت جلد ان کی جانب سے فائرنگ سست پڑ گئی۔ ڈاکوؤں کی طرف سے مسلسل
فائرنگ ہو رہی تھی۔ پولیس کی طرف سے اکا دکا فائر آ رہا تھا۔ صاف لگ رہا تھا کہ پولیس
کے پاس اسلحہ ختم ہو رہا ہے۔

اس علاقے میں اکثر ڈاکوؤں کے گروہ لوٹ مار میں مصروف رہتے تھے۔ ان ڈاکوؤں
کا پولیس سے مقابلہ بھی ہوتا رہتا تھا۔ پولیس ان ڈاکوؤں سے گبھراتی تھی۔ پھولن دیوی،
بھوپت ڈاکو اور سلطانہ ڈاکوؤں کا نام آپ نے بھی ضرور سنا ہو گا۔ ان مشہور زمانہ بلکہ
بدنام زمانہ ڈاکوؤں کا تعلق بھی انہی جنگلوں سے کچھ نہ کچھ ضرور رہا تھا۔ اگرچہ بھوپت ڈاکو
وہاں سے کچھ فاصلے پر مغرب کی جانب کوہ ست پڑا کی پہاڑیوں اور ضلع گجرات کاٹھیاواڑ
کے علاقے میں زیادہ سرگرم کار رہا تھا۔ مدھیہ پردیش کے گھنے اور دشوار گزار جنگل
ڈاکوؤں کو اپنے اندر چھپا لیتے تھے اور پولیس ان کی تلاش میں ان جنگلوں میں جاتے
ہوئے گبھرایا کرتی تھی۔ تجربہ کار ڈاکو گھات لگا کر پولیس پر حملہ کرتے اور انہیں بھون کر
رکھ دیتے تھے۔ چنانچہ جب لکھو ڈاکو نے فائرنگ رکوا کر اونچی آواز میں پولیس کو للکارا۔

"ابے کیوں چند روپلی کے لئے لکھو کے ہاتھوں جان گنوا رہے ہو بھاگ جاؤ سسرو۔
میں تمہارا پیچھا نہیں کروں گا۔"

تو پولیس کی طرف سے فائرنگ رک گئی۔ اس کے ساتھ ہی گاڑی کے اسٹارٹ
ہونے کی آواز سنائی دی۔ لکھو ڈاکو نے ہنس کر اپنے ساتھیوں سے کہا۔

"اب ان سالوں کا پیچھا نہ کرنا۔ سسروں کو نکل جانے دو۔"

میں چھلیا ڈاکو کے پاس نیچے ہو کر بیٹھا تھا۔ میرے ہاتھ پشت پر اسی طرح ہتھکڑی میں
جکڑے ہوئے تھے۔ میں اگر چاہتا اور یہ بات ضروری ہوتی تو میں وہاں سے بھاگ سکتا تھا۔
صرف ریلوے لائن کے پیچھے جھاڑیوں میں چھلانگ لگانے کی ہی ضرورت تھی مگر میں ان
ڈاکوؤں کے درمیان آکر بہت خوش ہوا تھا۔ ڈاکوؤں کا مجھے پہلے بھی دو ایک بار تجربہ ہو چکا

ھا۔ ایک تو یہ لوگ دل کے بہت اچھے ہوتے تھے دوسرے ان کے ساتھ رہ کر میں پولیس
ے محفوظ رہ سکتا تھا اور اس دوران مناسب موقع دیکھ کر میں دلی کی طرف نکل سکتا تھا۔

جب گاڑی کے انجن کی آواز ذرا دور چلی گئی تو ڈاکو اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے
گھوڑے ایسے سدھائے ہوئے تھے کہ جیسے ہی فائرنگ کرتے ہوئے ڈاکو گھوڑوں سے اتر
کر ریل کی پٹڑی کے ساتھ لیٹے گھوڑے بھی ادھر ادھر جھاڑیوں درختوں میں چلے گئے۔
ب فائرنگ رک گئی تو ڈاکوؤں نے منہ سے سیٹیاں بجا کر گھوڑوں کو واپس بلا لیا۔

ان کا سردار لکھو دادا یا لکھو ڈاکو ہاتھ میں بندوق لئے میرے پاس آکر بولا۔

"کیوں بے! کون ہے تو؟"

ڈاکوؤں کا سردار مجھے پورے چاند کی روشنی میں سامنے کھڑا صاف نظر آ رہا تھا۔ اس
ا شہد کی مکھیوں کی چھتے ایسی گھنی اور چہرے کے ساتھ چمٹی ہوئی ڈاڑھی مونچھیں تھیں۔
ر پر بھاری پگڑ بندھا ہوا تھا۔ کاندھے کے ساتھ میگزین کی بیلٹ لٹک رہی تھی۔ واسکٹ
رنگ پاجامہ پہن رکھا تھا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ چھلیا ڈاکو نے مجھے بازو سے پکڑا ہوا تھا۔
نے کہا۔

"دادا! میرا نام بھیکم داس ہے میں پنجاب کا رہنے والا ہوں۔ وہاں چھوٹی موٹی
ریاں کیا کرتا تھا۔ ایک بار پکڑا گیا۔ مجھے قید ہو گئی۔ جیل توڑ کر بھاگا اور بھوساول برہان
ر کی طرف آ گیا یہاں ایک چور میرے ساتھ مل گیا۔ ہم ایک سال تک ڈکیتیاں کرتے
ے۔ تین دن پہلے ہم نے شہر کے ایک بینک میں ڈاکہ ڈالا تو پولیس آ گئی۔ ہم نے مقابلہ
ا مگر ہمارا اسلحہ ختم ہو گیا۔ میرا ساتھی بھاگ گیا۔ میں پکڑا گیا۔ پولیس نے مجھے بڑا مارا۔
نے پولیس انسپکٹر کو گالی دی تو اس نے مجھے ٹھڈوں سے مار مار کر میرا برا حال کر دیا۔"

لکھو ڈاکو نے قہقہہ لگا کر کہا۔

"ارے تو نے پولیس انسپکٹر کو گالی دی تھی؟"

میں نے کہا۔

"ہاں دادا!"

"کیا پنجابی میں گالی دی تھی؟"

میں نے کہا۔

"ہاں دادا"

"وہ بڑا خوش ہوا۔ بولا۔

"ارے بھیکم داس ہمیں وہ پنجابی کی گالی سناؤ۔ پنجابی کی گالیاں ہمیں بہت اچھی لگ ہیں۔ بولا۔ کون سی گالی دی تھی تم نے پولیس انسپکٹر کو؟"

میں نے پولیس انسپکٹر کا فرضی نام لے کر اسے پنجابی کی ایک بڑی اعلیٰ درجے کی گا دی۔ لکھو ڈاکو کے ساتھ سبھی ڈاکو قہقہے لگا کر ہنسنے لگے۔

"ارے پھر کیا ہوا رے؟"

میں نے کہا۔

"پولیس انسپکٹر نے گالی سن کر حکم دیا کہ اسے لے جاؤ اور ریلوے لائن کے ساتھ باندھ کر اس کے جسم کے ٹکڑے اڑا دو۔ جب تک گاڑی اسے کچل کر گزر نہ جائے وہا سے مت ہلنا۔ بس دادا! پولیس مجھے پکڑ کر یہاں لے آئی۔ انہوں نے مجھے ہتھکڑی لگا رکھ تھی۔ پھر یہاں ریل کی پٹڑی کے ساتھ باندھ دیا اور خود درختوں کے نیچے میری موت کا تماشہ دیکھنے کے لئے بیٹھ گئے۔ دادا! بھگوان کی کرپا ہوئی کہ تم آ گئے۔ نہیں تو آج میری موت آ گئی تھی۔"

لکھو ڈاکو نے چھلیا ڈاکو کو حکم دیا۔

"ابے چھلیا رے۔ چابی لگا کر بھیکم کی ہتھکڑی کھول دے۔ آج سے یہ ہمارے ساتھ رہے گا۔"

ان لوگوں کے پاس پولیس ہتھکڑی کی چابیوں کا موجود ہونا کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ اس قسم کی چابیوں کی ان ڈاکوؤں کو کسی بھی وقت ضرورت پڑ سکتی تھی۔ چھلیا نے اپنی واسکٹ کی جیب میں سے ایک چابی نکال کر لگائی اور میری ہتھکڑی کھول کر پھینک دی۔ لکھو ڈاکو نے بندوق والا ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے اپنے ڈاکو ساتھیوں سے کہا۔

"چلو اب اپنے کام پر چلتے ہیں۔"

پھر اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"چل بھیکم داس! تو بھی چھلیا کے ساتھ گھوڑی پر بیٹھ جا۔"

چھلیا نے مجھے اپنی گھوڑی کے پیچھے اپنے ساتھ بٹھا لیا اور یہ سارے ڈاکو جن کی دس بارہ سے کم نہیں ہو گی ریل کی پٹڑی کے ساتھ گھوڑے دوڑاتے ایک طرف پڑے۔ اتنے میں پیچھے سے ریل گاڑی کی آواز سنائی دی۔ گاڑی کے انجن نے سیٹی ڈاکو ریل کی پٹڑی سے اتر کر نیچے جھاڑیوں میں گھوڑے دوڑانے لگے۔

میں چھلیا ڈاکو کے پیچھے گھوڑی پر بیٹھا تھا۔ میں نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔ ٹرین انجن کی روشنی قریب آ رہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں ریل گاڑی شور مچاتی زمین کو ہوئی آگے کو گزر گئی۔ میرے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ یہ وہ ریل گاڑی تھی کہ ڈاکو نہ آتے تو اس نے میرے جسم کے پرخچے اڑا دیئے ہوتے۔ اللہ کی شان ہے۔ کو اللہ میاں نے بچانا ہوتا ہے اس کو بچانے کے وسیلے پیدا کر دیتا ہے۔ مجھے تو برہان پولیس نے ریل کے نیچے کچلنے کا پورا پورا انتظام کر رکھا تھا۔

ڈاکوؤں کا یہ گروہ چاندنی رات میں گھوڑے دوڑاتا چلا جا رہا تھا۔ ایک جگہ سے نے ریلوے لائن پار کی اور دوسری طرف آ کر اپنا رخ مشرق کی طرف کر لیا۔ اب ہان پور کی مخالف سمت کو جا رہے تھے۔ یہ بات میرے لئے بڑی خوش آئند تھی۔ نکھری ہوئی تھی۔ دور سے جنگل کے گھنے درختوں کی ایک دیوار سی قریب آ رہی کچھ دیر کے بعد ہم اس جنگل میں داخل ہو گئے۔ یہ لوگ پیچھے کسی گاؤں میں ڈاکہ کر آئے تھے۔ میں نے دو تین ڈاکوؤں کے پاس دو تین بڑی بڑی گٹھڑیاں اور تھیلے تھے جو انہوں نے گھوڑوں کے آگے پیچھے لٹکا رکھے تھے۔ ان میں لوٹا ہوا مال ہی ہو تھا۔ ورنہ یہ ڈاکو کسی شاپنگ سنٹر میں شاپنگ کر کے نہیں آ رہے تھے۔ جنگل میں ہونے کے بعد گھوڑے آہستہ آہستہ چلنے لگے تھے۔ یہاں چاندنی درختوں کی شاخوں ے چھن چھن کر آ رہی تھی۔ راستے میں ایک چشمہ آ گیا۔ یہاں گھوڑوں سے اتر کر

ڈاکوؤں نے منہ ہاتھ دھو کر پانی پیا۔ گھوڑوں کو بھی پانی پلایا۔ چھلیا ڈاکو مجھے کہنے لگا۔

"بھیکم جی! اب تم شہروں کو بھول جاؤ ہمارے ساتھ رہو۔ عیش کرو گے"

میں نے اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"چھلیا بھیا تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں بھی یہی سوچ رہا ہوں"

چشمے کے پانی کی چھوٹی سی آبشار پتھروں میں سے نیچے گر رہی تھی۔ چاندنی مِ
آبشار خواب ایسا منظر پیش کر رہی تھی۔ یہاں کچھ دیر آرام کرنے کے بعد ڈاکو آگے
پڑے۔ ان کی خفیہ کمیں گاہ جنگل میں کافی آگے جا کر ایک دشوار گزار جگہ پر تھی۔ یہ
ان لوگوں نے ایک جگہ درختوں کے نیچے تین چار جھونپڑے ڈال رکھے تھے۔ بلکہ لگ
کہ یہ جھونپڑے پہلے ہی سے بنے ہوئے تھے ان ڈاکوؤں نے ان پر قبضہ کر لیا
جھونپڑوں کے باہر کہیں کہیں مٹی کے تیل کی لالٹینیں روشن تھیں۔ ان کی روشنی
مدھم تھی۔ کچھ ڈاکو وہاں پہلے سے موجود تھے اور آگ پر گوشت بھون رہے تھے۔ گو
کی خوشبو فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ لکھو ڈاکو نے جو اس گروہ کا سردار تھا مال کی گٹھڑ
اور تھیلے ایک جھونپڑی میں رکھوا دیئے اور کہا۔

"مال صبح کھولا جائے گا۔ ابھی کچھ کھا پی کر سو جاؤ۔"

میں نے چھلیا کے ساتھ بیٹھ کر تھوڑا سا بھنا ہوا گوشت کھایا۔ یہ ہرن کا گوشت
اس کے بعد ہم ایک جھونپڑے کے باہر آگ کے الاؤ سے تھوڑا ہٹ کر وہیں گھا
چادریں بچھا کر سو گئے۔

میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ اونچے اونچے درختوں میں سے روشنی آبشار
طرح نیچے گر رہی تھی۔ ڈاکو اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ قریب ہی ایک ندی
تھی۔ میں نے وہاں جا کر منہ ہاتھ دھویا اور واپس آ کر بجھے ہوئے الاؤ کے پاس بیٹھ
ایک بڑے دیگچے پر چاول پک رہے تھے۔ سردار لکھو دادا وہاں نظر نہیں آ رہا تھا۔
منہ پونچھتا ہوا میرے پاس آ کر بیٹھ گیا اور اپنی بندوق کو صاف کرنے لگا۔

"کہو بھیکم داس! رات کیسے گزری؟"

میں نے کہا۔

"میں تو جی بھر کر سویا دادا"

چھلیا بولا۔

"اچھا یہ بتاؤ تم نے کس کس شہر میں ڈاکے ڈالے تھے۔ کبھی کوئی عورت بھی اٹھا کر
تھے؟"

میں نے یونہی ڈاکے اور چوریوں کے من گھڑت ایک دو قصے اسے سنا دیئے اور کہا۔

"میں نے کبھی کسی عورت کو نہیں اٹھایا"

چھلیا ہنس پڑا۔

"بھیکم داس! ابھی تم چور ہو۔ ڈاکو نہیں بنے۔ ارے عورت کو اٹھاؤ گے تو پورے
ن جاؤ گے۔"

میں نے اس سے پوچھا کہ کیا کبھی اس نے کسی عورت کو اغوا کیا ہے۔ اس نے
کی نالی کو صاف کرتے ہوئے کہا۔

"کئی دفعہ اٹھایا ہے۔ مگر میں دو چار دن اسے اپنے پاس رکھ کر جنگل میں کسی جگہ
آتا تھا۔ ہمارا لکھو دادا تو عورتوں کا بڑا شوقین ہے۔ ہمیشہ ایک عورت اپنے پاس رکھتا

یں نے بات کا موضوع بدل دیا اور چھلیا سے پوچھا۔

"دادا! یہ علاقہ کون سا ہے؟ لگتا ہے ہم نرسنگ پور سے بہت دور آ گئے ہیں"

ھلیا نے سگریٹ سلگا لیا تھا۔ کش لگاتے ہوئے کہنے لگا۔

"ارے ہم نرسنگ پور بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ یہ تو منڈالا رینج کے جنگل ہیں۔
ں پور ہے اور اوپر کی طرف چلے جائیں تو گھوڑوں پر ایک دن ایک رات کے سفر
جبل پور کا شہر آ جائے گا۔"

ں ڈاکو نے مجھے علاقے کا پورا حدود اربعہ بتا دیا تھا۔ مجھے جبل پور کے بارے میں
لم کرنا تھا کہ شہر وہاں سے کس طرف ہے اور یہ مجھے چھلیا ڈاکو نے بتا دیا تھا۔ اب

میرا مشن وہاں سے جبل پور کی طرف فرار ہونا تھا۔ ظاہر ہے میں ان ڈاکوؤں کے ساتھ نہیں رہ سکتا تھا۔ ان لوگوں کی وجہ سے مجھے دو فائدے حاصل ہو گئے تھے۔ ایک تو یہ کہ میری جان بچ گئی تھی۔ دوسرے میں نرسنگ پور اور برہان پور کی پولیس کی رینج سے نکل آیا تھا۔ سب ڈاکو ایک جگہ بیٹھ گئے۔ ان کا سردار بھی اپنے خیمے سے نکل کر آگیا۔ سب نے مل کر چاول کھائے اور مٹی کے پیالوں میں گرم گرم چائے پی۔ اس کے بعد لوٹے ہوئے مال کی گٹھڑیاں اور تھیلے کھولے گئے۔ ان میں سونے چاندی کے زیور اور کرنسی نوٹ تھے۔ لکھو دادا نے سونے کے زیور اپنے پاس ہی رکھے اور کرنسی نوٹ کا کچھ حصہ ڈاکوؤں میں تقسیم کر دیا۔ اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"بھیکم داس! ارے تو کیوں خالی ہاتھ بیٹھا ہے رے۔ یہ لے تو بھی کچھ مال اپنے پاس رکھ لے۔"

اس نے نوٹوں میں سے کچھ کرنسی نوٹ اٹھا کر مجھے دے دیئے۔ یہ دس دس اور پچاس پچاس کے نوٹ تھے۔ مجھے ان کی آگے سفر میں ضرورت پڑ سکتی تھی۔ میں نے لکھو دادا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے نوٹ اپنے پاس رکھ لئے۔

لکھو دادا نے چھلیا کو کہا۔

"ابے چھلیا اندر ہماری رانی کو بھی جا کر چائے دے آ۔"

چھلیا میرے پاس بیٹھا تھا۔

"تم یہیں بیٹھنا۔ میں رانی کو چائے دے کر ابھی آتا ہوں۔"

وہ چلا گیا۔ میں وہیں بیٹھ کر سگریٹ پیتا اور دوسرے ڈاکوؤں کو اپنے اپنے نوٹ گنتے اور آپس میں ہنسی مذاق کرتے دیکھتا رہا۔ لکھو دادا اپنے خاص ساتھی کو پاس بٹھائے اسے سونے کے زیور دکھا رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد چھلیا واپس آگیا۔ مجھے چھلیا سے اب یہ معلوم کرنا تھا کہ جنگل سے کس طرف سے ہو کر جبل پور شہر کی طرف جانا پڑتا ہے۔ یہ معلومات مجھے بڑے طریقے سے حاصل کرنی تھی کہ چھلیا کو یہ شک نہ پڑے کہ میں وہاں سے فرار ہو

پروگرام بنا رہا ہوں۔ میں نے ڈاکوؤں کے سردار کی رانی کے بارے میں شروع کرتے ہوئے اس سے پوچھا کہ یہ رانی کون ہے؟ کہنے لگا۔

"لکھو دادا کی رکھیل ہے۔ اور کون ہو گی۔ گاؤں میں شادی تھی۔ مجرا کرنے وہاں آئی ہوئی تھی۔ ہم نے گاؤں میں ڈاکہ ڈالا اور لکھو دادا کو رانی پسند آگئی۔ بس اسے اٹھا کر لے آیا۔"

میں نے جنگل کے درختوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"چھلیا بھیا! مجھے یہ جگہ محفوظ نہیں لگ رہی"

"وہ کیوں؟"

"بات یہ ہے کہ چونکہ میں شہر میں چوریاں کرتا رہا ہوں اس لئے شہر کی پولیس کو خوب جانتا ہوں۔ کل رات ہمارا پولیس مقابلہ بھی ہوا تھا۔ میرا دماغ کہتا ہے کہ پولیس نے اپنے خفیہ آدمی ضرور چھوڑ رکھے ہوں گے۔"

"ارے ان کی کیا مجال کہ ہمارے ڈیرے کی طرف آئیں۔ اور پھر ہم نرسنگ پور پولیس کی رینج سے بہت دور ہیں۔"

میں نے سگریٹ بجھے ہوئے الاؤ کی راکھ میں پھینکتے ہوئے کہا۔

"لگتا ہے کہ میں اس جنگل میں پہلے بھی آچکا ہوں۔ ایک بار مجھے چھ ماہ کی قید ہو گئی تھی اور مجھے جبل پور کی جیل میں لایا گیا تھا۔ میں وہاں سے دوسرے مہینے ہی جیل توڑ کر بھاگ نکلا۔ مجھے جان پڑتا ہے کہ میں انہیں جنگلوں میں پھرتا رہا تھا"

چھلیا کہنے لگا۔

"ارے بھیکم بھیا! یہاں سے جبل پور بہت دور ہے۔ راستے میں ایک دریا بھی پڑتا ہے۔ دو بڑے خطرناک جنگل آتے ہیں۔"

ایک پگ ڈنڈی میری بائیں جانب درختوں میں بنی ہوئی تھی۔ میں نے چھلیا سے پوچھا۔

"اچھا یہ بتاؤ یہ پگ ڈنڈی کس طرف جاتی ہے؟"

چھلیا نے اس پگ ڈنڈی کی طرف دیکھ کر کہا۔

"یہ ڈنڈی؟ یہ منڈالا کے چاندر کو جاتی ہے جو یہاں سے ایک رات کے سفر کے بعد آتا ہے۔ وہاں ایک سمادھ ہے۔ کہتے ہیں رات کے وقت وہاں کسی سادھنی کی بد روح آتی ہے۔ اکا دکا مسافر نظر آجائے تو اس کا کلیجہ نکال کر کھا جاتی ہے۔"

میں نے اپنے موضوع پر قائم رہتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے چاندر کے آگے دریا آتا ہو گا۔ شاید میں اسی دریا کو پار کر کے ادھر آیا تھا"

چھلیا نے مجھے جھٹلاتے ہوئے کہا۔

"ارے دریا تو منڈالا کے چاندر سے دس کوس پر ہے۔ دریا پار آدمی کو دو دن کا گھوڑے پر سفر کرنا پڑتا ہے تب جا کر جبل پور کی ریلوے لائن آتی ہے"

چھلیا نے مجھے وہاں سے جبل پور تک کا راستہ بتا دیا تھا۔ میں اس راستے کی وہ ساری نشانیاں جو اس نے مجھے بتائی تھیں اپنے ذہن نشین کر لیں۔ اب میں وہاں سے فرار ہونے کے منصوبے پر غور کرنے لگا۔ میں نے اس مقصد کے لئے رات کے پچھلے پہر کا وقت طے کر لیا۔ میں اپنے ساتھ ایک بندوق ضرور لے جانا چاہتا تھا۔ چھلیا کی بندوق دو نالی تھی اور وہ مجھے پسند تھی۔ وہ اسے ہر وقت اپنے پاس رکھتا تھا۔ رات کو بھی بندوق اس کے پہلو میں پڑی ہوتی تھی۔ میں نے سارا پروگرام ذہن میں بنا لیا اور رات کے پچھلے پہر کا انتظار شروع کر دیا۔ شام کے وقت وہاں آگ کا الاؤ روشن ہو گیا اور جیسا کہ یہ لوگ کیا کرتے ہیں وہاں دیسی شراب کا پیپا کھل گیا۔ دیسی شراب کا یہ پیپا ڈاکو کسی گاؤں سے اٹھا کر لائے تھے۔

سب ڈاکوؤں کو بڑی جلدی نشہ چڑھ گیا۔ اس دوران لکھو دادا کی رکھیل رانی نے وہاں مجرا بھی کیا۔ میں الاؤ سے ہٹ کر ایک درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھا تھا۔ چھلیا دوسرے ڈاکوؤں کے ساتھ مل کر شراب پی رہا تھا۔ اس نے مجھے بھی پلانے کی کوشش کی تھی مگر میں نے اسے بتایا تھا کہ میرے گورو جی نے مجھے سوم رس پینے سے منع کیا ہوا

ے ہندو لوگوں میں اپنے گورو سے کئے ہوئے وعدے کی بڑی سختی سے پابندی کی جاتی اور جو کسی کو یہ وعدہ توڑنے کے لئے مجبور کرے ان لوگوں کا عقیدہ ہے کہ اگلے جنم وہ بھیڑیئے کی شکل میں پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ چھلیا نے مجھے شراب پینے پر بالکل مجبور ں کیا تھا۔ سارے ڈاکو مدہوش ہو رہے تھے۔ لکھو دادا بھی خوب پی رہا تھا اور مدہوشی عالم میں تھا۔

رانی سگریٹ پیتی ہوئی میرے پاس آکر بیٹھ گئی۔ میری طرف غور سے دیکھنے لگی۔ ں نے پوچھا۔

"کیا دیکھ رہی ہو؟"

مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ یہ طوائف ہے۔ لیکن میرا خیال تھا کہ اس پر بڑا ظلم ہوا ہے ڈاکو اسے اٹھا کر لے آئے ہیں کہنے لگی۔

"تم شہر کے لگتے ہو۔ ان ڈاکوؤں میں زیادہ دیر نہ رہ سکو گے۔ لکھو دادا نے مجھے ارے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔"

میں نے جواب دیا۔

"رانی بائی! اگر تم یہاں ان لوگوں کے ساتھ رہ سکتی ہو تو میں بھی رہ لوں گا۔ تم بھی ہر کی رہنے والی ہو۔"

رانی نے سگریٹ کا دھواں اڑاتے ہوئے کہا۔

"میرے میں اور تیرے میں فرق ہے۔ میں نے بڑے بڑے مگرمچھوں کو بھگتایا ہے۔ ایک بن مانس تو میرے لئے کچھ بھی نہیں۔ ویسے بھی مجھے ڈاکو لوگ شہری بابوؤں اور ؤں کے مقابلے میں اچھے لگتے ہیں۔ میں تو یہاں بڑی خوش ہوں اگر تم یہاں رہے تو لینا ایک دن میں ان ڈاکوؤں کی سردارنی بن جاؤں گی۔"

یہ اور ہی طرح کی طوائف تھی۔ اس کا اندر باہر ایک تھا۔ وہ ہر طرف سے طوائف ۔ جب اس کا سگریٹ ختم ہو گیا تو وہ انگڑائی لے کر اٹھی اور بولی۔

"یہ بن مانس لکھو تو ساری رات پئے گا میں چل کر سوتی ہوں۔ نیند آ رہی ہے۔"

وہ چلی گئی اور میں ان درختوں کی طرف دیکھنے لگا جہاں سے ہو کر مجھے جبل پور کی طرف جانا تھا۔ ہلکی چاندنی درختوں میں سے چھن کر پگ ڈنڈی پر پڑ رہی تھی۔ میں خاموشی سے بیٹھا ڈاکوؤں کو شور شرابا مچاتے دیکھتا رہا۔

میں اسی رات ڈاکوؤں کے خفیہ اڈے سے نکل گیا۔

جاتے ہوئے میں نے چھلیا کی بندوق اور کارتوسوں کی پیٹی اٹھالی تھی۔ وہ جھونپڑی کے باہر دھت ہو کر سویا ہوا تھا۔ میں نے اللہ کا نام لے کر پگ ڈنڈی پر چلنا شروع کر دیا۔ چھلیا نے کہا تھا کہ جبل پور تک یہ راستہ گھوڑوں پر سوار ہو کر سفر کرو تو دو راتوں دو دنوں میں طے ہوتا ہے۔ میں پیدل چل رہا تھا۔ ظاہر ہے بڑا لمبا سفر تھا۔ مگر یہ خیال بھی تھا کہ شاید رستے میں کوئی سواری مل جائے۔ سب سے پہلے منڈالا کا چاندر آنے والا تھا۔ یہ چاندر بقول چھلیا منڈالا کے جنگل کے عین وسط میں تھا۔ اس کے آگے دریا پار کرنا تھا۔ پھر اس نے ایک سادھ کا بھی ذکر کیا تھا جہاں رات کو کسی سادھو کی بدروح آتی تھی اور وہاں پر جو بھی انسان موجود ہو اس کا کلیجہ نکال کر کھا جاتی تھی۔ مجھے اس بدروح کا کوئی خوف نہیں تھا۔ میں نے بڑی بڑی بدروحیں دیکھی تھیں۔ رات بڑی حبس آلود تھی۔ ہوا بالکل بند تھی۔ جنگلی جانوروں کا ڈر بھی تھا۔ مگر بندوق میرے پاس تھی جس میں دو کارتوس میں نے بھر لئے تھے۔ میں نے اپنی رفتار ذرا تیز کر دی تھی تاکہ صبح ہونے سے پہلے پہلے ان ڈاکوؤں سے جتنی دور نکل سکتا ہوں نکل جاؤں۔ گھوڑا میں اس لئے حاصل نہیں کر سکا تھا کہ سارے گھوڑے اس طرف بندھے تھے جس طرف ڈاکو سو رہے تھے۔ وہ گھوڑوں کے گرد دائرہ بنا کر سوئے تھے۔ معلوم نہیں ایسا انہوں نے کیا سوچ کر کیا تھا۔ میں ان کے اوپر سے گھوڑے کو نہیں نکال سکتا تھا۔ ویسے بھی دو ڈاکو گھوڑوں کی رکھوالی کر رہے تھے۔ میں جنگلوں میں راتوں کو اس قسم کا سفر کرنے کا عادی تھا۔ اور میرے پاس زیادہ وقت بھی نہیں تھا لہٰذا اللہ کا نام لے کر پیدل ہی چل پڑا تھا۔ کہ خدا مسبب الاسباب ہے آدمی کی نیت نیک ہو تو قدرت کوئی نہ کوئی اچھا سبب بنا دیتی ہے۔

آپ یوں سمجھ لیں کہ میں قریباً آدھی رات تک جنگل میں چلتا رہا۔ کبھی آہستہ

آہستہ کبھی تیز تیز۔ تھک جاتا تو تھوڑی دیر کے لئے کسی جگہ بیٹھ جاتا۔ جنگل شکل بدلتا چلا گیا۔ کبھی گھنے درختوں کے جھنڈ آجاتے۔ کہیں کوئی کھائی آجاتی۔ کہیں گھاٹی نیچے اتر جاتی۔ ایک جگہ پانی کا چھوٹا سا تالاب چاندنی میں نظر پڑا تو اس کے کنارے بیٹھ کر منہ ہاتھ اور پاؤں دھوئے۔ تھوڑا سا پانی بھی پیا۔ تازہ دم ہو گیا اتنے میں مجھے ایک جانب سے غراہٹ کی آواز آئی۔ اس آواز کو میں بڑی اچھی طرح سے پہچانتا تھا۔ یہ جنگل کے بادشاہ شیر کی آواز تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ شیر اگر آدم خور نہ ہو تو کبھی کسی انسان پر حملہ نہیں کرتا۔ بلکہ جنگل میں انسان کو دیکھ کر اپنا راستہ تبدیل کر لیتا ہے۔ اگر اسے اس راستے سے ضرور گزرنا ہو تو غرا کر انسان کو حکم دیتا ہے کہ وہ اس کے راستے سے ہٹ جائے۔ تالاب پر شیر پانی پینے آرہا تھا۔ اس نے چاندنی میں ایک انسان کو بیٹھے دیکھا تو غرا کر مجھے وہاں سے ہٹ جانے کا حکم دیا۔

میں جلدی سے اٹھ کر ایک جانب درختوں میں چلا گیا۔ احتیاط کے طور پر میں درخت کی ٹہنی پر چڑھ کر بیٹھ گیا اور بندوق ہاتھ میں سیدھی کر لی۔ میری نظریں تالاب پر لگی تھیں۔ اتنے میں ایک بہت بڑا شیر جھاڑیوں سے نکل کر تالاب پر آیا اور پانی پینے لگا۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ شیرنی تھی۔ اس کی گردن پر شیروں والے گھنے بال نہیں تھے۔ دیر تک شیرنی پانی پیتی تھی۔ جب خوب سیر ہو گئی تو اس نے منہ اوپر کر کے جبڑے کھول کر سر کو دائیں بائیں جھٹکے دیئے۔ ایک بار پھر غرائی۔ یہ اس لئے کہ اسے قریب ہی سے انسان کی بو آرہی تھی۔ پھر پلٹ کر دوڑتی ہوئی درختوں میں غائب ہو گئی۔

میں درخت سے اترا اور پگ ڈنڈی پر چلنے لگا۔ جو اب جھاڑیوں میں بڑی مشکل سے چاندنی رات میں نظر آتی تھی۔ میں اندازے سے چلا جا رہا تھا۔ میں نے اپنا رخ اسی طرف رکھا ہوا تھا جس رخ پر میں ڈاکوؤں کے ڈیرے سے چلا تھا۔ آدھی رات کو میں چلا تھا۔ پو پھٹنے لگی تو میں ابھی تک آہستہ آہستہ جنگل میں چل رہا تھا۔ راستے میں ایک جگہ کالے ناگوں کا جوڑا بھی دیکھا جو چاندنی میں بڑے مزے سے کھیل رہا تھا۔ میں پرے ہٹ کر گزر گیا تھا۔ چاندنی راتوں میں ایک دوسرے سے راز و نیاز کی باتیں کرتا ہوا سانپوں کا

جوڑا بہت خطرناک ہوتا ہے۔ ان کے قریب کبھی نہیں جانا چاہئے۔ جب آسمان پر صبح کی سفیدی پھیلنے لگی اور درختوں پر پرندوں نے چہچہانا شروع کر دیا تو مجھے کچھ جھگیاں نظر آئیں۔ یہ مدھیہ پردیش کے جنگلی لوگ تھے جنہیں وہاں کی زبان میں آدھی واس کہتے ہیں۔ یہ وحشی جنگلی قسم کے لوگ نہیں ہوتے بلکہ دیہاتی ٹائپ کے لوگ ہوتے ہیں جو جنگلوں میں رہ کر تھوڑی بہت کھیتی باڑی کرتے ہیں اور بانس کی ٹوکریاں وغیرہ بناتے ہیں یا شکاریوں کی راہ نمائی کرتے ہیں۔

جھگیوں کے پاس ایک بوڑھا آدمی بیٹھا ناریل کا حقہ پی رہا تھا۔ میں نے قریب جا کر نمسکار کیا تو اس نے ناریل منہ کے آگے سے ہٹا کر میری طرف دیکھا۔ کالے رنگ کا بڑی بڑی سفید مونچھوں والا دبلا پتلا کمزور سا بوڑھا تھا اس نے اس علاقے کی دیہاتی زبان میں مجھ سے پوچھا کہ کیا میں شکاری ہوں؟ میرے ہاتھ میں بندوق دیکھ کر بھی اسے مجھ پر شکاری ہونے کا شبہ ہوا تھا۔ ان لوگوں کی زبان سے مجھے کافی واقفیت ہو گئی ہوئی تھی اور میں ان جنگل میں رہنے والوں کی زبان بول نہیں سکتا تھا۔ مگر سمجھ پوری طرح سے لیتا تھا اور اپنا مطلب بھی سمجھا سکتا تھا۔ یہ شکستہ اردو ہی بولتے تھے مگر اس میں وہاں کی قدیم جنگلی بولی کے الفاظ زیادہ ہوتے تھے۔ میں نے بوڑھے کو سمجھایا کہ میں شکاری ہی ہوں۔ جنگل میں بھٹک گیا ہوں۔ منڈالا کے چاندر کی طرف جانا چاہتا ہوں۔ مگر بہت تھکا ہوا ہوں۔ بھوک بھی لگی ہے۔ بوڑھے نے کسی کو آواز دی۔ دوسری جھونپڑی میں سے ایک نوجوان لڑکا دوڑتا ہوا آگیا۔ اس کے ہاتھ میں نیزہ تھا۔ بوڑھے نے اسے کہا کہ شکاری بابو کو کچھ کھلاؤ پلاؤ۔ یہ چاندر کو جائے گا۔

مجھے دیکھ کر کچھ جنگلی عورتیں اور بچے بھی وہاں آگئے۔ وہ بڑے شوق سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ اس کی وجہ محض اتنی تھی کہ وہاں جو شکاری آتا تھا ان لوگوں کو بسکٹ' چائے کی پتی اور نمک وغیرہ ضرور دے جاتا تھا۔ میرے لئے ایک آدمی کچھ روٹیاں لے آیا جن پر بینگن کی بھجیا ڈال دی گئی تھی۔ میں نے بڑے مزے سے روٹی کھائی۔ پانی پیا۔ پھر سگریٹ سلگا کر بوڑھے سے چاندر کے بارے میں پوچھنے لگا۔ جو لڑکا میرے لئے روٹی لایا تھا

وہ بھی ہمارے سامنے بیٹھ گیا تھا۔ میں نے جیب سے کچھ روپے نکال کر بوڑھے کو اور کچھ روپے لڑکے کو دیئے۔ وہ روپے لے کر بڑے خوش ہوئے۔ انہوں نے بتایا کہ منڈالا کا چاندر وہاں سے ابھی کافی دور ہے۔ چاندر کے آگے منڈالا کا قصبہ ہے۔ جس کے آگے دریائے کاویری بہتا ہے۔ میں نے اس سے سادھو کی بدروح والے سانپ کے بارے میں دریافت کیا تو وہ کانوں کا ہاتھ لگا کر بولا۔

"بھگوان اس سے بچائے۔ خبردار! اس طرف مت جانا۔"

مجھے نیند آنے لگی تھی۔ میں نے بوڑھے کو بتایا کہ میں ساری رات چلتا رہا ہوں۔ اب کچھ دیر کے لئے آرام کرنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے ایک جھونپڑی خالی کر دی۔ میں جھونپڑی میں جا کر سو گیا۔ کافی دیر تک سویا رہا۔ جب اٹھا تو بالکل تازہ دم تھا۔ جھونپڑی کے باہر دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ میں نے پتلون کی جیب میں سے نوٹ نکال کر گنے۔ کل دو ہزار بتیس روپے تھے۔ ڈاکوؤں کے سردار لکھو کے پاس لوٹ کا مال تھا۔ اس نے بڑی فراخدلی سے میری طرف نوٹ اچھالے تھے۔ یہ سارے کے سارے نوٹ میرے پاس ہی تھے۔ جنگل کے ان باسیوں نے میری جیب کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ ان کے ہاں اکثر رجواڑوں کے افسر اور باہر کے انگریز شکاری شکار کھیلنے آتے رہتے تھے۔

یہ لوگ اپنی ساکھ اور اپنے کاروبار کے خیال سے چوری چکاری بالکل نہیں کرتے تھے اور شکاریوں کی کسی قیمتی چیز کو ہاتھ بھی لگانا پاپ سمجھتے تھے۔

میرے پاس سری نگر تک پہنچنے کے لئے کافی رقم موجود تھی۔ میں نے دوپہر کو ان لوگوں کے ساتھ تھوڑا بہت کھانا کھایا اور انہیں دو سو روپے دے کر ان سے ایک ٹٹو بھی لے لیا۔ بوڑھے نے کہا۔

"دریا کے گھاٹ پر جا کر ٹٹو کو چھوڑ دینا۔ یہ اپنے آپ ہمارے پاس آ جائے گا۔ دریا کے پار تمہیں ٹٹو کی ضرورت نہیں رہے گی۔ آگے تمہیں ریل گاڑی مل جائے گی۔"

ان لوگوں کو اس علاقے کا چھلیا ڈاکو سے زیادہ پتہ تھا۔ میں ٹٹو پر سوار ہو کر جنگل میں منڈالا چاندر کی جانب روانہ ہو گیا۔ سفر کرتے کرتے شام ہو گئی۔ ایک جگہ تھوڑی دیر

آرام کیا اور پھر چل پڑا۔ آدھی رات کو جنگل زیادہ گھنا اور خوفناک نظر آنے لگا تو وہیں ایک درخت کے ساتھ ٹٹو کو باندھا۔ اور ایک طرف پڑ کر سو گیا۔ دوسرے روز دھوپ نکلی ہوئی تھی کہ اٹھا اور دوبارہ اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔ دوسرے روز دوپہر کے بعد منڈلا کا جنگل شروع ہو گیا۔ یہ جنگل بالکل مختلف تھا۔ اس میں جو درخت اگے ہوئے تھے ان کے تنے بہت اونچے اونچے تھے ان پر جنگلی بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ جگہ جگہ زمین کے اندر سے بڑے بڑے پتھر باہر نکلے ہوئے تھے۔ شام کے وقت چاندر آ گیا۔ اس کی نشانی مجھے یہ بتائی گئی تھی جب چاندر شروع ہو گا تو زمین پر جلی ہوئی جھاڑیوں اور جلے ہوئے درختوں کی راکھ اور جلے ہوئے سوختہ درخت ملیں گے۔ میرا ٹٹو ان کے درمیان میں سے گزر رہا تھا۔ چاندر میں کہتے ہیں دن کے وقت چلچلاتی دھوپ میں اپنے آپ آگ لگ جاتی ہے۔ یہ آگ درختوں اور جھاڑیوں کو جلا ڈالتی ہے۔ اور پھر اپنے آپ ہی بجھ جاتی ہے۔ سردیوں کے بعد برسات میں جب بارشیں ہوتی ہیں تو اس راکھ میں سے نئے درختوں اور جھاڑیوں کی کونپلیں پھوٹ پڑتی ہیں۔

آسمان پر تارے نکل آئے۔ رات ہو گئی تھی۔ چاند بھی کچھ دیر کے بعد نکل آیا۔ اب مجھے سادھو کی بدروح والے سادھ کے قریب سے گزرنا تھا۔ اس لئے کہ دریا کے گھاٹ کی طرف جاتے ہوئے یہی ایک نشانی تھی جس سے اس بات کی تصدیق ہوتی تھی کہ میں ٹھیک راستے پر جا رہا ہوں۔ میں جلے ہوئے چاندر سے گزر گیا۔ آگے کوئی تین چار میل چلا ہوں گا کہ ایک جگہ چاندنی میں چبوترہ دکھائی دیا جس پر ایک چھوٹی سی بارہ دری بنی ہوئی تھی۔ ہندو لوگ اپنے بعض بزرگوں یا زیادہ تر سادھو سنتوں کی ہڈیاں چتا میں سے نکال کر ہنڈیا میں ڈال لیتے ہیں اور پھر انہیں کسی جگہ دفن کر کے اوپر چھوٹی سی بارہ دری بنا دیتے ہیں۔ اسے وہ لوگ سادھ کہتے ہیں پنجابی میں اسے مڑھی بھی کہتے ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ یہی سادھو کی سادھ ہے اور یہاں سادھو کی بدروح رات کو آتی ہے۔

میں سادھ کے قریب سے گزرنے لگا تو ٹٹو ایک دم رک گیا۔ وہ ڈرا ہوا لگتا تھا اور بار بار اپنی ٹانگیں پیچھے لے جا رہا تھا۔ میں نے اسے آگے چلانے کی بڑی کوشش کی مگر ٹٹو پیچھے

جا رہا تھا۔ میرے ذہن میں یہی خیال آیا کہ بدروح نظر نہیں آیا کرتی۔ ہو سکتا ہے وہ یہاں آ گئی ہو اور مجھ پر حملہ کرنے کا سوچ رہی ہو۔ مجھے بدروح کا کوئی ڈر خوف تو تھا نہیں۔ اس سے پہلے کئی بدروحوں سے میرا واسطہ پڑ چکا تھا۔ دوسرے سب سے طاقتور اور اہم بات یہ تھی کہ میرا خدائے واحد وشاہد پر ایمان بے حد پختہ تھا۔ مجھے اپنے اللہ پر بھروسہ تھا اور مجھے یقین تھا کہ دنیا کی کوئی بدروح میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ چندریکا کی روح نے مجھے جو نقصان پہنچانا تھا وہ پہنچا چکی تھی۔ اب وہ بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی کیونکہ میرا اپنے خدائے واحد پر جو قادر مطلق ہے ایمان اور زیادہ پختہ ہو گیا ہوا تھا۔

میں سادھ کے پاس آ گیا اور چبوترے پر بیٹھ گیا۔ میں نے بلند آواز میں کہا۔

”اگر تو واقعی کوئی بدروح ہے تو میرے ٹٹو کو ضرور ڈرا سکتی ہے مگر مجھے نہیں ڈرا سکتی۔ تجھ میں اگر ہمت ہے تو میرے سامنے آ۔“

اس کے ساتھ ہی میں نے کلمہ طیبہ پڑھا۔ اچانک ایسی آواز آئی جیسے کسی کے منہ سے تکلیف کی وجہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی ہو۔ اس کے بعد وہاں کوئی آواز سنائی نہ دی۔ میں اٹھ کر ٹٹو کے پاس گیا۔ وہ بڑے مزے سے گھاس چر رہا تھا۔ میں نے اسے باگ سے پکڑ کر چلایا تو وہ چل پڑا۔ بدروح کلمہ طیبہ کو سن کر دفعہ ہو گئی تھی۔ میں ٹٹو پر بیٹھ گیا اور اسے لے کر وہاں سے آگے چل پڑا۔

ساری رات جنگل میں چلتا رہا۔ صبح کاذب کی جھلکیاں آسمان پر نمودار ہوئیں تو دور سے مجھے دریا کی مرطوب ہوا آتی محسوس ہوئی۔ کوئی آدھ گھنٹے کے سفر کے بعد دریا میرے سامنے تھا۔ دور ایک طرف مجھے دریا کے کنارے کچھ لوگ کھڑے دکھائی دیئے۔ دریا کا گھاٹ تھا۔ میں نے ٹٹو کو وہاں چھوڑ دیا اور گھاٹ پر آ گیا۔ ایک بہت بڑی کشتی جسے بیڑا کہتے ہیں مسافروں سے بھری ہوئی دریا کے پار جانے کے لئے تیار کھڑی تھی۔ میں بھی سوار ہو گیا۔ کشتی چل پڑی۔ کشتی میں کچھ دیہاتی گوالے بھی دودھ کے بڑے بڑے برتن رکھے بیٹھے تھے۔ ان کی زبانی معلوم ہوا کہ دریا پار منڈلا کمالی کا بڑا قصبہ ہے جہاں یہ لوگ دودھ لے کر جا رہے ہیں اور روز صبح جاتے ہیں۔ ان کی زبانی مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ

منڈالا کمالی نام کا ریلوے سٹیشن بھی ہے جہاں سے جبل پور کو گاڑی جاتی ہے۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ بندوق میرے پاس ہی تھی اور کارتوسوں کی پیٹی بھی میں نے گلے میں لٹکائی ہوئی تھی۔ یہ سب لوگ مجھے شکاری ہی سمجھ رہے تھے۔ میں نے بھی ان لوگوں کو یہی بتایا کہ چاندر میں ہرن کا شکار کھیلنے گیا تھا۔ ہرن نہیں ملا۔ اب منڈالا جا رہا ہوں جہاں سے آگے جبل پور چلا جاؤں گا۔

منڈالا کمالی کا قصبہ کافی بڑا تھا اور چھوٹے سے شہر کی طرح تھا۔ میں نے ایک بازار میں چائے کی دکان کے اندر بیٹھ کر ناشتہ کیا اور ایک یکے میں سوار ہو کر ریلوے سٹیشن پر آگیا۔ یہاں آکر معلوم ہوا کہ جبل پور جانے والی گاڑی شام کو آئے گی۔ یہ کوئی مین لائن نہیں تھی۔ برانچ لائن تھی۔ جبل پور کی جانب صرف ایک پسنجر ٹرین جاتی تھی جو پیچھے ناگ پور سے آتی تھی۔ مجھے بہرحال شام گزارنی تھی۔ قصبے میں کوئی ہوٹل نظر نہیں آیا تھا۔ سٹیشن مجھے محفوظ جگہ لگی۔ فیصلہ کیا کہ یہیں پلیٹ فارم پر دن گزارا جائے۔ چھوٹا سا پلیٹ فارم تھا۔ تقریباً خالی پڑا تھا۔ جہاں سٹیشن کا چھوٹا گیٹ پلیٹ فارم سے باہر سٹیشن کی ڈیوڑھی کو جاتا تھا وہاں قریب ہی ایک چائے کا سٹال تھا۔ میں نے وہاں کھڑے ہو کر چائے پی اور پھر پلیٹ فارم پر ذرا دور جا کر خالی بنچ پر بیٹھ گیا اور سگریٹ پینے لگا۔ سامنے پلیٹ فارم کی دوسری جانب ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ لوہے کا جنگلہ لگا ہوا تھا۔ اس کی دوسری طرف ریل کی ایک اور پٹڑی تھی جس پر مال گاڑی کے دو ڈبے کھڑے تھے۔ ابھی دوپہر بھی نہیں ہوئی تھی۔ پلیٹ فارم پر شام تک پڑے رہنا دوسروں کو شک میں مبتلا کرنا تھا۔ میں نے سوچا کہ قصبے میں چلتے ہیں۔ چل کر کسی ڈھابے یا ہوٹل میں کھانا وغیرہ بھی کھالوں گا اور وقت بھی گزر جائے گا۔

چنانچہ میں سٹیشن سے نکل کر قصبے کی طرف چل پڑا۔ سڑک کی دونوں جانب کھیت دن کی دھوپ میں چمک رہے تھے۔ فضا نہ گرم تھی نہ سرد۔ کچھ فاصلے پر قصبے کے مکان اور عمارتیں نظر آرہی تھیں۔ یہ پرانا قصبہ تھا۔ اکثر مکان پرانے تھے اور بارشوں کی وجہ سے ان کے در و دیوار سانولے پڑ گئے تھے۔ میں ایک بازار میں سے گزر رہا تھا۔ زیادہ تر

لوگ دیہاتی لباس میں تھے۔ عورتوں نے گھگھریاں بھی پہنی ہوئی تھیں اور ساڑھیاں بھی۔ بازار کے وسط میں ایک بیل کھڑا تھا۔ ایک ہندو اسے کچھ کھلا رہا تھا۔ ہندو بیل کو بھی مقدس سمجھتے ہیں۔ نندی بیل کو تو وہ دیوتا مانتے ہیں۔ بازار میں پیپل کا درخت تھا درخت کے تنے میں ہنومان کی مورتی رکھی ہوئی تھی۔ ایک پجاری قریب بیٹھا اس کی آرتی اتار رہا تھا۔ تین خواتین اور ایک مرد سامنے ہاتھ باندھے بیٹھے تھے۔

مجھے ایک دکان میں کچھ لوگ بیٹھے چائے پیتے اور کھانا کھاتے نظر آئے تو میں بھی اندر جا کر بیٹھ گیا۔ معلوم ہوا کہ یہ ویشنو ہوٹل تھا اور یہاں صرف سبزیاں ہی بنائی جاتی تھیں۔ میں نے تھوڑا بہت کھایا اور چائے کا گلاس سامنے رکھ کر بیٹھ گیا۔ مجھے وقت کاٹنا تھا۔ آتے جاتے لوگوں پر میں نے نگاہ رکھی ہوئی تھی۔ اگرچہ اتنی ایمرجنسی والی بات نہیں تھی لیکن مجھے ہر حالت میں محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔ ایک تو میں جائے وقوعہ سے ابھی بہت زیادہ دور نہیں نکلا تھا۔ دوسرے میں کشمیری مجاہد اور مفرور کمانڈو ہی نہیں تھا بلکہ میں کئی دشمنوں کا خون بھی کر چکا تھا جن میں انڈیا کے پولیس اور فوجی افسر بھی شامل تھے۔

اتنے میں ایک سکھ نوجوان دکان میں داخل ہوا اور ہوٹل والے ہندو لالے سے مخاطب ہو کر بولا۔

”لالہ! اوئے آج تو کہیں سے جھٹکا لا کر کھلا دو۔“

پھر خود ہی ہنستا اور اپنی پگڑی کو دباتے ہوئے کہنے لگا۔

”تم کہاں سے لاؤ گے جھٹکا۔ یہاں سبھی ڈھابے ویشنو ہیں۔ مجھے آپ ہی کسی روز جھٹکا کرنا پڑے گا۔“

میں بنچ پر بیٹھا تھا۔ آگے لمبی میز تھی۔ دوسرے گاہک بھی میز کے آگے بنچوں پر بیٹھے چائے وغیرہ پی رہے تھے اور ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔ سکھ نوجوان میرے ساتھ ہی بنچ پر آکر بیٹھ گیا۔ اور میری طرف دیکھنے لگا۔ ایک تو میرا رنگ گورا تھا۔ دوسرے میں وہاں کے دیہاتی لباس میں نہیں تھا۔ میں نے پتلون پہنی ہوئی تھی۔ سکھ نوجوان نے مسکراتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

"بھاپا جی! آپ مجھے پنجابی لگتے ہیں"

میں نے تھوڑا سا مسکرا کر اردو میں کہا۔

"جی نہیں میں پنجابی نہیں ہوں۔"

سکھ نوجوان بولا۔

"بھاپا جی آپ کی اردو پنجابیوں والی ہے مجھ سے کیوں چھپا رہے ہیں۔ میں بھی پنجابی ہوں۔"

میں نے کہا۔

"میرے ماتا پتا پنجاب سے آکر بمبئی میں آباد ہو گئے تھے۔ اس لئے میری اردو پنجابیوں والی ہے۔"

سکھ نوجوان نے میرا ہاتھ پکڑ کر زور سے دبایا اور کہا۔

"یہ کہو ناں بھاپا جی۔ تسی پنجابی ہی ہوئے ناں بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔"

وہ اب پنجابی میں باتیں کرنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ سامنے والے بنچ پر بیٹھا ایک آدمی چائے پی رہا تھا۔ پہلے اس نے میری طرف کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ لیکن یہ معلوم ہونے کے بعد کہ میں پنجابی ہوں وہ میری طرف گھور کر دیکھنے لگا۔ میں نے دل میں سوچا کہ یہاں سے نکل جانا چاہئے یہ سکھ نوجوان کہیں مجھے کسی مصیبت میں نہ ڈال دے۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ سکھ نوجوان نے دکاندار سے کہا۔

"لالہ جی! اپنے پنجابی بھاپے سے پیسے مت لینا۔"

میں نے کہا۔

"نہیں سردار جی یہ تکلیف نہ کریں"

وہ بولا۔

"بھاپا جی! ہم دونوں نے پنج دریاؤں کا پانی پیا ہوا ہے۔ ہم دونوں بھرا بھرا ہیں۔"

اس وقت میری آنکھوں کے سامنے اس سکھ کی شکل آگئی جس نے تلوار مار کر میری چھوٹی بہن کلثوم کی گردن کاٹ دی تھی اور وہ کھیتوں میں شہید ہو گئی تھی۔

ں خاموشی سے دکان سے نکل گیا۔

دل میں اس شخص کا خیال بار بار آتا تھا جس نے میری طرف گھور کر دیکھا تھا۔ اگر
یہ پولیس والے مفرور مجرموں کو پہچان لیتے تھے تو اب مجھے اتنا تجربہ ہو چکا تھا کہ میں بھی
یہ پولیس والوں کے چہرے پہچان لیتا تھا۔ مجھے وہ شخص خفیہ پولیس والا ہی لگا تھا۔ چنانچہ
ں بے حد محتاط ہو گیا تھا۔ میں ایک بازار سے نکل کر دوسرے بازار میں داخل ہو گیا تھا۔
ارا قصبہ' سارے بازار میرے لئے نئے اور اجنبی تھے۔ وہاں کوئی سینما ہاؤس بھی نظر
یں آرہا تھا کہ جہاں کچھ دیر کے لئے چھپ کر بیٹھ جاتا۔ ایک بازار کا موڑ گھومتے ہوئے
ں رک گیا۔ پیچھے دیکھا۔ بازار میں کافی لوگ آجا رہے تھے۔ مجھے ان میں خفیہ پولیس
لے کا چہرہ کہیں نظر نہ آیا۔ مگر میرا دل کہتا تھا کہ وہ میرا تعاقب کر رہا ہے۔

اصل خطرہ مجھے اس بات کا تھا کہ اس قصبے میں پولیس سٹیشن ضرور ہو گا۔ اگر خفیہ
لیس والے نے تھانے میں جا کر میری خبر پہنچا دی تو پولیس فوراً جائے گی اور یہ کوئی شہر
یں تھا کہ جہاں میں ادھر ادھر بھاگ کر چھپ جاتا۔ آخر قصبہ ہی تھا۔ پولیس مجھے آسانی
ے پکڑ سکتی تھی۔ میرے پاس جو بندوق اور کارتوس تھے وہ میں نے سٹیشن پر ہی چائے
ے سٹال والے کے پاس رکھوا دیئے تھے۔ بندوق ساتھ لے کر میں قصبے میں نہیں پھرنا
ہتا تھا۔ اور پھر میرے پاس بندوق کا لائسنس بھی نہیں تھا۔ اور کچھ نہ سوجھا تو یہی سوچا
ہ سٹیشن پر ہی واپس چلا جائے۔ وہاں زیادہ لوگ نہیں ہوں گے۔ میں جس طرف سے
یا تھا اسی راستے سے ہوتا ہوا ریلوے سٹیشن کی طرف چل پڑا۔ چونکہ میرے دل میں یہ

خیال لگا ہوا تھا کہ ممکن ہے خفیہ پولیس والا پولیس کو لے کر وہاں آجائے اس واسطے میں ،تے ہوئے جالندھر جموں جانے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ اس طرف مجھے خطرہ محسوس ہو
نے بندوق اور کارتوس کی پیٹی سٹیشن کے ٹی سٹال والے کے پاس ہی رہنے دی۔ کہا تھا۔ اب میرا روٹ یہ تھا۔ جبل پور سے الہ آباد' کانپور' لکھنؤ' اور لکھنؤ سے بریلی'
پولیس نے بندوق میرے پاس دیکھ کر اس کا لائسنس مانگا تو وہ مجھے بلا لائسنس بندوق راد آباد اور سہارن پور اور وہاں سے انبالہ' لدھیانہ اور جالندھر پہنچنا تھا جہاں سے جموں
رکھنے کے جرم میں ہی پکڑ کر تھانے میں لے جائے گی۔ چنانچہ میں ٹی سٹال کے سامنے کی نے والی ریل گاڑی یا بس پکڑنی تھی۔ اگرچہ یہ لمبا روٹ تھا مگر نسبتاً محفوظ تھا۔
بجائے پیچھے سے ہو کر نکل گیا اور پلیٹ فارم کے بیچ پر آکر بیٹھ گیا۔ میں تھوڑی تھوڑی دیر جبل پور بہت بڑا جنکشن تھا۔ کئی طرف سے گاڑیاں آتی تھی اور جاتی تھیں' انکوائری
بعد پلیٹ فارم کے گیٹ کی طرف دیکھ لیتا تھا کہ کہیں خفیہ ایجنسی کا اہلکار پولیس لے کر تو ے معلوم ہوا کہ پنجاب میل رات کے دو بجے کلکتے سے آتی ہے وہ امرتسر کو جائے گی۔
نہیں آگیا۔ گیٹ کے پاس ریلوے پولیس کا ایک دبلا پتلا سا سپاہی ہاتھ میں لاٹھی لئے ضرور ل پور پر مجھے زیادہ خطرہ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ گاڑی آنے میں ابھی کافی دیر تھی۔ ابھی
موجود تھا۔ یہ پہلے سے وہاں پر تھا۔ اس لئے اس کی مجھے فکر نہیں تھی۔ ام بھی پوری طرح سے نہیں ہوئی تھی۔ میرے پاس روپے بھی تھے۔ سوچا شہر میں چل
جبل پور کا ریلوے ٹکٹ میں نے پہلے ہی لے کر جیب میں رکھ لیا تھا۔ ایک بے چینی ر سب سے پہلے نئی پتلون وغیرہ خریدنی چاہئے۔ میرے کپڑے بہت خراب اور بوسیدہ ہو
سی مجھے ضرور لگی تھی۔ اتنے میں ایک وردی پوش آدمی سرخ اور سبز جھنڈیاں بغل میں ہے تھے۔ جوتا بھی جنگل میں چلنے کی وجہ سے پھٹ گیا تھا۔ میں سٹیشن سے نکل کر ایک
دبائے پلیٹ فارم پر نکل آیا۔ پھر مجھے دور سے ریل کے انجن کی آواز سنائی دی۔ کوئی گاڑی یٹ میں آگیا۔ یہاں ایک دکان ریڈی میڈ کپڑوں کی تھی۔ وہاں میں نے ایک مٹیالے
آرہی تھی۔ ایک پسنجر ٹرین تھوڑی دیر بعد پلیٹ فارم پر آکر کھڑی ہو گئی۔ مسافر اترنے ر کی نئی پتلون۔ اسی کلر کی قمیض اور ایک جیکٹ خریدی۔ جیکٹ گرم تھی۔ کیونکہ
چڑھنے لگے۔ میں نے ایک دیہاتی سے پوچھا کہ یہ گاڑی جبل پور جائے گی کیا؟ وہ بولا۔ گے پنجاب میں سردیوں کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ یہ نومبر کا مہینہ تھا۔ ربڑ کے نئے
"موڑواڑہ جارہی ہے۔ وہاں سے جبل پور کی گاڑی مل جائے گی" تے خریدے۔ پرانے کپڑے لفافے میں ڈالے اور ایک جگہ چوک میں کوڑے کے ڈرم
میں ایک ڈبے میں گھس کر بیٹھ گیا۔ ں پھینک دیئے۔ ایک جگہ ہیر کٹنگ سیلون تھا۔ میری ڈاڑھی خشخشی تھی۔ مگر اب اس
جب تک گاڑی نہیں چلی میری آنکھیں پلیٹ فارم کے گیٹ پر ہی لگی رہیں۔ پولیس ے بال کافی بڑھ آئے تھے۔ سر کے بال بھی گردن کے نیچے تک پہنچ گئے تھے۔ میں نے
نہیں آئی تھی اور ٹرین چل پڑی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ پسنجر ٹرین تھی۔ پھر سٹیشن ہ نہ کروائی۔ ڈاڑھی مونچھوں کے بال ویسے ہی چھوٹے چھوٹے رہنے دیئے۔ سر کے
آگیا۔ یہاں سب مسافر اتر گئے۔ میں بھی اتر گیا۔ معلوم ہوا کہ سری پور کی طرف سے ا گردن کے نیچے تھوڑے تھوڑے کٹوا دیئے۔ وہیں منہ ہاتھ اور سر دھویا۔ پوری طرح
ایک گاڑی آئے گی وہ جبل پور جاتی ہے۔ ایک گھنٹے بعد یہ گاڑی آئی۔ یہ بھی پسنجر ٹرین ہ دم ہو کر سیلون سے باہر نکلا۔
تھی۔ میں اس میں سوار ہو گیا۔ اس گاڑی نے مجھے شام کے وقت جبل پور پہنچایا۔ جبل اسی بازار میں ایک ریستوران میں بیٹھ کر کھانا بھی کھایا۔ سگریٹ کا نیا پیکٹ خریدا اور
پور انڈیا کے بڑے صنعتی شہروں میں ایک شہر ہے۔ دلی بمبئی جیسا تو نہیں ہے مگر اس گریٹ سلگا کر جبل پور کے بارونق بازاروں کی سیر کو نکل کھڑا ہوا۔ دکانوں اور بازاروں کی
زمانے میں یہ کافی مشہور اور وسیع وعریض تھا۔ یہاں سے میں نے بھوپال جھانسی روٹ کی ں روشن ہو گئی تھیں۔ چلتے چلتے میں ایک ایسے بازار میں آگیا جہاں داخل ہوتے ہی
بجائے کان پور لکھنؤ اور سہارن پور کی طرف سے جالندھر جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ دلی کے احساس ہو گیا کہ یہ شہر کا بازار حسن ہے۔ ایک دو بنی سنوری عورتیں ایک دوسرے

سے چہلیں کرتی میرے قریب سے بھی گزریں۔ ذرا آگے گیا تو مکانوں سے طبلے گھنگھروؤں کی آواز بھی آئی۔ یہاں پولیس کے سپاہی بھی لاٹھیاں ہاتھ میں لئے گشت لگاتے نظر آئے۔ میں نے سوچا کہ یہاں سے نکل جانا چاہئے۔ خواہ مخواہ کسی مصیبت میں نہ پھنس جاؤں۔ یہ ابھی میں نے سوچا ہی تھا کہ ایک دم سے کسی کوٹھے پر پستول کے دو فائر ہوئے اور عورتوں کی چیخوں کی آوازیں آئیں۔ اس مکان پر سے دو آدمی دوڑتے ہوئے نیچے اترے۔ شور مچ گیا۔

”پکڑو پکڑو۔ بائی جی کا قتل ہو گیا“

دونوں آدمی میری طرف دوڑتے ہوئے آرہے تھے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں ریوالور تھا دوسرے کے ہاتھ میں چاقو تھا جسے وہ لہرا رہا تھا۔ وہاں بھگدڑ مچ گئی۔ میں بھی دوڑ پڑا۔ پولیس بھی پیچھے دوڑ پڑی۔ میں ایک گلی میں گھس گیا۔ میں نے پیچھے کر دیکھا کہ پولیس بھی میرے پیچھے اس گلی میں آگئی تھی۔

جس مصیبت سے میں ڈر رہا تھا وہ مصیبت مجھ پر نازل ہو گئی تھی۔ اب میرے پاس اس کے سوائے کوئی چارہ نہیں تھا کہ جیسے بھی ہو پولیس کی گرفت میں نہ آؤں۔ ورنہ میرا پولیس سے بچنا ناممکن تھا۔ گلی ایک طرف کو مڑی تو میں مڑتے ہی بائیں جانب جو پہلا کوٹھا نظر آیا اس کی ڈیوڑھی میں گھس گیا اور ڈیوڑھی کا دروازہ بند کر کے اندر سے کنڈی لگا دی۔

دوسرے لمحے پولیس بھی گلی میں پہنچ گئی۔ شاید کسی سپاہی نے مجھے اس مکان میں گھستے دیکھ لیا تھا۔ چونکہ میں بھی قاتل کے ساتھ یا ذرا آگے بھاگ اٹھا تھا اس لئے پولیس مجھے بھی قاتل ہی سمجھ رہی تھی۔ میں اگر پکڑا جاتا تو اپنی بے گناہی ثابت کر بھی دیتا تو میری ضمانت دینے والا وہاں کوئی نہیں تھا اور پولیس نے اس وقت تک مجھے نہیں چھوڑنا تھا جب تک دونوں قاتل گرفتار نہیں ہو جاتے تھے اور کچھ پتہ نہیں کہ اس وقت تک پولیس کو میرے بارے میں یہ علم ہو جاتا کہ میں تو کشمیری کمانڈو ہوں جس کے پیچھے بھارت کے تقریباً ہر شہر کی پولیس لگی ہے اور جس کا تقریباً ہر پولیس سٹیشن میں ریکارڈ اور تصویر موجود

ہے۔ باہر سے سپاہیوں نے زور زور سے دروازے پر ہاتھ مارے اور چلا کر کہا۔

”دروازہ کھولو۔ تم بچ کر نہیں جاسکتے اپنے آپ باہر نکل آؤ۔“

میں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلا گیا۔ اوپر ایک چھوٹا سا دالان تھا۔ اس تھڑے کے پاس نہانے کا حمام رکھا ہوا تھا۔ چوبارے کا دروازہ کھلا تھا۔ اندر چاندنی بچھی تھی۔ گاؤ تکئے لگے تھے اور ایک بنی سنوری عورت کھڑکی میں سے نیچے گلی میں جھانک کر کہہ رہی تھی۔

”کیوں دروازہ توڑ رہے ہو۔ دروازہ کھلا ہے۔“

کسی سپاہی نے کہا۔

”دروازہ اندر سے بند ہے بائی۔ اندر قاتل گھسا ہوا ہے۔“

اس عورت نے جو یقیناً طوائف تھی اور وہ کسی طوائف ہی کا کوٹھا تھا وہیں سے گردن موڑ بڑے رعب سے کہا۔

”یہاں کوئی قاتل واتل نہیں ہے۔ میں ابھی تمہارے بڑے تھانیدار کو بلا کر پوچھتی ہوں کہ تمہارے آدمی ہمیں دھندے کے وقت کیوں پریشان کرتے ہیں۔“

گلی میں سے ہی کسی سپاہی نے اونچی آواز میں کہا۔

”جائے گا کہاں۔ ہم بھی یہیں ہیں“

اس دوران میں دالان کی ایک طرف چھپ کر کھڑا تھا جہاں تھوڑا تھوڑا اندھیرا تھا۔ اندر چوبارے میں خوب روشنی ہو رہی تھی۔ کیونکہ بائی کے مجرے کا ٹائم شروع ہونے والا تھا۔ جہاں میں کھڑا تھا وہاں سے مجھے بنی سنوری عورت گلی والی کھڑکی پر جھکی نظر آرہی تھی وہ پیچھے ہٹ گئی اور اس نے کسی کو آواز دی۔

”کلو! ارے کلو! تو کہاں مر گیا ہے۔ نیچے جا کر دیکھ کوئی بدمعاش تو ڈیوڑھی میں نہیں چھپا ہوا؟“

جس آدمی کو بائی نے آواز دی تھی وہ غالباً اوپر والے چوبارے میں یا کسی دوسری کوٹھڑی میں ہو گا مگر اس کی آواز پر کلو نہ آیا بائی جی خود باہر دالان میں آگئی۔ سامنے ایک زینہ اوپر جاتا تھا۔ جیسے ہی وہ زینے کی طرف چلنے لگی اس کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ وہ

وہیں رک گئی۔ اس سے پہلے کہ اس کے حلق سے چیخ کی آواز نکلتی یا وہ شور مچاتی میں دوڑ کر اس کے پاس گیا اور اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنے ساتھ بھینچ لیا۔ میں نے ہاتھ جان بوجھ کر نرم رکھا تھا۔ کیونکہ میری اس عورت سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔ بلکہ الٹا مجھے اس وقت اس کی امداد کی ضرورت تھی۔ کیونکہ اب تک بازار حسن میں پولیس کی مزید نفری کا پہنچ جانا یقینی تھا اور ہو سکتا تھا تھانیدار خود سپاہیوں کو ساتھ لے کر بائی جی کے کوٹھے کی طرف آرہا ہو۔ کیونکہ جیسا کہ قرائن سے معلوم ہو رہا تھا کسی سپاہی نے مجھے بائی کے کوٹھے میں داخل ہوتے دیکھ لیا تھا بائی جی بڑی دبنگ قسم کی طوائف تھی اور چونکہ کسی خونی وغیرہ کے اس کے کوٹھے پر آجانے سے اس کی بدنامی ہوتی تھی اور اس کے دھندے پر برا اثر پڑتا تھا اس لئے اس نے پولیس کو وہاں سے بھگا دیا تھا۔ اور بہت ممکن تھا کہ وہ تھانیدار کو ماہانہ یا روزانہ رات کو کچھ رقم بھی بطور رشوت ادا کرتی ہو۔ اسی وجہ سے اس نے پولیس کو کھری کھری سنادی تھیں۔

ابھی تک وہ آدمی جس کو بائی جی نے کلو کہہ کر آواز دی تھی کسی طرف سے بھی نکل کر وہاں نہیں آیا تھا۔ میں اس کے آنے سے پہلے پہلے بائی جی کا اعتماد حاصل کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اپنا مضبوط ہاتھ بائی جی کے منہ پر رکھ کر اسے اپنے ساتھ بھینچ رکھا تھا۔ بائی جی میری گرفت سے نکلنے اور کسی کو آواز دینے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے اس کے کان کے قریب منہ لے جا کر کہا۔

"میں خونی نہیں ہو۔ اگر تم مسلمان ہو تو یقین کرو کہ میں بھی مسلمان ہو اور میں خدا کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں کہ میں نے کسی کا خون نہیں کیا۔ خون کرنے والے دو آدمی تھے جن کو بھاگتا دیکھ کر میں بھی بھاگا اور پولیس میرے پیچھے لگ گئی"

میں نے اس کے منہ پر دبایا ہوا ہاتھ ذرا سا ڈھیلا کر دیا۔ بائی جی نے ایک ہاتھ اوپر اٹھا کر ہلاتے ہوئے بند بند آواز میں کہا۔

"مجھے چھوڑ دو۔ میں کسی کو نہیں بتاؤں گی"

میں اس حقیقت سے بے خبر نہیں تھا کہ یہ طوائف عورت ہے۔ اس قسم کے

حالات میں اس پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے اسے دھمکی دی کہ میری جیب میں بھرا ہوا پستول موجود ہے۔ اگر تم نے کوئی غلط حرکت کی تو میں تمہیں گولی سے اڑا دوں گا۔ میں صرف یہاں تھوڑی دیر ٹھہروں گا۔ پھر نکل جاؤں گا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے عورت کو اپنے سے الگ کر دیا۔

دالان میں کمرے کی روشنی آرہی تھی۔ عورت نے سب سے پہلا کام مجھ سے الگ ہوتے ہی یہ کیا کہ ساڑھی کے پلو سے ہونٹوں کی سرخی کو ٹھیک کرنے لگی اور میری طرف گھور کر دیکھتے ہوئے بولی۔

"تم کون ہو؟ پہلے تمہیں کبھی نہیں دیکھا"

اتنے میں اوپر سے ایک بدمعاش ٹائپ کا آدمی بھی نیچے اتر آیا۔ اس نے مجھے دیکھا تو بائی سے پوچھا۔

"یہ کون ہے؟"

میں نے فوراً اپنی پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈال لیا۔ بائی کو یہ بتانے کے لئے کہ اگر اس نے کوئی غلط بات کی تو میں جیب سے پستول نکال کر دونوں کو بھون ڈالوں گا۔ اس نے اس آدمی سے کہا۔

"کوئی نہیں ہے۔ ایک پرانا ملنے والا ہے تم اوپر جا کر اس لڑکی سے رنگ رلیاں منا رہے تھے کیا؟ تمہیں معلوم نہیں دھندے کا ٹائم ہو رہا ہے۔ وہ تیار ہوئی ہے یا نہیں؟"

کلو نے ایک نگاہ مجھ پر ڈالی اور یہ کہہ کر نیچے اتر گیا

"ہاں تیار ہو گئی ہے۔ میں ٹھیکے پر جا رہا ہوں۔ ابھی آجاؤں گا۔"

جب وہ چلا گیا تو بائی جی نے جس کی جوانی گزر چکی تھی مگر بناؤ سنگھار کی وجہ سے ابھی تک اس میں تھوڑی بہت دلکشی نظر آرہی تھی زینے کے قریب جا کر اوپر آواز دی۔

"چھمیا جان! بہت ہو چکا بناؤ سنگھار اب نیچے اتر آؤ۔ ٹائم ہو چکا ہے"

بائی نے میری طرف گھور کر دیکھا اور کہا۔

"ایک طرف ہو کر بیٹھ جاؤ۔ یہیں سے اٹھ کر چلے جانا۔ زیادہ دیر مت بیٹھنا۔"

میں مجرے والے کمرے میں کونے میں بیٹھ گیا۔ اتنے میں کلو بھی آگیا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور بائی سے کہا۔

"یہ یہاں کس لئے بیٹھا ہے؟"

بائی نے کہا۔

"اسے بیٹھا رہنے دو۔ تھوڑی دیر میں چلا جائے گا۔"

سارنگی طبلے بجانے والے بھی آگئے اور ساز وغیرہ سر کرنے لگے۔ تھوڑی دیر میں چھمیا جان بھی آگئی۔ پہلی نظر میں ہی وہ مجھے طوائف نہ لگی۔ میں نے بڑی بڑی گانے بجانے والیاں دیکھی تھیں۔ اس لڑکی کے چہرے پر طوائفوں والی کوئی بات نہیں تھی۔ بلکہ ایک حیرانی سی تھی۔ اٹھارہ انیس سال کی سانولی سی دبلی پتلی سی لڑکی تھی۔ چہرے کے نقوش بڑے دلکش تھے۔ خوب بنی سنوری تھی۔ وہ بائی جی کے پاس گاؤں تکیے کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔ بائی نے اس کی بلائیں لیں اور کہا۔

"میں قربان جاؤں"

ایک نوکر پان دان اور تھالی لے کر آیا اور بائی جی کے آگے رکھ کر چلا گیا۔ بائی جی پان بنانے لگی۔ بائی جی نے گھنگھروؤں کی جوڑی چھمیا جان کے آگے کرتے ہوئے کہا۔

"لو بیٹی اسے پہن لو"

چھمیا جان نے کوئی حرکت نہ کی۔ بائی جی نے اس کی طرف گھور کر دیکھا اور ذرا سختی سے کہا۔

"پہن لو ناں"

چھمیا جان بادل نخواستہ پاؤں میں گھنگھرو باندھنے لگی۔ ایک بوڑھا پھولوں کے ہار بانس کی ڈنڈی پر لٹکائے آگیا اور چھمیا جان اور بائی جی کی تعریفوں کے پل باندھنے لگا۔ بائی جی نے کہا۔

"ادھر ہو کر بیٹھ جا سائیں"

اتنے میں ایک موٹی توند والا آدمی اپنے خوشامدیوں کے ساتھ آگیا۔ بائی جی نے اسے

جھک کر سلام کیا اور کہنی مار کر چھمیا جان کو بھی سلام ادب پیش کرنے کا اشارہ کیا۔

"سیٹھ جی! کیا پئیں گے؟ آپ کی مرضی کی ہر چیز موجود ہے۔"

کلو شراب کی بوتل اور کچھ گلاس لے آیا۔ وہاں شراب کا دور چلنے لگا۔ پھر مجرا شروع ہو گیا۔ چھمیا جان نے گانا شروع کیا۔ اس کی آواز سپاٹ تھی اور گانے کا انداز بتا رہا تھا کہ اسے گانا نہیں آتا اور وہ زبردستی گا رہی ہے۔ سیٹھ پانچ پانچ روپے کے نوٹ لٹانے لگا۔ اسی دوران بائی جی نے دو ایک بار میری طرف اس طرح دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ اب یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ مگر میں ابھی وہاں مزید کچھ دیر ٹھہرنا چاہتا تھا۔ مجھے شبہ تھا کہ بازار میں خون ہو گیا ہے اور قاتل کو پولیس نے اس کوٹھے پر آتے دیکھا ہے پولیس ضرور نیچے موجود ہو گی۔ میں کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ ویسے بھی مجھے کوئی جلدی نہیں تھی۔ میری گاڑی کے جبل پور ریلوے سٹیشن سے چلنے میں ابھی بہت وقت تھا۔ میں نے بائی جی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور پتلون کی جیب میں جو ہاتھ ڈالا ہوا تھا اسے ذرا ہلایا۔ جیسے اسے کہا کہ ریوالور میری جیب میں ہی ہے۔ ابھی میں یہاں کچھ دیر بیٹھوں گا۔ بائی جی نے منہ دوسری طرف کر لیا اور تماش بین سیٹھ کو پان لپیٹ کر پیش کیا۔ اتنے میں نیچے سے ایک اور تماش بین آگیا۔ سیٹھ نے اس کی طرف دیکھ کر بازو لہرا کر کہا۔

"آؤ آؤ دھرم چند۔ ارے تم کہاں رہ گئے تھے؟"

معلوم ہوا کہ وہ بھی سیٹھ کے حواریوں میں سے تھا۔ دھرم چند تماش بین سیٹھ کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔

"بائی جی! گلی میں بازار میں پولیس ہی پولیس ہے۔ کہتے ہیں کسی کا خون ہو گیا ہے۔"

میرے کان کھڑے ہو گئے۔ بائی جی نے ایک نگاہ مجھ پر ڈالی اور دھرم چند سے کہا۔

"سنا ہے شام کو بازار میں کوئی جھگڑا ہوا تھا۔ ہمیں کیا۔ فکر نہ کریں سیٹھ جی پولیس ہمارے کوٹھے کا رخ نہیں کر سکتی"

مجرا ہوتا رہا۔ اب میرے لئے اس کوٹھے سے نیچے اترنا خطرے کا باعث ہو سکتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ بائی جی علاقے کے تھانیدار کو ہر ماہ بھاری رقم ادا کرتی ہے جس کی وجہ

سے پولیس اس کے کوٹھے پر قاتل کی تلاش میں نہیں آئی تھی۔ اس اعتبار سے میں وہاں محفوظ تھا۔ میں نے سوچ لیا کہ میں کوئی دوسری گاڑی پکڑلوں گا لیکن ابھی کوٹھے سے نہیں اتروں گا۔ میرا پکڑا جانا یقینی تھا مجھے ایک دو سپاہیوں نے گلی میں گھستے دیکھ لیا تھا وہ مجھ ہی کو قاتل سمجھ رہے تھے۔ ظاہر خون کرنے والا یا والے تو پولیس کی گرفت میں نہیں آئے ہوں گے وہ تو فرار ہو چکے ہوں گے۔ ایک میں ہی رہ گیا تھا۔ پولیس مجھ ہی کو پکڑ کر اپنی خانہ پری کرنا چاہتی تھی۔ میری یہ پوزیشن تھی کہ خون میں نے نہیں کیا تھا لیکن ایک بار تھانے پہنچ گیا تو میری پرانی فائلیں کھل سکتی تھیں اور یہ مجھے کسی حال میں بھی گوارا نہیں تھا۔

چھمیا جان بیٹھے بیٹھے نرت کرنے کی بھونڈی سی کوشش کرتے ہوئے گا رہی تھی اور کبھی کبھی سب کی نظریں بچا کر میری طرف بھی دیکھ لیتی تھی۔ اس کی نظروں میں مجھے رحم طلبی اور حسرت انگیزی نظر آرہی تھی۔ خدا جانے وہ مجھے کیا کہنا چاہتی تھی۔ ساری محفل میں اسے میں ہی ایک ایسا شخص نظر آرہا تھا جو اس کے مجرے اور گانے سے بالکل بے تعلق کونے میں بیٹھا تھا۔ اور میں اس کے لئے اجنبی بھی تھا۔ کوئی ایک گھنٹے بعد تماش بین سیٹھ نشے میں لہراتا ہوا اپنے خوشامدیوں کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔

بائی جی! اب منی جان کے کوٹھے پر جائیں گے۔"

سیٹھ نے چھمیا جان کے گال کی چٹکی لی۔ چھمیا جان نے منہ نفرت سے دوسری طرف کرلیا۔ سیٹھ نے بہکی ہوئی آواز میں بائی جی سے کہا۔

"بائی جی! بات آج ہی پکی کرلو میں ایک ہزار اور دے دوں گا"

بائی جی نے کہا۔

"سیٹھ جی! آپ سلامت رہیں۔ مجھے پیسوں کا لالچ نہیں ہے۔ لڑکی کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ دو چار دن اور صبر کرلیں"

سیٹھ بولا۔

"ہائے ہائے۔ کہاں تک صبر کروں بائی جی چلو دھرم چند منی کے پاس چلتے ہیں منی

جان۔ منی جان کے پاس۔۔۔"

جب سارے تماش بین چلے گئے تو بائی جی جلدی جلدی دری پر بکھرے ہوئے نوٹ اکٹھے کرنے لگی۔ کلو اور سازندے بھی نوٹ اٹھا اٹھا کر بائی جی کو دینے لگے۔ میں خاموش بیٹھا یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ چھمیا جان بالکل معصوم سی گھریلو لڑکی لگ رہی تھی سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔ جیسے اسے وہاں کے ماحول سے کوئی تعلق نہ ہو۔ میرے بارے میں چونکہ بائی جی کلو کو یہ کہہ چکی تھی کہ یہ میرے ملنے والوں میں سے ہے اس لئے کلو بھی مجھے وہاں سے جانے کے لئے نہیں کہہ رہا تھا۔

بائی جی نوٹوں کو ابھی گن ہی رہی تھی کہ اچانک دو آدمی اندر آگئے۔ انہوں نے اندر آتے ہی خنجر نکال لئے۔ ایک پیچھے کھڑا رہا۔ دوسرے نے آگے بڑھ کر کلو کو جو بائی جی کا بدمعاش اور باڈی گارڈ تھا دبوچ لیا اور اس کی گردن پر خنجر رکھ کر بائی جی سے کہا۔

"بائی جی سارے نوٹ ادھر رکھ دو"

بائی جی زیادہ نہیں گھبرائی تھی۔ شاید اس قسم کی وارداتیں اس بازار کا معمول تھیں یا وہاں کے ماحول کا حصہ تھیں لیکن وہ نوٹوں سے بھرا ہوا رومال ڈاکوؤں کو پکڑاتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔ دوسرے ڈاکو نے آگے بڑھ کر بائی جی کو ایک طرف دھکا دے کر گرا دیا اور نوٹوں سے بھرا ہوا رومال اٹھا لیا۔ دوسرے ڈاکو نے کہا۔

"منگو! ارے اس چھمیا جان کو بھی اٹھا لے جاتے ہیں۔ نئی نویلی بازار میں آئی ہے۔ ابھی اس کی نتھ بھی نہیں اتری۔"

کمال کی بات یہ تھی کہ ابھی تک ان ڈاکوؤں میں سے کسی نے بھی میری طرف توجہ نہیں کی تھی۔ شاید وہ مجھے کوئی نشئی نوجوان سمجھ رہے تھے جو چرس پی کر کونے میں گھٹ ہو کر بیٹھا تھا۔ کلو بدمعاش بھی کوئی مدافعت نہیں کر رہا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ڈاکو چاہے سب کچھ لے جائیں مگر مجھے اپنی جان بچانی ہے۔ میں اپنی جان خطرے میں کیوں ڈالوں۔

جب دوسرے ڈاکو نے چھمیا جان کو بازو سے پکڑ کر دروازے کی طرف کھینچا تو لڑکی

کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"تجھے اللہ کا واسطہ ہے۔ مجھے کچھ نہ کہنا۔ میں کسی کی امانت ہوں۔"

خدا جانے یہ لڑکی کی رحم طلبی کا اثر تھا یا اس نے جس طرح سے اللہ کا نام لیا تھا اس کا اثر تھا۔ بس میرے اندر ایک بجلی سی لہرا گئی۔ ویسے بھی میں ایک تربیت یافتہ کمانڈو ہونے کی حیثیت سے ان سب پر بھاری تھا مگر اللہ کا نام سن کر میرے رگ و پے میں جیسے آسمانی بجلی چارج ہو گئی۔ میرا جسم فولاد کی طرح سخت ہو گیا۔ میں نے اپنی جگہ سے چیتے کی طرح چھلانگ لگائی اور سب سے پہلے اس ڈاکو پر جھپٹ کر پیچھے گرا دیا جس نے کلو کو خنجر کی نوک گردن پر رکھ کر پکڑ رکھا تھا۔ دوسرے ڈاکو نے چھمیا کو چھوڑ دیا اور پوری طاقت سے مجھ پر خنجر کا وار کیا۔ میرے لئے وہ اناڑی ہی تھا۔ اسے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ جب دشمن پر وار کیا جاتا ہے تو خنجر کو اوپر سے نہیں نیچے سے اوپر کی طرف لایا جاتا ہے۔ میں نے اس کا خنجر والا ہاتھ پکڑ کر ایسا جھٹکا دیا کہ اس کا سر زمین کے ساتھ بڑی زور سے ٹکرایا اور وہ وہیں بے ہوش ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے دوسرے ڈاکو کی گردن میں بازو ڈال کر اسے جکڑ لیا۔ میں نے اسے جھٹکا نہ دیا۔ میں اسے خوامخواہ ہلاک نہیں کرنا چاہتا تھا۔ صرف بے ہوش کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے اس کی گردن پر ایک جانب دباؤ ڈال دیا۔ ڈاکو کے جسم میں آکسیجن داخل ہونا بند ہو گئی۔ اور وہ چند سیکنڈ بعد بے ہوش ہو گیا۔ میں نے اسے بھی نیچے گرا دیا۔

بائی' اس کا باڈی گارڈ کلو اور چھمیا جان مجھے آنکھیں پھاڑے دیکھ رہے تھے۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں اتنی جلدی اور اتنی مہارت کے ساتھ دو خنجر سے مسلح ڈاکوؤں پر قابو ہی نہیں پالوں گا بلکہ انہیں بے ہوش کر کے پھینک دوں گا۔ بائی جی نے کلو سے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

کلو رے۔ ان کو کسی طرح کوٹھے پر سے لے جا۔ پولیس کو پتہ چل گیا تو بڑی بدنامی ہو گی۔ یہاں کوئی تماش بین نہیں آئے گا۔"

کلو بولا۔

"بائی جی! ان کو میں کہاں لے جاؤں؟"

بائی جی بولیں۔

"ارے! یہ کہیں مر تو نہیں گئے دیکھو تو کلو!"

میں نے بڑے اعتماد سے کہا۔

"نہیں۔ یہ مرے نہیں۔ صرف بے ہوش ہیں۔"

"ارے تمہیں کیا پتہ۔ ہائے ہائے۔ بازار میں پہلے ہی ایک خون ہو گیا ہوا ہے۔"

کلو نے جھک کر دونوں بے ہوش ڈاکوؤں کی نبضیں دیکھیں اور بولا۔

"بائی یہ زندہ ہیں"

"خدا کا واسطہ ان کو یہاں سے اٹھا۔ ایسا کرو۔ پچھلے دروازے سے لے جا کر انہیں گلی میں پھینک آؤ۔ گلی میں اس وقت کوئی نہیں ہو گا۔"

پھر میری طرف ہاتھ جوڑ کر بولی۔

"بھیا! تو نے ہمیں ڈاکوؤں سے تو بچا لیا ہے مگر دوسری مصیبت میں ڈال دیا ہے۔ اب کلو کے ساتھ انہیں اٹھا کر گلی میں لے جاؤ۔"

میں نے بائی جی سے کہا۔

"گھبراؤ مت۔ سب ٹھیک ہو جائے گا چلو کلو۔ تم اسے اٹھاؤ۔"

ایک بے ہوش ڈاکو کو میں نے اپنے کاندھے پر اٹھا لیا۔ دوسرے ڈاکو کو کلو نے اٹھا لیا۔ دالان میں سے ایک زینہ پچھلی گلی کو جاتا تھا۔ ہم زینے پر سے اتر کر عقبی گلی میں آ گئے۔ یہاں اندھیرا تھا۔ یہ بڑی تنگ سی گلی تھی اور اس طرف طوائفوں کے کوٹھوں کے پچھواڑے لگتے تھے۔ ہم نے دونوں بے ہوش ڈاکوؤں کو دو تین مکان آگے لے جا کر گلی میں ڈال دیا اور واپس آ گئے۔

بائی جی پریشانی کے عالم میں زینے کے اوپر دروازے میں ہی کھڑی تھی۔ ہمیں آتا دیکھا تو پیچھے ہٹ گئی۔ ہم کمرے میں آ گئے۔ بائی جی نے دروازے کو بند کر کے کنڈی لگا دی۔ چھمیا جان وہاں نہیں تھی۔ بائی جی نے اسے اوپر والے کمرے میں پہنچا دیا تھا۔ ہمیں

آتا دیکھ کر بائی جی نے اوپر والے کمرے کو جو زینہ جاتا تھا اس طرف منہ کر کے آواز دی۔

"چھمیا! اندر سے کنڈی لگا کر سو جاؤ اب دھندا نہیں ہو گا"

سازندے اس لڑائی مار کٹائی میں طبلے سارنگیاں وہیں چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ بائی جی نے کلو سے کہا۔

"میرے ساتھ آ۔ اس سے پہلے کہ ہم پر کوئی مصیبت آجائے میں تھانیدار کپور سے ابھی ملنا چاہتی ہوں"

کلو بولا۔

"بائی جی اس کے پاس کیوں جا رہی ہو۔ کوئی اور مصیبت نہ کھڑی ہو جائے"

بائی جی نے خدا جانے کیا سکیم سوچ رکھی تھی۔ اس نے کلو کو گالی دے کر کہا۔

"تو چلتا ہے کہ نہیں۔ آ میرے ساتھ"

پھر مجھ سے کہا۔

"بھیا! تم نے مجھ پر بڑا احسان کیا ہے۔ میں جانتی ہوں تم خود بھی یہاں کچھ دیر تک رہنا چاہتے ہو۔ بس تھوڑی دیر کے لئے جاؤں گی۔ تم اتنی دیر یہاں رکھوالی کرنا۔ مجھے تم ایسا بہادر رکھوالا کہیں نہیں مل سکتا"

میں نے دیوار پر لگے کلاک پر نگاہ ڈالی۔ ابھی رات کے سوا دس ہی بجے تھے۔ میری گاڑی کے چھوٹنے میں ابھی کافی دیر تھی۔ میں نے کہا۔

"میں یہاں بیٹھتا ہوں۔ مگر تم لوگ زیادہ دیر مت لگانا"

بائی جی نے ساڑھی کے اوپر شال اوڑھی اور کہا۔

"تم بھی ڈیوڑھی کا دروازہ اندر سے بند کر لینا کوئی تماش بین آئے تو دروازہ بالکل نہ کھولنا۔ خود ہی واپس چلا جائے گا۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے کمرے کی بتیاں بجھا دیں۔ صرف دالان والا بلب جلتا رہنے دیا۔ وہ یہ کہتی ہوئی سیڑھیاں اترنے لگی۔

"جو مصیبت مجھ پر کل نازل ہونے والی ہے میں اس کو آج ہی ختم کرنا چاہتی ہوں۔

تھانیدار کو میں اتنی رقم آخر کس لئے دیتی ہوں۔"

ڈیوڑھی والے دروازے پر پہنچ کر اس نے مجھے کہا۔

"بھیا! دروازے کو اندر سے کنڈی لگا لینا چاہے کوئی آجائے دروازہ مت کھولنا"

وہ دونوں باہر نکل گئے۔ میں نے دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی اور اوپر دالان میں آگیا۔ دالان میں بیٹھنے کی کوئی مناسب جگہ نہیں تھی۔ میں مجرے والے کمرے میں آکر تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ مجھے وقت گزارنے کے لئے اچھی جگہ مل گئی تھی۔ جن دو بدمعاشوں کو ہم بے ہوشی کی حالت میں پچھلی اندھیری گلی میں پھینک آئے تھے ان کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ انہیں کم از کم دو تین گھنٹے سے پہلے ہوش نہیں آئے گا۔ ہوش آ بھی گیا تو وہ کم از کم بائی جی کے کوٹھے کا رخ نہیں کریں گے اور پولیس کے پاس بھی رپورٹ درج کرانے نہیں جائیں گے۔ اس قسم کی وارداتیں کرنے والے کسی واردات میں مار کھانے کے بعد تھانے شکائت لے کر نہیں جایا کرتے بلکہ دوسری واردات کی تیاریاں شروع کر دیتے ہیں۔

میں نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر ایک سگریٹ سلگا لیا اور سوچنے لگا کہ مجھے زیادہ نہیں تو ایک گھنٹے تک وہاں سے نکل جانا چاہیے۔ اس علاقے میں زیادہ دیر ٹھہرنا بھی اب مناسب نہیں تھا۔ مجرے والے کمرے کی تمام بتیاں بجھی ہوئی تھیں۔ اندر اندھیرا تھا۔ دالان میں جو بلب جل رہا تھا صرف اس کی تھوڑی سی روشنی اندر آ رہی تھی۔ نیچے گلی میں سے کبھی کبھی کوئی آدمی گزر جاتا تھا۔ گلی کے کسی دوسرے مکان سے گانے بجانے کی ہلکی ہلکی آواز آ رہی تھی۔ لگتا تھا کہ کھڑکیاں بند کر کے اندر مجرا ہو رہا ہے۔ بائی جی کو گئے بمشکل دس منٹ گزرے ہوں گے کہ مجھے کسی کے قدموں کی آواز سنائی دی۔ میں تکیے سے ہٹ کر بیٹھ گیا۔ میں نے باہر دالان میں جھانک کر دیکھا۔ دالان کے کونے میں اوپر جانے والے زینے کا دروازہ صاف نظر آ رہا تھا۔ یہ دروازہ کھلا تھا۔ میں ادھر دیکھ ہی رہا تھا کہ چھمیا جان یعنی وہی شرمیلی اور حیرت زدہ مظلوم چہرے والی لڑکی دروازے پر نمودار ہوئی اور دوڑ کر میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ میں ذرا پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے معمولی

شلوار قمیص پہن رکھی تھی اور چادر بھی اوڑھی ہوئی تھی۔ چہرے کا میک اپ بھی صاف کر دیا تھا۔ وہ آتے ہی بولی۔

"کیا تم مسلمان ہو؟"

میں نے کہا۔

"ہاں۔ مسلمان ہوں۔ تم کیوں پوچھ رہی ہو؟ اور تم نیچے کس لئے آئی ہو؟"

اس نے چادر کی بکل میں سے ہاتھ باہر نکالا۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹی سی پاکٹ بک سائز کی کوئی کاپی تھی۔ کہنے لگی۔

"اس میں اللہ پاک کا کلام آیت الکرسی چھپی ہوئی ہے۔"

اور اس نے چھوٹے سائز کی کتاب کھول کر میری آنکھوں کے سامنے کر دی۔ صفحات پر آیات قرآنی چھپی ہوئی تھیں۔ میں نے کہا۔

"یہ تم کس لئے لے آئی ہو؟"

اس نے کہا۔

"میں اللہ کے پاک کلام کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میں ایک شریف گھر کی بیٹی ہوں اور ابھی تک میری عزت محفوظ ہے۔ یہ لوگ مجھے اغوا کر کے لے آئے ہیں۔ اس وقت اگر تم نے میری مدد نہ کی تو میری عزت' میرے ماں باپ کی عزت بازار میں نیلام ہو جائے گی۔ رات جب میں نیچے آئی تھی تو اللہ سے گڑگڑا کر دعا مانگ کر آئی تھی کہ اے اللہ پاک تو دلوں کے حال جانتا ہے۔ مجھے یہاں سے نکال دے۔ اللہ نے میری دعا قبول کی اور تمہیں یہاں بھیج دیا۔"

میں نے پوچھا۔

"تم کیا چاہتی ہو؟"

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کہنے لگی۔

"اگر تم سچے مسلمان ہو تو تمہیں اللہ کے پاک کلام کا واسطہ دیتی ہوں کہ مجھے ابھی اسی وقت یہاں سے نکال کر لے چلو اگر تم نے میری مدد نہ کی تو حشر کے دن میں تمہارا

دامن پکڑ کر خدا سے کہوں گی کہ یہ وہ شخص ہے جس کی بزدلی کی وجہ سے میری اور میرے خاندان کی عزت اور ناموس برباد ہوئی۔"

میں نے ایک لمحے کے لئے اس لڑکی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے اور سیدھے ہاتھ میں آیت الکرسی والی کاپی یا کتاب تھی۔ میں نے اس کے ہاتھ سے آیت الکرسی لے کر اسے چوم کر آنکھوں سے لگایا اور اسے واپس دیتے ہوئے کہا۔

"اسے اوپر والے کمرے میں جہاں سے اٹھا کر لائی ہو وہیں رکھ کر نیچے آ جاؤ۔ میں تمہیں یہاں سے نکال کر لے چلوں گا۔"

اس کے مظلوم چہرے پر خوشی کی لہر سی دوڑ گئی۔ اٹھی اور دوڑ کر دالان پار کیا۔ اوپر جا کر کتاب کسی محفوظ جگہ پر رکھی اور الٹے قدموں واپس آ گئی۔ میں نے سوچا وغیرہ کچھ نہیں تھا۔ یہ بھی نہیں پوچھا تھا کہ اس نے جانا کہاں ہے۔ بس میرے دل نے کہا کہ اس مظلوم لڑکی کی مدد کروں۔ اسے گناہ کی دلدل سے نکال کر لے جاؤں۔ اور میں نے اسے نکال لے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اگر میں وہاں سوچنا شروع کرتا تو میرا دماغ سو طرح سے مجھے دلیلیں دے دے کر اس کام سے روک لیتا۔ فیصلہ میرے دل نے کیا تھا۔ میں دماغ کو بیچ میں نہیں لانا چاہتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ دماغ مجھے یہ کام نہیں کرنے دے گا۔ اور یہ کام میں اللہ کے بھروسے کر گزرنا چاہتا تھا۔ جب وہ میرے پاس آئی تو میں نے اس سے کہا۔

"میں ڈیوڑھی والی گلی کی طرف سے نہیں نکلنا چاہتا۔ کیا کوئی دوسرا راستہ ہے؟"

وہ بولی۔

"میرے ساتھ آؤ"

دالان کے کونے میں ایک دروازہ لگا ہوا تھا۔ وہ غسل خانہ تھا۔ وہ مجھے اس غسل خانے میں لے گئی۔ غسل خانے میں ایک اور چھوٹا دروازہ تھا وہ آگے آگے تھی۔ دروازے کی دوسری طرف چھوٹا سا زینہ نیچے جاتا تھا۔ ہم زینہ اتر کر ایک ایسی گلی میں آ گئے جو بہت ہی تنگ اور اندھیری تھی۔ وہ بولی۔

"میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ"

اس گلی میں سے ایک اور تنگ و تاریک راستہ دوسری گلی کو جاتا تھا۔ اس گلی میں بھی اندھیرا تھا۔ یہاں سے ہم ایک اور تنگ گلی میں سے ہوتے ہوئے باہر نکلے تو سامنے چوک آگیا۔ لڑکی میری راہ نمائی کر رہی تھی۔ مجھے ان بازاروں کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔ اتنا ضرور معلوم تھا کہ یہ علاقہ جبل پور کے ریلوے سٹیشن سے زیادہ دور نہیں ہے۔ لڑکی نے ایک خالی موٹر رکشا رکوایا۔ ہم اس میں بیٹھ گئے۔ لڑکی نے رکشے والے کو ریلوے سٹیشن کی طرف چلنے کو کہا۔ سٹیشن تک ہم نے کوئی بات نہ کی۔ میرے دل میں یہ خیال بار بار آرہا تھا کہ بائی جی اور کلو کو جب لڑکی کے فرار کا پتہ چلا تو ان کے آدمی لاریوں کے اڈے اور ریلوے سٹیشن کی طرف نکل پڑیں گے۔ ریلوے سٹیشن پر رکشے سے اترنے کے بعد میں نے لڑکی سے کہا۔

"وہ لوگ ہماری تلاش میں سٹیشن پر ضرور آئیں گے۔"

لڑکی بولی۔

"ہمیں انبالے کی طرف جانے والی جو گاڑی ملے گی اس میں بیٹھ کر یہاں سے نکل جائیں گے۔ لاری اڈے پر بائی جی کے آدمی پہلے سے موجود ہوتے ہیں۔"

میں نے لڑکی کو سٹیشن کے اندر ایک طرف بٹھا دیا اور خود انکوائری والی کھڑکی پر آکر معلوم کیا کہ پنجاب کو اس وقت کون سی گاڑی جائے گی۔ معلوم ہوا کہ پنجاب کو رات ایک بجے کے بعد ٹرین جائے گی۔ مگر اس وقت کانپور کو ایک گاڑی جانے والی تھی۔ میں نے فوراً کانپور کے دو ٹکٹ لئے اور جلدی جلدی خود بھی چلتا اور لڑکی کو بھی چلاتا اس پلیٹ فارم پر آگیا جہاں کانپور جانے والی گاڑی تیار کھڑی تھی۔

یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ہمیں گاڑی تیار مل گئی۔ یوں ہم چند لمحوں کے بعد جبل پور سے نکل گئے۔ ہم تھرڈ کلاس کے مردانہ ڈبے میں بیٹھے تھے۔ لڑکی نے چادر سے سر اور آدھا چہرہ ڈھانپ رکھا تھا۔ ڈبے میں زیادہ تر یوپی کے دیہات کے لوگ سوار تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں۔ ان کے بچے بھی تھے۔ ٹرین جبل پور سے دور نکل گئی تو میں نے لڑکی سے پوچھا۔

"کیا تمہیں انبالے جانا ہے؟"

اس نے کہا۔

"کسی سٹیشن پر گاڑی کھڑی ہوگی تو بتاؤں گی"

چلتی ٹرین کے شور میں ویسے بھی ہم ایک دوسرے سے اچھی طرح اور راز داری سے بات نہیں کر سکتے تھے۔ ہمیں تھوڑا اونچا بولنا پڑتا تھا۔ میں نے اس کے بعد کوئی بات نہ کی۔ کوئی ایک گھنٹے بعد ایک سٹیشن پر گاڑی رکی۔ کوئی بڑا سٹیشن تھا۔ نام یاد نہیں رہا۔ ہمارے ڈبے میں سے کافی سواریاں اتر گئیں۔ رات کا وقت تھا۔ وہاں سے دو ایک سواریاں ہی چڑھیں۔ ڈبے میں رش بہت کم ہو گیا تھا۔ ہم کھڑکی والی سیٹوں پر بیٹھتے تھے۔ ہمارے دائیں بائیں کوئی مسافر نہیں تھا۔ لڑکی کہنے لگی۔

"ہاں۔ میں انبالے جاؤں گی۔ انبالے میں ہی ہمارا گھر ہے۔"

میں نے کھڑکی میں سے باہر پلیٹ فارم پر دیکھ رہا تھا۔ بلکہ ماحول کا جائزہ لے رہا تھا کہ کہیں میرے پیچھے تو کوئی خفیہ پولیس والا نہیں لگا ہوا۔ مگر ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ میں نے لڑکی سے یہ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہ کی کہ اس کو بائی جی کے آدمیوں نے کیسے اور کہاں سے اغوا کر لیا تھا اور یہ کہ اس کے کتنے بہن بھائی ہیں۔ والد صاحب کیا کرتے ہیں۔ وہ کیسے ان لوگوں کے پھندے میں پھنس گئی۔ اتنا مجھے یقین ہو گیا تھا کہ لڑکی شریف گھرانے کی ہے اور اسے اس کے ماں باپ تک پہنچانا میرا فرض ہے۔ اس نے خود ہی کہا۔

"میرے ابو کی انبالے چھاؤنی میں کریانے کی دکان ہے۔ میرا کوئی بھائی نہیں۔ ہم دو بہنیں ہیں۔ بڑی بہن چھاؤنی کے ایک سکول میں استانی ہے۔ اس کی اگلے مہینے شادی ہونے والی ہے۔ پندرہ بیس روز پہلے کی بات ہے۔ میں انبالے شہر میں اپنی ایک سہیلی کے ہاں مہندی کی تقریب میں گئی ہوئی تھی۔ مجھے وہاں رات ہو گئی تو اس ڈر سے کہ امی ابو ناراض ہوں گے کہ میں نے اتنی دیر کیوں لگا دی رات کے وقت اکیلی ہی مہندی والے گھر سے نکل پڑی۔ میں اس شہر میں پیدا ہوئی تھی۔ یہ میرے لئے کوئی اجنبی شہر نہیں تھا۔ بازار میں آکر ایک خالی رکشا لینے لگی تو اچانک پیچھے سے ایک کار آکر میرے قریب رکی

اس میں سے تین آدمی نکلے۔ ان کے ہاتھوں میں خنجر اور پستول تھے۔ انہوں نے آتے ہی مجھے دبوچ کر گاڑی میں ڈالا اور میرے منہ میں کپڑا ٹھونس کر نیچے ڈال دیا۔ ایک آدمی نے میری ناک پر گیلا رومال رکھ کر زور سے دبا دیا۔ اس میں بے ہوشی کی دوائی تھی۔ میں بے ہوش ہو گئی۔ جب ہوش آیا تو میں اسی گاڑی میں تھی اور گاڑی کسی میدان میں دوڑی جا رہی تھی۔ بہرحال اس طرح میں بائی جی کے کوٹھے پر پہنچ گئی۔ آگے جو کچھ ہوا وہ تمہیں معلوم ہی ہے بائی جی نے میری ناک میں جو چھید تھا اس میں نتھنی ڈال دی۔ اب وہ کسی موٹی آسامی کے پاس میرا سودا کرنا چاہتی تھی میں آیت الکرسی والی چھوٹی سی کاپی ہمیشہ اپنے ساتھ رکھا کرتی تھی۔ اس وقت بھی یہ کاپی میرے ساتھ ہی تھی۔ میں راتوں کو خدا کے حضور سجدہ ریز ہو کر آیت الکرسی پڑھتی اور خدا سے دعائیں مانگتی کہ وہ میری عزت بچا لے اور مجھے یہاں سے نکال کر میرے گھر پہنچا دے۔ خدا نے میری فریاد سن لی اور تمہیں میری مدد کے لئے بھیج دیا۔ میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھول سکوں گی۔"

"تمہارا نام کیا ہے؟"

میں نے کھڑکی کے باہر دیکھتے ہوئے پوچھا

لڑکی نے کہا۔

"میرا نام نور جہاں ہے"

جبل پور سے کانپور تک بڑا لمبا سفر تھا۔ دوسرے دن رات کے وقت گاڑی الہ آباد سے ہوتی ہوئی کانپور پہنچی۔ یہاں سے میں نے دو ٹکٹ انبالے کے لئے اور دوسری گاڑی پکڑی جو لکھنؤ کی طرف نہیں جاتی تھی بلکہ کانپور سے فتح گڑھ' بدایو' بریلی' مراد آباد' نگیجہ اور سہارن پور سے ہوتی ہوئی انبالے اور اس سے آگے مشرقی پنجاب کو جاتی تھی۔ مجھے نور جہاں کو انبالے کینٹ میں اس کے گھر پہنچا کر آگے جالندھر اور جالندھر سے جموں کی طرف نکل جانا تھا۔ یہ بھی بڑا لمبا روٹ تھا۔ ٹرین کانپور سے آدھی رات کے بعد روانہ ہوئی۔ دوسرا دن بھی سفر میں گزر گیا۔ رات آ گئی۔ رات کے گیارہ ساڑھے گیارہ بجے کہیں انبالہ کینٹ کا سٹیشن آیا۔ ہم ٹرین سے اتر کر سٹیشن کے باہر آ گئے۔ رات کے

وقت ہر طرف خاموشی تھی۔ دو تین موٹر رکشا کھڑے تھے۔ نور جہاں نے رکشا والے کو اپنے محلے کا نام بتایا اور ہمارا رکشا روانہ ہو گیا۔

میں سوچ رہا تھا کہ آدھی رات کو اچانک اپنی بیٹی کو سامنے دیکھ کر اس کے ماں باپ اور بڑی بہن کس قدر حیران اور خوش ہو گی۔ انبالہ چھاؤنی کے ایک محلے کے باہر نور جہاں نے رکشا رکوا دیا۔ کہنے لگی۔

"اس گلی میں ہمارا گھر ہے"

اور اس کی آواز بھرا گئی۔ وہ رو رہی تھی۔ معمولی بوسیدہ سا مکان تھا۔ نور جہاں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ تین چار بار دروازہ کھٹکھٹانے کے بعد اوپر والی منزل کی کھڑکی میں سے کسی مرد نے نیند بھری آواز میں پوچھا۔

"کون ہے بھائی"

نور جہاں نے روتے ہوئے کہا۔

"ابا میں ہوں نور جہاں"

اور نور جہاں کی ہچکی بندھ گئی۔ اوپر سے اس کے والد نے منہ پیچھے کر کے کہا۔

"نفیسہ بانو۔ ارے بیٹی آ گئی ہے۔"

دروازہ کھل گیا۔ وہاں ایک کہرام سا مچ گیا۔ یہ غم کا نہیں خوشی کا کہرام تھا۔ سب رو رہے تھے۔ نور جہاں کو گلے لگا لگا کر رو رہے تھے۔ میں چھوٹے سے کمرے میں ایک چارپائی پر بیٹھ گیا۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ ان کی بچی کو میں گناہ کے جہنم سے نکال کر لایا ہوں تو اس کے والد نے مجھے گلے لگا لیا۔ ماں میرا ماتھا چومنے اور دعائیں دینے لگی۔ میرے آرام کے لئے مکان کی بیٹھک کھول دی گئی۔ یہاں ایک پرانا پلنگ بچھا تھا۔ یہ شمالی ہند یعنی آج کے بھارتی اتر پردیش کا علاقہ تھا اور یہاں رات کو سردی پڑتی تھی۔ میں انہی کپڑوں میں کمبل اوڑھ کر لیٹ گیا۔ سوچنے لگا مجھے صبح ہونے سے پہلے جالندھر جانے والی گاڑی یا کوئی لاری پکڑنی چاہیے میں دن کی روشنی میں وہاں سے نہیں نکلنا چاہتا تھا۔ لیکن جب ایک بار سو گیا تو آنکھ اس وقت کھلی جب دن کے دس بج رہے تھے۔

نور جہاں کا والد میرے لئے ناشتہ لے کر آگیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ جالندھر کی طرف وہاں سے گاڑی کس وقت جاتی ہے۔ اس نے بتایا کہ ہوڑہ ایکسپریس دن کے سوا ایک بجے انبالے کینٹ پہنچتی ہے۔ اور وہی ٹرین آگے جالندھر امرتسر کو جاتی ہے۔ نور جہاں کے والد نے مجھ سے پوچھا کہ میں جالندھر کس کے پاس جا رہا ہوں۔ میں نے کہہ دیا کہ ایک دوست سے ملنے جا رہا ہوں۔ وہ کہنے لگا۔

"بیٹا! تم پنجابی مسلمان ہو۔ جالندھر میں شاید ہی کوئی پنجابی مسلمان رہتا ہو کیا تمہارا جبل پور میں کوئی کاروبار ہے"؟

میں نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔

"بس چھوٹا موٹا کاروبار ہے۔ اچھا اب میں چلتا ہوں"

"ارے بیٹا! ابھی تو گاڑی کے آنے میں بہت وقت ہے۔ سٹیشن پر کہاں جا کر بیٹھو گے"

میں نے کہا۔

"شکریہ! مجھے انبالے چھاؤنی میں ضرورت کی دو چار چیزیں بھی خریدنی ہیں۔"

میرے جانے کا سن کر نور جہاں۔ اس کی بڑی بہن نفیسہ اور اس کی والدہ بھی بیٹھک میں آگئی۔ سب میرا شکریہ ادا کرنے لگے۔ نور جہاں نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔

"بھیا! ہم لوگ تمہارے احسان کو ساری زندگی یاد رکھیں گے۔"

بہرحال میں وہاں سے نکل کر انبالہ چھاؤنی کے سٹیشن کی طرف چل پڑا۔ بازار میں آکر ٹیکسی پکڑی اور ریلوے سٹیشن پہنچ گیا۔ سٹیشن پر زیادہ لوگ نہیں تھے۔ میں نے جالندھر کا ٹکٹ خرید کر جیب میں رکھ لیا اور پلیٹ فارم پر بیٹھنے کی بجائے سیکنڈ کلاس کے ریفرشمنٹ روم میں آکر بیٹھ گیا۔ بڑا خاموش خاموش ماحول تھا۔ بیرے کو چائے کا آرڈر دیا اور سگریٹ سلگا کر سرسری نظر سے ماحول کا جائزہ لیا۔ دو تین میزوں پر کچھ خوش پوش لوگ بیٹھے کھانے پینے اور باتیں کرنے میں مصروف تھے۔ کونے میں ایک سکھ فیملی بیٹھی تھی۔ سکھ کوئی فوجی تھا اور یونی فارم میں تھا۔ ساتھ اس کی بیوی اور ایک چھوٹی بچی تھی۔

ہی سکھ اخبار پڑھ رہا تھا۔ میں نے کئی روز سے بھارت کا کوئی اخبار نہیں پڑھا تھا۔ سوچا ائے پی لوں پلیٹ فارم کے سٹال سے اخبار لے کر پڑھوں گا۔ اخبار میں کشمیر کے محاذ کے ے میں خبریں چھپتی رہتی تھیں۔ ان سے کشمیری حریت پسند مجاہدوں کی سرگرمیوں سے علق تازہ صورت حال معلوم ہو جاتی تھی۔ میرا حلیہ یہ تھا کہ ڈاڑھی مونچھیں بڑھی ہوئی یں تھیں۔ چھوٹے چھوٹے ترشے ہوئے بال تھے ڈاڑھی مونچھوں کے۔ سر کے بال لمبے یں تھے گردن سے ذرا نیچے تک آتے تھے۔ قمیض جیکٹ اور پتلون صحیح حالت میں ی۔ برہان پور اور نرسنگ پور کے علاقے سے جب میں پولیس انسپکٹر کو موت کی نیند سلا ر فرار ہوا تھا تو میرا حلیہ تقریباً یہی تھا۔ اس سے پہلے کے کمانڈو ایکشن میں میری ڈاڑھی نچھیں اور سر کے بال بڑھے ہوئے تھے۔ میں نے جبل پور آکر بال بھی چھوٹے کروا لئے ھے اور کپڑے بھی بدل لئے تھے۔

گاڑی آنے میں ابھی دیر تھی۔ میں نے کھانا بھی ریفرشمنٹ روم میں ہی منگوا لیا۔ طرح وہاں بیٹھے بیٹھے کافی وقت گزر گیا۔ اس دوران سکھ فوجی اپنی فیملی کے ساتھ اٹھ ر جا چکا تھا۔ جب وہ میرے قریب سے گزرا تھا تو میں نے ہاتھ سے چمچ نیچے گرا دی تھی ر اسے اٹھانے کے لئے جھک گیا تھا۔ اس طرح میں نے اپنا چہرہ اس سے چھپا لیا تھا۔ کوئی طرے والی بات نہیں تھی لیکن احتیاط کے طور پر نے ایسا کیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ارت کے اور خاص طور پر مشرقی پنجاب کے پولیس سٹیشنوں پر یقیناً میری تصویر بطور ک پاکستانی مفرور جاسوس کے موجود تھی اور اس علاقے میں سے گزرتے ہوئے میں اص طور پر احتیاط سے کام لے رہا تھا۔

اتنے میں باہر پلیٹ فارم پر مسافروں کی نقل و حرکت کچھ تیز ہو گئی اور آوازیں بھی نے لگیں۔ معلوم ہوا کوئی گاڑی آ رہی ہے۔ میں نے بیرے کو بلا کر پوچھا کہ کون سی اڑی آ رہی ہے۔ اس نے بتایا کہ کلکتہ سے امرتسر جانے والی ہوڑہ میل آ رہی ہے۔ میں نے جلدی سے بل ادا کیا اور پلیٹ فارم پر نکل آیا۔ اس وقت مجھے سٹال سے اخبار خریدنا ل یاد نہ رہا۔ اگر یاد رہتا اور میں سٹال پر سے انگریزی یا ہندی کا کوئی اخبار خرید کر دیکھ

فوجی سکھ اخبار پڑھ رہا تھا۔ میں نے کئی روز سے بھارت کا کوئی اخبار نہیں پڑھا تھا۔ سوچا چائے پی لوں پلیٹ فارم کے سٹال سے اخبار لے کر پڑھوں گا۔ اخبار میں کشمیر کے محاذ کے بارے میں خبریں چھپتی رہتی تھیں۔ ان سے کشمیری حریت پسند مجاہدوں کی سرگرمیوں سے متعلق تازہ صورت حال معلوم ہو جاتی تھی۔ میرا حلیہ یہ تھا کہ ڈاڑھی مونچھیں بڑھی ہوئی نہیں تھیں۔ چھوٹے چھوٹے ترشے ہوئے بال تھے ڈاڑھی مونچھوں کے۔ سر کے بال لمبے نہیں تھے گردن سے ذرا نیچے تک آتے تھے۔ قمیض جیکٹ اور پتلون صحیح حالت میں تھی۔ برہان پور اور نرسنگ پور کے علاقے سے جب میں پولیس انسپکٹر کو موت کی نیند سلا کر فرار ہوا تھا تو میرا حلیہ تقریباً یہی تھا۔ اس سے پہلے کے کمانڈو ایکشن میں میری ڈاڑھی مونچھیں اور سر کے بال بڑھے ہوئے تھے۔ میں نے جبل پور آ کر بال بھی چھوٹے کروا لئے تھے اور کپڑے بھی بدل لئے تھے۔

گاڑی آنے میں ابھی دیر تھی۔ میں نے کھانا بھی ریفرشمنٹ روم میں ہی منگوا لیا۔ اس طرح وہاں بیٹھے بیٹھے کافی وقت گزر گیا۔ اس دوران سکھ فوجی اپنی فیملی کے ساتھ اٹھ کر جا چکا تھا۔ جب وہ میرے قریب سے گزرا تھا تو میں نے ہاتھ سے چمچ نیچے گرا دی تھی اور اسے اٹھانے کے لئے جھک گیا تھا۔ اس طرح میں نے اپنا چہرہ اس سے چھپا لیا تھا۔ کوئی خطرے والی بات نہیں تھی لیکن احتیاط کے طور پر نے ایسا کیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بھارت کے اور خاص طور پر مشرقی پنجاب کے پولیس سٹیشنوں پر یقیناً میری تصویر بطور پاکستانی مفرور جاسوس کے موجود تھی اور اس علاقے میں سے گزرتے ہوئے میں خاص طور پر احتیاط سے کام لے رہا تھا۔

اتنے میں باہر پلیٹ فارم پر مسافروں کی نقل و حرکت کچھ تیز ہو گئی اور آوازیں بھی آنے لگیں۔ معلوم ہوا کوئی گاڑی آ رہی ہے۔ میں نے بیرے کو بلا کر پوچھا کہ کون سی گاڑی آ رہی ہے۔ اس نے بتایا کہ کلکتہ سے امرتسر جانے والی ہوڑہ میل آ رہی ہے۔ میں نے جلدی سے بل ادا کیا اور پلیٹ فارم پر نکل آیا۔ اس وقت مجھے سٹال سے اخبار خریدنا بالکل یاد نہ رہا۔ اگر یاد رہتا اور میں سٹال پر سے انگریزی یا ہندی کا کوئی اخبار خرید کر دیکھ

لیتا تو اس بھیانک مصیبت سے بچ سکتا تھا جو مجھ پر آگے جا کر بلائے ناگہانی کی طرح نازل ہونے والی تھی۔ ٹرین جلدی آ گئی تھی۔ نور جہاں کے والد کو ہوڑہ میل کے صحیح ٹائم کا علم نہیں تھا۔ گاڑی پلیٹ فارم میں داخل ہو چکی تھی جب میں ریفرشمنٹ روم سے نکل کر باہر آیا تھا۔ مسافروں کا کافی رش تھا۔ سکھ مسافروں کی تعداد زیادہ تھی۔ ٹرین آ کر رکی تو مجھے بھی تھرڈ کلاس کے ایک ڈبے میں جگہ مل گئی۔ کسی نہ کسی طرح مجھے جالندھر پہنچنا تھا تا کہ رات ہونے سے پہلے پہلے جالندھر سے جموں جانے والی لاری پکڑ سکوں۔ ہوڑہ میل کچھ دیر ٹھہرنے کے بعد چل پڑی۔

انبالے کے بعد لدھیانے کے سٹیشن پر گاڑی رکی تو میں ڈبے سے اتر پڑا۔ ڈبے میں بے حد رش تھا اور میں ان مسافروں میں بالکل پھنس کر بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے سوچا کہ کسی دوسرے ڈبے میں جا کر بیٹھنا چاہیے اس طرح بیٹھے بیٹھے تو میری ٹانگیں اکڑ جائیں گی۔

پلیٹ فارم پر اترا تو دیکھا کہ ٹرین کے ایک ڈبے میں ڈاک کے بڑے بڑے تھیلے لادے رہے تھے۔ سامنے اخبار کا سٹال تھا۔ سوچا کوئی اخبار لے کر مقبوضہ کشمیر کے بارے تازہ ترین صورت حال معلوم کرنی چاہیے۔ سٹال پر دلی سے شائع ہونے والے اردو کے دو ایک اخبار اور ہندی گورمکھی اور انگریزی کے اخبار پڑے تھے۔ میں نے انگریزی کا ایک اخبار اٹھا کر اس کا ورق الٹا تو میرا اوپر کا سانس اوپر رہ گیا۔ اخبار میں میری تصویر کے ساتھ اشتہار چھپا ہوا تھا جس میں میری گرفتاری کے لئے انعام کا اعلان بھی تھا۔ میں نے اخبار وہیں تہہ کر کے رکھ دیا۔ دوسرا ہندی کا اخبار کھول کر دیکھا۔ اس میں بھی میری تصویر چھپی ہوئی تھی۔ یہ تصویر میرے بالکل موجودہ حلیے کی تھی اور مجھے فوراً پہچانا جا سکتا تھا۔

میں چپکے سے وہاں سے کھسک کر ٹرین کی طرف بڑھا کہ کسی نے پیچھے سے مجھے آواز دی۔

”او بابو۔ ذرا ادھر دیکھو“

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک سکھ فوجی مجھے گھور کر دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں اخبار تھا۔ اس نے اخبار میں میری تصویر دیکھ لی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کا ہاتھ اپنی پیٹی میں لگے ہوئے ریوالور کی طرف بڑھا۔

لیتا تو اس بھیانک مصیبت سے بچ سکتا تھا جو مجھ پر آگے جا کر بلائے ناگہانی کی طرح نازل ہونے والی تھی۔ ٹرین جلدی آ گئی تھی۔ نور جہاں کے والد کو ہوڑہ میل کے صحیح ٹائم کا علم نہیں تھا۔ گاڑی پلیٹ فارم میں داخل ہو چکی تھی جب میں ریفرشمنٹ روم سے نکل کر باہر آیا تھا۔ مسافروں کا کافی رش تھا۔ سکھ مسافروں کی تعداد زیادہ تھی۔ ٹرین آ کر رکی تو مجھے بھی تھرڈ کلاس کے ایک ڈبے میں جگہ مل گئی۔ کسی نہ کسی طرح مجھے جالندھر پہنچنا تھا تا کہ رات ہونے سے پہلے پہلے جالندھر سے جموں جانے والی لاری پکڑ سکوں۔ ہوڑہ میل کچھ دیر ٹھہرنے کے بعد چل پڑی۔

انبالے کے بعد لدھیانے کے سٹیشن پر گاڑی رکی تو میں ڈبے سے اتر پڑا۔ ڈبے میں بے حد رش تھا اور میں ان مسافروں میں بالکل پھنس کر بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے سوچا کہ کسی دوسرے ڈبے میں جا کر بیٹھنا چاہیے اس طرح بیٹھے بیٹھے تو میری ٹانگیں اکڑ جائیں گی۔ پلیٹ فارم پر اترا تو دیکھا کہ ٹرین کے ایک ڈبے میں ڈاک کے بڑے بڑے تھیلے لادے جا رہے تھے۔ سامنے اخبار کا سٹال تھا۔ سوچا کوئی اخبار لے کر مقبوضہ کشمیر کے بارے میں تازہ ترین صورت حال معلوم کرنی چاہیے۔ سٹال پر دلی سے شائع ہونے والے اردو کے دو ایک اخبار اور ہندی گورمکھی اور انگریزی کے اخبار پڑے تھے۔ میں نے انگریزی کا ایک اخبار اٹھا کر اس کا ورق الٹا تو میرا اوپر کا سانس اوپر رہ گیا۔ اخبار میں میری تصویر کے ساتھ اشتہار چھپا ہوا تھا جس میں میری گرفتاری کے لئے انعام کا اعلان بھی تھا۔ میں نے اخبار وہیں تہہ کر کے رکھ دیا۔ دوسرا ہندی کا اخبار کھول کر دیکھا۔ اس میں بھی میری تصویر چھپی ہوئی تھی۔ یہ تصویر میرے بالکل موجوں حلیے کی تھی اور مجھے فوراً پہچانا جا سکتا تھا میں چپکے سے وہاں سے کھسک کر ٹرین کی طرف بڑھا کہ کسی نے پیچھے سے مجھے آواز دی۔

"او بابو۔ ذرا ادھر دیکھو"

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک سکھ فوجی مجھے گھور کر دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں اخبار تھا۔ اس نے اخبار میں میری تصویر دیکھ لی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کا ہاتھ اپنی بیلٹ میں لگے ہوئے ریوالور کی طرف بڑھا۔

"خبردار! یہیں کھڑے رہو۔ بھاگے تو گولی مار دوں گا۔"

لیکن میں وہاں کھڑا نہیں رہ سکتا تھا۔ مجھے وہاں سے بھاگنا تھا اور جس طرف منہ اٹھے اسی طرف بھاگنا تھا اور بھاگتے چلے جانا تھا۔ ابھی سکھ فوجی جو کیپٹن کے عہدے کا فوجی تھا' ہولسٹر میں ریوالور نکال ہی رہا تھا کہ میں ٹرین کے ڈبے میں گھس گیا اور مسافروں کے اوپر سے چھلانگیں لگاتا ڈبے کے دوسرے دروازے میں سے نیچے چھلانگ لگا کر ریلوے لائن کے جنگلے کے ساتھ ساتھ بھاگنے لگا۔ پیچھے سے ایسی آوازیں آنے لگی تھیں جیسے کچھ لوگ مجھے پکڑنے کے لئے پیچھے دوڑتے آ رہے ہیں۔ مگر مجھے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی فرصت نہیں تھی۔

اس کے بعد کیا ہوا' بھارت کے فرعون حصہ ہشتم

"بھارتی دہشت گرد" میں پڑھیئے